مستنصر حسین تارڑ

سُنہری اُلّو کا شہر

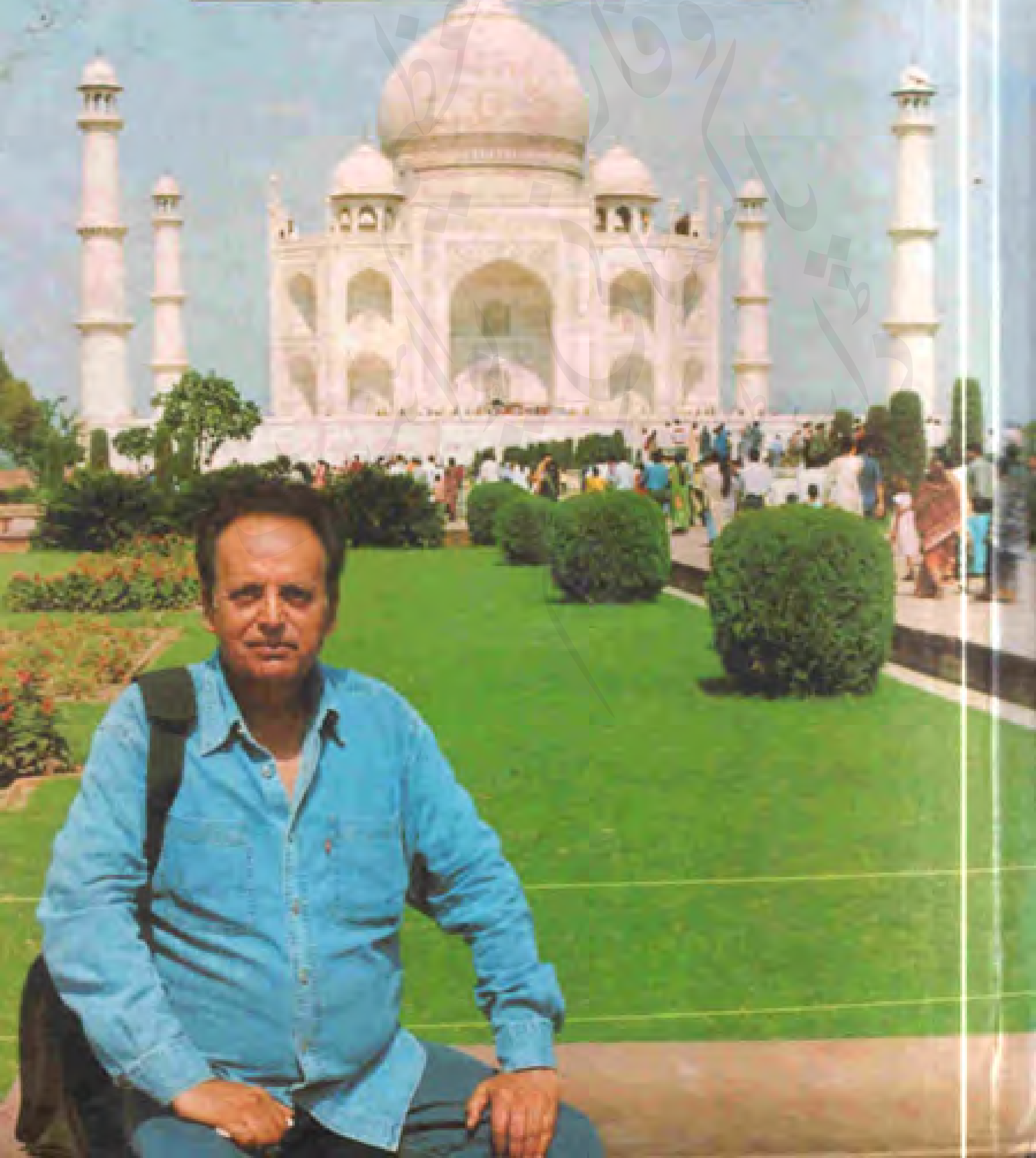

فہرست

دلّی 1965ء

1- "دلّی کے جو کوچے ہیں" 7

دلّی 2004ء

2- "لودھی گارڈن کے مقابر.. میرے قہقہوں سے پریشان ہوتے ہیں" 45
3- "انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں دو حسین.. اور چکیلی یوگن" 51
4- "جو شکل نظر آئی نیلی جین میں نظر آئی" 62
5- "کاکے دا ہوٹل اور مست گردے کپورے" 67
6- "سارک ادیبوں کی کانفرنس اور مے خانے میں جمالِ یار کی باتیں" 71
7- "یوگا- یوگی- یوگن اور ہری اوم... اللہ" 77
8- "عزتِ نفس کی پامالی اور ادبی خانہ جنگی" 82
9- "کیا میں ایک بنیاد پرست تنگ نظر ادیب ہوں؟" 86
10- "دیکھتے نہیں میں پوجا کر رہا ہوں اور کانفرنس کا آخری دن" 90
11- "دلّی کے آسمان سے میرے ذاتی جن کا نزول" 101
12- "صدام حسین اور مہاتما گاندھی کے پوتے راموگاندھی سے ملاقات" 106
13- "دلّی کا سنہری اُلّو اور اُس کی کھنڈر قیام گاہ" 117
14- "اک شام سحر انگیز میں ہندو دیوتا اور بلھے شاہ" 119

15- ''گوری سوئے سیج پر... اور مکھ پہ ڈارے کیس'' 135

16- ''اک اُڑن کھٹولا عشق کا'' 146

17- ''متھرا کے پانڈے اور جمنا کی سوہنیاں'' 149

18- ''ایک بگلا بھگت اور موٹا مہنت تاج محل دیکھنے کو جاتے ہیں'' 162

19- ''میری آنکھیں سفید سنگ مرمر کی آنکھیں اور تاج کا منظر کھلا'' 171

20- ''ایک سیاہ تاج محل کے تصور میں کیا مضائقہ ہے'' 179

21- ''دنیا کا سب سے سیکسی بنچ اور لاہور کے تاج محل'' 187

22- ''مغل اعظم کے حضور.. مان سنگھ یلغار ہو'' 195

23- ''یکے بعد دیگرے پانچ بھالو اور ویلکم ٹو راجھستان'' 201

24- ''فتح پور سیکری کے سرخ آثار اور جودھا بائی پیلس'' 205

25- ''بلند دروازہ اور سحرِ سنگِ سرخ میں ایک ہیرا بارش میں نکھرا ہوا'' 213

26- ''بھرت پور کے جاٹ۔ پیلی بھیت کے ڈاکو راجھستان کی رات میں'' 220

27- ''کسی کو کچھ بھی یہاں حسبِ آرزو نہ ملا'' 229

28- ''جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو'' 233

29- ''سائیں بابا کون ہے اور سب کچھ ہیر پھیر ہے'' 237

30- ''سرخ پتھر سے تراشا ہوا ایک مخروطی جام.. قطب مینار'' 245

31- ''مسجد میں مندر یا مندر میں مسجد.. ایک ستون تصویر ہوتا ہے'' 250

3- ''مرزا غالب انڈیا انٹرنیشنل کے ڈائننگ روم میں'' 254

3- ''چل خسرو گھر اپنے'' 261

''دِلّی کے جو کُوچے ہیں'' 1965ء

بڑے نستعلیق قسم کے چوہے تھے..

آخر دِلّی کے چوہے تھے..

ادب آداب کا بے حد خیال رکھتے تھے... چلتے تھے تو دبے پاؤں چلتے تھے آواز تک نہیں آتی تھی.. میری رضائی پر کُودتے تھے تو احتیاط کرتے تھے کہ اس کے نیچے جو پاکستانی آبگینہ ہے اسے ٹھیس نہ لگ جائے.. یہاں تک کہ رضائی سے باہر جو میرے پاؤں تھے.. یا بقول غالب پانوں تھے جو کفن سے باہر رہ گئے تھے اور اللہ رے شوق دشت نوردی کہ بعد از مرگ بھی ہلتے تھے تو ان پاؤں کو جب وہ نستعلیق چوہے اپنے دانتوں سے کُترنے کا ارادہ باندھتے تھے تو شاید پہلے آداب بجالاتے تھے اور پھر خصوصی توجہ میرے انگوٹھے پر مرکوز کر کے اُس پر دانت رکھتے تھے تو کیسی نفاست اور قرینے سے رکھتے تھے کہ کاٹتے نہیں تھے یونہی پپول کر انگوٹھے کو چکھ کر چھوڑ دیتے تھے..

اور سبحان اللہ چیں چیں بھی کرتے تھے تو شین قاف درست رکھتے تھے۔ اگرچہ چیں چیں میں نہ شین آتا ہے اور نہ قاف اس کے باوجود انہیں درست رکھنا بس اُنہی کا حصہ تھا..

بھلا کوئی پنجاب کے چوہے تھوڑے تھے کہ کچھ دید لحاظ نہ کرتے اور دھما چوکڑی مچاتے ''بلّے بلّے'' کرتے رہتے..

بس دِلّی کی رات تھی اور شب بھر رہا چوہا ترا..

قیاس ہے کہ جب پو پھٹی ہوگی' سویر کی مدھم لو لکڑی کے تختوں کی درزوں میں سے کمرے میں پھیلی ہوگی تو ان چوہوں نے بہ چشم نم مجھ سے رخصت ہوتے ہوئے معذرت ضرور کی ہوگی کہ حضرت اگر کوئی گستاخی سرزد ہوگئی ہو تو للّٰہ معاف فرما دیجیے گا.. آپ کو بے جا شب بھر زحمت دی۔ انشاء اللہ کل شب پھر حاضر ہوں گے.. تب تک کے لیے اجازت عنایت کیجیے..

یہ دلّی میں میری پہلی شب تھی..
آج سے یہی تقریباً چالیس برس پہلے کی شب تھی..
فروری 1965ء..

نہ کچھ ارادہ تھا اور نہ کوئی تمنا بیتاب کہ دل کا یہ رنگ کر لوں کہ دلّی دیکھ لوں.. لیکن اُن زمانوں کے عزیز از جان.. رگ جاں سے بھی نزدیک دوست نے اکثر عذر مستی رکھ کر بہت ورغلایا.. لالچ دیا کہ مستنصر ہالینڈ میں میرا ایک سکھ یار تھا۔ ان دنوں بمبئی میں دولت کے انباروں کے علاوہ بہت ساری قابل رشک چیزوں میں کھیلتا ہے' دن رات فون کرتا ہے کہ آ جاؤ میں تمہیں بھی کھلاؤں گا.. جو کھیل چاہو گے اُس کے حسین ترین کھلاڑیوں سے کھلا دوں گا.. اول تو تمہیں بالی وڈ میں ہیرو بنوا دوں گا.. نہ بنوا سکا تو کم از کم ڈھلتی عمر کی مدھوبالا۔ کامنی کوشل یا نرگس سے ضرور ملوا دوں گا.. مزید یہ کہ عیش کراؤں گا آ جاؤ.. یہ عزیز از جان اُن زمانوں میں قدرے جھینپو ہوا کرتے تھے لیکن بعد ازاں ایسے کُھلے ایسے کُھلے.. قدرے نہیں خاصے ڈرپوک تھے۔ اکیلے جانے سے ڈرتے تھے سو مجھے بہلایا پھسلایا' سو طرح کے لالچ دے کر آمادہ کیا اور میں اُن کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا.. یوں بھی ہم اُن دنوں لنڈورے سے پھرتے تھے اور نہایت آسانی سے بہلائے اور پھسلائے جاتے تھے..
ویزے لگ کر آ گئے' رختِ سفر باندھ لیا' پی آئی اے کی دلّی پرواز کے لیے ٹکٹیں حاصل کر لیں تو عین آخری لمحات میں بلکہ صرف ایک روز پیشتر عزیز از جان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے.. زبان میں لکنت در آئی کہ یار بمبئی تو بہت دور ہے..

"ہم نے کونسا پیدل جانا ہے.. جہاز پر جائیں گے۔"
"تم تو ابھی بظاہر کنوارے پھرتے ہو.. میں شادی شدہ ہوں۔ اگرچہ پردہ ڈالتا ہوں لیکن تم تو جانتے ہو کہ پردے کے پیچھے کیا ہے.. میری بیگم ہے.. وہ ہرگز مجھے ہندوستان جانے کی اجازت نہ دے گی.. آج صبح یونہی تذکرہ کیا تھا کہ شاید دلّی جانے کا پروگرام بن جائے تو اس نے اس بُری طرح گھورا کہ اب تک کپکپی نہیں جاتی.. میں نہیں جا رہا۔"
میں نے بہت لعن طعن کی۔ کیسے مرد ہو کہ بیوی سے ڈرتے ہو تو کہنے لگا' جب تمہاری شادی ہوگی تب تم جانو گے کہ بیوی کے ایک مرتبہ گھورنے سے کیا کیا خطا ہو جاتا ہے..

پھر میں منت سماجت پر اُتر آیا کہ میں بھی کچھ کم ڈرپوک نہ تھا' اکیلا جانے سے ڈرتا تھا تو اس نے یہ بتا کر مجھے لاجواب کر دیا کہ اکلوتا بیٹا ہونے کے حوالے سے میجر صاحب یعنی والد صاحب نے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے کی اجازت نہیں دی اور انہوں نے بھی گھورا تھا..
یہ عزیز از جان اُن زمانوں میں میرا "بیسٹ فرینڈ" ہوا کرتا تھا بلکہ اس سے کہیں برتر "بیشٹ فرینڈ" ہم ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے اور اب ان زمانوں میں ایک دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے.. صرف اُس کی نہیں میری بھی آنکھیں بدل چکی ہیں.. اُس کی آنکھوں میں سیاسی اقتدار اور ناموری کی ہوس کے الاؤ جلتے ہیں اور میری آنکھیں.. میڈیا اور ادب کی شہرت میں اندھی ہوئی جاتی ہیں..
میں نے سوچا' ویزا لگ چکا ہے.. ٹکٹ ہاتھ میں ہے.. سامان بندھ چکا ہے تو کیوں نہ جان پر کھیل جاؤں اور تن تنہا دلّی ہو آؤں.. اوراقِ مصور اُس کے گلی کوچوں میں گھوم آؤں.. چاندنی چوک کی چاندنی میں نہاؤں.. غالبِ خستہ حال کے در پر جا پڑوں.. اور اگر ممکن ہو اور کسی فرصت کے لمحے میں دلّی کے لال قلعے پر پاکستانی جھنڈا گاڑھ آؤں.. کہ اُن دنوں اس قسم کے جذبات مارکیٹ میں نہایت مناسب قیمت پاتے تھے.. اور اس دوران مسلمانوں کی عظمت رفتہ پر نوحہ کناں ہو جاؤں.. چنانچہ میں نے تن تنہا سفر کی ٹھان لی.. اُٹھ

باندھ کر کیا ڈرتا ہے..

اُن دنوں کمر بھی مناسب تناسب کی تھی۔ اِن دنوں کی مانند کمرہ نہ ہو چکی تھی۔ اس لیے اُسے باندھنے میں چنداں دشواری نہ ہوئی..

دلّی ایئرپورٹ پر اُترے.. بلکہ قدم رنجہ فرمایا. ایئر لائن کی بس میں سوار ہو کر کسی ٹرمینل پر اُتارے گئے.. اُتر گئے تو کوچۂ و بازار میں پھرتی گائیوں کی مانند لاوارث سے ہو گئے کہ اب کہاں جائیں. کدھر قیام کریں.. کہاں رات کریں.. کچھ لوگ جو دلّی آتے جاتے رہتے تھے تو اُن سے جب میں نے کوائفِ رہائش اور خوراک کے بارے میں استفسار کیا تھا تو اُن میں سے ایک نے پرانی دلّی میں واقع کسی 'شُدھ مسلم ہوٹل' کا اتہ پتہ میری جیب میں ڈال دیا تھا کہ وہاں بے دریغ چلے جائیے.. کرایہ مناسب ہے.. ریسپشن پر خانہ کعبہ کی تصویریں آویزاں ہیں اور گوشت حلال ملتا ہے.. خالص دِلّی وال ہیں آپ کا لب ولہجہ بھی درست کرتے رہیں گے.. چنانچہ کوئی سواری حاصل کی.. اُس میں اپنا سوٹ کیس ٹھونسا.. اتہ پتہ جو جیب میں تھا اُس کی نمائش کی.. اور پھر جانے کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے.. جانے کونسے جہاں میں جا پہنچے..

اس دوران سفر کرتے ہوئے.. البتہ یہ احساس ہوا کہ جدھر بھی جا رہے ہیں زندگی' صفائی ستھرائی اور خوبصورتی درجہ بہ درجہ تنزل میں جا رہی ہے..

یعنی اُترے ہم نئی دلّی میں تھے اور زوال پذیر ہوتے ہوئے نہایت ہی بوسیدہ اور بُو دار گلی کوچوں میں آ گئے ہیں.. یہ کیسے اوراق مصور تھے.. مصور ایسی گلیوں میں تو نہیں آیا کرتے..

اب اپنا سوٹ کیس گھسیٹتے ہوئے میں انہی گلی کوچوں میں چلا جا رہا ہوں اور ہر کس و ناکس سے اُس شُدھ مسلم ہوٹل کا پتہ پوچھتا چلا جا رہا ہوں اور محسوس یہی ہو رہا ہے کہ لوہاری اور موچی گیٹ کے اندرون کی گلیوں میں گھومتا چلا جا رہا ہوں سوائے ایک فرق کے.. کہ وہ گلیاں ان گلیوں کے مقابلے میں کسی حد تک اوراق مصور تھیں..

بالآخر ایک بوسیدہ منزل کی اکھڑی ہوئی اینٹوں کے ماتھے پر ایک بورڈ نظر آیا

جس پر مطلوبہ ہوٹل کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا اور حروف شاید جل چکے تھے۔ اس لیے کم کم دکھائی دے رہے تھے.. اور نام مجھے یاد نہیں کچھ "نیو بسم اللہ دلّی ہوٹل" قسم کا تھا اور وہ زمینی منزل پر نہ تھا کہیں بلندی پر تھا.. وہاں تک پہنچنے کے لیے پیچ دار اور نیم اندھیاری سیڑھیاں تھیں جن پر ایک سوٹ کیس گھسیٹ کر لے جانا ممکنات میں نہ تھا.. چنانچہ اس بوجھ کو وہیں چوکھٹ پر ڈھیر کیا اور.. گھومتا ہوا تیسری منزل پر جا پہنچا جہاں ایک تاریک کمرے میں کچھ کچھ ہو سکتا تھا.. یہ میلا اور بوسیدہ تو ہو سکتا تھا کہ وہاں ایک عجیب سی مہک تھی' آخری ہچکیاں لیتی اور وہ بھی خاموشی سے.... چند کرسیاں بھی دکھائی دینے لگیں.. یہ ریسپشن ایریا تھا اور اس میں سے ایک ناتواں سا ہیولا ظاہر ہوا جو یقین جانئے اگر فسانۂ آزاد کا خوجی میاں نہ تھا تو اُس کا پھوپھا ضرور تھا.. میں نے اپنے پاکستانی ہونے کا بتایا اور خواہش قیام کا عاجزانہ اظہار کیا.. اس پر خوجی میاں نے مسّرت کا کچھ اظہار نہ کیا بلکہ جہاں ظاہر ہوئے تھے وہیں تنے کھڑے رہے اور بولے "میاں فل ہے.."

میں نے اُنہیں آگاہ کیا کہ کیسے ایک دوست آپ کے اس شاندار ہوٹل کی تعریف میں دن رات رطب اللسان رہتے تھے اور اُنہوں نے ہدایت کی تھی کہ بس دلّی بھر میں ایک ہوٹل ہے' تم نے وہیں ٹھہرنا ہے اور میں اپنا سامان نیو دلّی سے گھسیٹتا پرانی دلّی کے کوچۂ و بازار میں گھسیٹتا یہاں تک پہنچا ہوں تو دھتکار دیجے مت' کچھ کرم کیجیے.. اُنہوں نے بس اتنا کہا.. پھر آؤ۔

میں آ گیا..

کچھ اور سیڑھیاں طے کیں اور نیم اندھیارے میں طے کیں اُن میں کہیں اُنہوں نے کوئی دَر وا کیا اور بولے "جھانک لو."

میں نے جھانک تو لیا پر کچھ پلّے نہ پڑا کہ اندر کیا ہے.. یقیناً کوئی کمرہ وغیرہ تھا.. دکھائی کچھ نہ دیا.. اور دیکھنے سے زیادہ وہاں سونگھنے کو بہت کچھ تھا.. سیلی سی اور گیلے کمبلوں میں سے چند روز بعد اُٹھنے والی بُو تھی.. ایک بستر دکھائی دینے لگا اور اُس پر کچھ گدڑیاں وغیرہ.. پتہ نہیں اس عمارت میں کھڑکیاں تھیں ہی نہیں یا بند تھیں.. کہ دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا

سماں تھا اور اُمید تھی کہ یہی آرام گاہِ تارڑ تھی..

اور وہاں فرش پر میں نے زندگی میں پہلی بار ایک دلّی والی چوہا دیکھا..

"میاں یہاں ابھی ایک زائر قیام کرتے ہیں۔ نظام الدین کے ہاں گئے ہیں' شام سے پہلے آگئے تو کمرہ خالی کر دیں گے.. اگر خالی کر دیں گے تو کمرہ تمہارا.."

"کیا یہ چوہا ہی تھا جو ابھی ابھی میں نے دیکھا تھا؟"

خوجی میاں قدرے خفا ہو گئے "میاں اعتراض کرتے ہو.. اللہ کی مخلوق ہے.. کبھی کبھار اِدھر آنکلتی ہے.. پرنالے میں سے آتی ہے۔ گھوم پھر کر اُسی کے راستے اُتر جاتی ہے.. کچھ کہتی نہیں.. ہائیں تمہارا وہ سامان کہاں ہے جسے تم گھسیٹتے پھرتے ہو؟"

"نیچے چوکھٹ کے قریب رکھ آیا ہوں۔"

"میاں کیا غضب کرتے ہو' کوئی اُٹھا کر لے گیا تو ناحق ہمیں دشنام دو گے.."

"حضور میں ابھی اُٹھا کر لاتا ہوں اور آتا ہوں۔" میں نے اتنا کہا اور خوجی میاں کو وہیں چھوڑ کر گرتا پڑتا نیچے آیا' اپنے سوٹ کیس کو کان سے پکڑا اور پھر سے دلّی کے اوراقِ مصور کوچوں میں گھسیٹنے لگا..

جامع مسجد کے سامنے ایک وسیع بازار تھا اور اُس کے آغاز میں دودھ دہی کی ایک دکان تھی جس کے ماتھے پر "نیو جواہر ہوٹل" کا بورڈ آویزاں تھا.. میں نے دکاندار سے جو مقامی معیار کے مطابق پہلوان ہی ہو گا' استفسار کیا کہ صاحب یہ جو ہوٹل کا بورڈ لگا ہے تو یہ ہوٹل.. کدھر ہے؟

وہ بولا "اِدھر باجو میں جو سیڑھیاں اوپر کو جاوے ہیں.. اوپر ہے۔"

"مسلمان ہوٹل ہے؟"

"اللہ کے فضل سے.."

"پر اس کا نام.. جواہر لال نہرو کے نام پر کیوں ہے؟"

"جواہر تو بھیا ہیرے موتی کو کہتے ہیں.. اُس کے باپ کا نام بھی تو موتی لال تھا.. یہ اپنا علاقہ ہے.. ہوٹل مسلمان ہے۔"

میں اوپر گیا تو وہاں ایک وسیع صحن تھا.. روشنی اور کھلی فضا تھی تو جی خوش ہوا کہ ابھی اندھیاروں میں ٹامک ٹوئیاں مار کر آئے تھے.. پر ہوٹل کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا.. ایک نہایت سادہ درویش منش بھولا سا شخص میرے استقبال کو آیا.. پاکستانی ہونے کا بتایا تو بچھ گیا.. باقاعدہ میرے قدموں میں لوٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ایک وسیع کھلے دلّی کے آسمان تلے ایک صحن تھا پہلی منزل پر.. ایک جانب دیوار کے ساتھ لگے لکڑی کے تختوں سے تعمیر شدہ کچھ ڈربے سے تھے جن میں دروازے تھے.. ڈربوں کی کل تعداد چار تھی..

اُن میں سے ایک کا دروازہ کھول کر.. بلکہ وہ پہلے سے ہی منہ کھولے کھلا تھا اُس درویش منش نے نہایت لجاجت سے کہا "بھائی صاحب آپ کے شایانِ شان تو نہیں پر گھر سا آرام ملے گا.."

ایک زمانے میں اے حمید نے ایک نہایت مؤثر ناول "ڈربے" نام کا لکھا تھا جو ان کی رومانوی تحریروں میں دب گیا.. اُس میں بھی اسی قسم کے ڈربے تھے.. میں نے اُس ڈربہ نما کمرے میں جھانکا تو کچھ دکھائی نہ دیا.. اندھیرے کی وجہ سے نہیں کہ وہاں روشن دن کی روشنی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ وہاں کچھ تھا ہی نہیں جو دکھائی دیتا.. نہ کوئی بستر نہ کوئی ایک آدھ کرسی وغیرہ.. بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور اُس کی بھائیں بھائیں کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی..

درویش منش نے میری چنتا کو میری آنکھوں میں پڑھ لیا اور اُسی بھولپن سے بولا "بھائی صاحب.. ابھی کھاٹ ڈلوائے دیتا ہوں۔"

"بھائی صاحب.. اس میں پہلے سے کوئی کھاٹ کیوں موجود نہیں؟"

"ادھر جو لوگ آتے جاتے ہیں.. اپنا بوریا بستر ہمراہ لاتے ہیں اور محمدی بسترے بچھا کر قیام کرتے ہیں.. کھاٹ ابھی آیا۔"

"اور بستر؟"

"آپ ہمراہ نہیں لائے؟.. چنداں مضائقہ نہیں۔ وہ بھی لائے دیتا ہوں.. جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے جو بازار ہے اُس میں سے ایک عدد رضائی خرید لاتا ہوں.. ابھی.."

عام حالات میں تو مجھے ایسے ڈربہ نما بے کھاٹ اور بے رضائی کمرے کو دیکھ کر فوری طور پر واک آؤٹ کر جانا چاہیے تھا لیکن شام ہونے والی تھی۔ میں اس دیارِ غیر میں اپنا سوٹ کیس گھسیٹتا گھسیٹتا تنگ آ چکا تھا۔ تھک چکا تھا۔ مجھ میں مزید دربدر ہونے کی سکت نہ تھی' علاوہ ازیں وہ بندہ میرے دل کو لگا' مجھ میں حوصلہ ہی نہ تھا کہ اُسے کہہ دیتا کہ بھائی صاحب مجھے آپ کا ہوٹل پسند نہیں۔ میں نے اُسے کھاٹ لانے دیا..

اور پھر اُس نے وہ رضائی جو وہ بقلم خود جامع مسجد کی سیڑھیوں تلے جو بازار تھا وہاں سے بھاگم بھاگ خرید کر لایا تھا اس کھاٹ پر بچھائی اور کہنے لگا ''بھائی صاحب گھر جیسا آرام ملے گا..اور تو کچھ درکار نہیں؟ صحن میں پانی کا نل ہے..نہائیے دھوئیے..اور برابر میں حوائج ضروریہ کے لیے ستھرا بندوبست ہے..بالٹی فلش کا انتظام ہے ماشاء اللہ سے..''

بہت بعد میں یہ خیال آیا کہ آخر میری سوئی ایک مسلمان ہوٹل میں قیام کرنے پر ہی کیوں اٹکی ہوئی تھی..میں کیوں نہ کسی ہندو سکھ عیسائی ہوٹل میں ٹھہر گیا..ایک کمرے..اس کے فرنیچر' غسل خانے یا ٹیبل لیمپ کا تو کوئی مذہب نہیں ہوتا..بے شک وہاں ہندو پانی نہ پیتا..باہر نکل کر مسلمان پانی پی لیتا۔ کھانا بھی باہر سے کھا لیتا۔ ''نیو جواہر ہوٹل'' میں بھی تو کوئی ڈائننگ ہال نہ تھا۔ اکثر اوقات کھانا جامع مسجد کے اڑوس پڑوس میں ہی کھاتا..مرچوں میں بھرا ہوا..جانے دلّی کے پکوان کہاں پکتے تھے۔ جامع مسجد کے آس پاس تو ہرگز نہیں پکتے تھے..لیکن ان دنوں ذہن جکڑا گیا تھا کہ ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان..ٹھہرنا ہے تو مومن نے مسلمان ہوٹل میں ہی ٹھہرنا ہے..

تو یہ میری پہلی شب تھی دلّی میں ''نیو جواہر ہوٹل'' کے ڈربے میں۔ ایک کھاٹ پر ایک نئی نویلی رضائی میں..جہاں نہایت نستعلیق قسم کے چوہے شب بھر آداب بجا لاتے رہے تھے..

میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ فروری 1965ء کا قصہ ہے..جنگ ستمبر سے چھ ماہ پیشتر کا بیان ہے..

میں یہ اقرار بھی کرنا چاہتا ہوں کہ قفس کے اُس گوشے میں سوائے چوہوں کے

مجھے آرام بہت تھا..صحن میں فروری کی دھوپ پھیلتی تھی اور بدن کو آسودگی اور آرام دیتی تھی اور وہ درویش منش شخص جو میں نہیں جانتا تھا کہ اس ہوٹل کا مالک تھا یا منیجر تھا' اتنا ہمدرد اور پیارا تھا کہ اگر میں اُسے کہتا کہ میں تو کرایہ ادا کیے بغیر یہاں سے رخصت ہوتا ہوں تو وہ کہتا ''بھائی صاحب..کوئی اپنے گھر کا کرایہ بھی دیتا ہے..کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔''

چاندنی چوک بھی کہیں نزدیک ہی پایا جاتا تھا اور ہم اُس کے وصل کی چاندنی میں نہانے کے لیے اُدھر کو جا نکلے..جا ہی نکلے تو اس سے بہتر تھا کہ ہم ''نیو جواہر ہوٹل'' کے اوپن ایئر غسل خانے کے نل تلے ہی نہا لیتے جس کا پانی اور فروری کے مہینے میں نہ صرف سرد آتا تھا بلکہ مسلسل نہ آتا تھا' ہچکیاں بھرتا ہوا آتا تھا اور جاتا تھا کہ وہاں نہ تو کوئی چاندنی تھی اور نہ کوئی چوک تھا..چلئے فروری کی دھوپ میں چاندنی تو محال تھی اور کہاں سے آتی تھی لیکن کوئی چوک بھی نہ آیا' جو آیا تو ایک بے ترتیب سا بکھرا ہوا' کامونکی اور مریدکے جیسا دیہاتی بازار آیا جو اٹا پڑا تھا مخلوق سے..ریڑھیوں' خوانچوں اور تانگوں سے اور اُن میں سے راستہ بنانا جوئے شیر لانے سے بھی قدرے مشکل تھا...اور مجال ہے کوئی شکل نظر آئی بے شک تصویر نہ ہوتی شکل تو ہوتی..اس بازار میں ہم دھکے کھاتے رہے اور سرخرو ہوتے رہے کہ چاندنی چوک کی سیر کر رہے ہیں یہاں..بے شک اس میں میرے ابوجہل ہونے کا بھی قصور تھا کہ میں آگاہ نہیں تھا کہ یہاں کس حلوائی کی دکان میں دنیا بھر سے اعلیٰ قلاقند ملتی ہے..کونسے کونے میں نہاری کے اساتذہ براجمان ہیں وغیرہ..مجھے تو پورے چاندنی چوک میں جس شے نے خوش کیا وہ بندر تھے..فٹ پاتھ پر ایک منحنی قسم کے صاحب بندر سجائے بیٹھے تھے اور وہ برائے فروخت تھے..

کُل دو چار بندر ہوں گے..

اُن کی قیمت بھی نہایت مناسب تھی..

میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر..چاندنی چوک کی سیر کر کے..کڑی دھوپ میں..پھر سے وہیں پہنچ جاتا جہاں بندر فروخت ہو رہے تھے..

نہایت سنجیدگی سے اُن میں سے ایک کو جو بہت نٹ کھٹ تھا خریدنے کے

بارے میں سوچتا کہ قیمت بھی بہر طور مناسب تھی۔ لیکن اس خرید میں کچھ بین الاقوامی پیچیدگیاں تھیں کہ میں ایک بندر کو بے ٹکٹ پی آئی اے کے جہاز میں بے شک گود میں بٹھا کر کیسے لے جا سکتا تھا.. یا ہندوستانی کسٹم کے حکام مجھے کیونکر اپنے ایک دیوتا کو.. بے شک ایک جونیئر دیوتا.. ہنومان مہاراج کو کیسے ایک اسلامی جمہوریہ میں لے جانے دیتے۔

بس انہی مسائل کی بنا پر میں نے اجتناب کیا ورنہ قیمت بہت مناسب تھی..

چاندنی چوک سے واپسی پر جامع مسجد کی سیڑھیاں طے کیں.. اندر داخل ہوا تو اس کی نفاست اور نزاکت نے اگرچہ دل پہ اثر کیا۔ شاہجہانی حُسن اپنے عروج پر دکھائی نہ دیا.. کچھ مٹیالی سی.. اداس اور گھٹی گھٹی سی.. اپنی بادشاہی مسجد کی وسعت' صفائی ستھرائی اور بڑائی بہت یاد آئی.. البتہ جامع مسجد ایک پہلو سے قدرے ممتاز ہوتی تھی کہ یہ آبادی کے درمیان تھی' لوگوں کے غم اور خوشی میں شریک تھی.. آباد تھی جب کہ بیٹے اورنگ زیب کی مسجد ایک الگ تھلگ یادگار تھی.. محفوظ اور خلق خدا سے کٹی ہوئی.. ایک تاریخی عمارت عید..... بقر عید پر تو رونق ہو جاتی تھی ورنہ عام دنوں میں اس کا صحن تو کیا اندرون بھی خالی خالی رہتا تھا..

داراشکوہ نے لاہور کی گورنری کے دوران اپنے محل سے اپنے مرشد میاں میر کے مزار تک سنگ سرخ سے ایک شاہراہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ نماز فجر سے فارغ ہو کر پیدل چلتا ہوا ہر سویرا اپنے مرشد کا دیدار کر سکے.. اس سرخ راستے کے آس پاس اُس نے گل و گلزار سجانے کا سوچا لیکن اس دوران چھوٹے بھائی صاحب نے تخت کی وراثت کے لیے اس کے اصلی وارث اور بڑے بھائی جان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا. میاں میر کے مزار تک تعمیر ہونے والے راستے کے اُنہی سرخ پتھروں سے اُس نے بادشاہی مسجد کی عمارت کھڑی کر دی.. آج بھی میاں میر کے مزار پر اسی سرخ پتھر کی ایک نشانی آویزاں ہے.. اورنگ زیب کے حق میں اور مخالفت میں جتنی بھی آرا ہیں وہ سب انتہا پسندی پر استوار ہیں.. وہ مغل تاریخ کا سب سے المناک کردار ہے.. تاج و تخت کے حصول کے لیے ہمیشہ سے یہی اصول کارفرما رہا ہے کہ عزیز داری رشتے داری کا کچھ لحاظ نہیں کرنا.. آپ کریں گے تو فریق مخالف نہیں کرے گا.. ہمایوں کو چھوڑ دیں گے تو وہ ایران جا کر پھر سے حملہ آور ہو

جائے گا.. رحم کریں گے تو اُس کا کچھ صلہ نہ ملے گا.. دشمن ہارتے ہوئے قرآن نیزوں پر بلند کر دیں اور آپ اُس کے احترام میں جنگ روک دیں تو نتیجہ کربلا کی صورت میں ظاہر ہو گا.. چنانچہ اورنگ زیب نے جو کچھ کیا آداب شہنشاہیت کے اور مروجہ رواج کے مطابق کیا اور میں اُسے اس عمل کے لیے موردِ الزام نہیں ٹھہراتا کہ بروٹس پر بھروسہ کریں گے تو وہ آپ کے سینے میں خنجر اُتار دے گا... اورنگ زیب اپنی بادشاہت سے کبھی لطف اندوز نہ ہوا جیسا کہ جہانگیر ہوا.. اپنے کاندھے پر رکھے ہوئے نور جہاں کے ہاتھ کے لمس سے بادشاہت کی.. یا جیسے شاہجہاں نے اپنی رعایا کی غربت سے خزانے جمع کر کے یادگاروں کی تعمیر میں لٹائے.. بے شک تاج محل بنوایا. لیکن چودہ بچے مسلسل ممتاز محل بے چاری کے پیٹ سے پیدا کر کے بالآخر اُسے اسی مشقت اور اذیت کے نتیجے مین موت سے ہمکنار کیا اور پھر نوحہ کناں ہوا۔ تاج محل کی تعمیر کے بعد ممتاز محل کے سوگ میں اُس نے آگرہ میں ایک ایسا شیش محل بھی تعمیر کروایا جس میں آئینے ہی آئینے تھے.. ہزاروں بلکہ لاکھوں آئینے تھے جن میں اُن کے نیچے کسی ترک یا قازق حسینہ کے ساتھ ملاپ کرتے ہوئے شاہجہاں اپنے آپ کو دیکھتا تھا اور اس حسینہ کے بدن کو ہر پہلو سے ہزارہا پہلو سے حرکت میں دیکھتا تھا اور پھر بھی ممتاز محل کے سوگ میں رہتا تھا.. تو اورنگ زیب نے اگرچہ اپنی سلطنت میں سینکڑوں مندر تعمیر کروائے اور اُن کے لیے شاہی خزانے سے رقوم سالانہ تفویض کیں لیکن وہ سرخرو نہ ہو سکا.. مغل تاریخ کا سب سے المیہ اور کم سمجھا جانے والا کردار رہا.. زندگی بھر دکن اور بنگال میں برسرِ پیکار رہا اور اپنے باپ دادا کی مانند شہنشاہیت کے لطف نہ لے سکا..

شاید یہ تاثر اُبھرے.. یہ خیالِ خام کسی کے دل میں آئے کہ میں اورنگ زیب کا دفاع کر رہا ہوں.. نہیں.. میں تو شہنشاہیت کے قباحت بھرے نظام کو نظر میں لا رہا ہوں.. آلِ تیمور میں سے اگر میں کسی کا گرویدہ ہوں تو وہ نہ اکبر ہے اور نہ شاہ جہاں.. بلکہ داراشکوہ ہے جو ذات پات اور عقیدے سے ماورا ہو گیا۔ عطار کے پرندوں کی مانند سچ کا متلاشی ہو گیا.. اُسے جہاں سچ ملا اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا.. وہ مسلمان مومن ہو' میاں میر ایسا یا کوئی ہندو بھگت ہو وہ سر نیہوڑ کر شاہ جہاں کے جائز وارث کی حیثیت کو بھول کر اُس کے چرنوں

میں بیٹھ گیا..اُس نے ہندومت کی مقدس کتابوں کے فارسی میں ترجمے کیے..اور تذکرہ اولیا اور تذکرہ غوثیہ میں بھی اُس کے تذکرے ہوئے..شہنشاہوں کے لیے ایسی دانشوری اور ایسا تصوف مضر ثابت ہوتا ہے..جو ہوا..لیکن یہ بھی میرا یقین کامل ہے کہ اگر دارا شکوہ کو اپنی جائز وراثت مل جاتی تو مغل سلطنت کو غروب ہونے میں ایک دو صدیاں مزید لگ جاتیں..

جامع مسجد کے نواح میں جو ایک ویران اور خوشنمائی سے عاری میدان تھا اور جہاں ان دنوں کوڑے کے ڈھیر نمایاں تھے' وہاں ایک تنہا مختصر سا مزار تھا جو مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا..اور کوئی دھیان نہ دیتا تھا کہ یہ کس نابغۂ روزگار شخص کا مزار ہے..جو پاکستانی مسلمانوں کے نزدیک مرتد ٹھہرا لیکن اس کے علم و فضل کے مرتبے کو اور کون پہنچا..کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں فاتحہ پڑھنے والا تو کوئی نہیں البتہ ایک صاحب دیوار کے ساتھ ناک لگائے..اپنے آپ کو فارغ کر رہے ہیں..یقیناً مسلمان تھے ورنہ کوئی غیر مسلم ایسی جسارت کر سکتا تھا..فساد نہ ہو جاتا..

دلّی کی سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر اتنا ہجوم تھا کہ آپ اُس میں بے اختیار بہتے ہوئے چلے جاتے تھے..اور اگر آپ نے اس ہجوم سے جُدا ہو کر بائیں جانب مڑنا ہے تو آپ اُس مقام سے فرلانگ بھر آگے بے اختیار ہوتے چلے جاتے تھے اور پھر دھکم پیل کر کے بائیں جانب مڑتے تھے..اتنا رش تھا دلّی کے کوچہ و بازار میں..

میں شاید فروری 1965ء کی دلّی کی تصویر سراسر سیاہ رنگ میں ہی پینٹ کر رہا ہوں..تو اس میں میرا کوئی دوش نہیں..میں عہد رفتہ اور مغل عظمت کی رنگین عینک پہن کر وہاں نہیں گیا تھا کہ جو کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا اُسے بھی دیکھ لیتا...جو دیکھا تھا اُسے ہی بیان میں لا رہا ہوں..اب سوچتا ہوں تو یہ اُس سفر کی یکسر تنہائی تھی..پرانی دلّی میں دربدری اور نیم تاریکی تھی..جامع مسجد کے آس پاس جو بستیاں تھیں اُن کا ڈیپریشن تھا اور "نیو جواہر ہوٹل" کے نستعلیق چوہے تھے ورنہ دلّی اتنا بُرا تو نہ تھا..

اور اس کی ایک مثال کناٹ پلیس میں گزری ہوئی ایک شام تھی..جہاں روشنیاں تھیں' رونقیں اور ترتیب تھی اور صفائی تھی..کناٹ پلیس کے طویل برآمدوں تلے نفیس اور

ذوق کی عمدگی والی دوکانیں اور شوکیس تھے اور ان میں سے ایک دُکان میں میں نے بہت وقت گزارا جہاں کتابیں ہی کتابیں تھیں اور اتنی ارزاں تھیں کہ بوری بھر تو میں نے بھی خرید کر لیں..برآمدوں کے فرش پر ہندوستان بھر سے آئے ہوئے لوگ اپنے اپنے علاقوں کی دستی مصنوعات سجائے بیٹھے تھے بلکہ سجائے بیٹھی تھیں کہ ان میں سے بیشتر خواتین تھیں..مجھے پیتل کا ایک نٹ راج کا مجسمہ پسند آ گیا..اُن مجسموں میں ایک جسے دیکھ کر میری ساس صاحبہ اُس کمرے میں نماز پڑھنے سے انکاری ہو جایا کرتی تھیں..

اُن دنوں ابھی میں ادب کی دلدل میں نہیں پھنسا تھا لیکن مزاج چونکہ لڑکپن سے کچھ کچھ ادیبانہ تھا اس لیے ادیبوں کے معروف ٹھکانے کافی ہاؤس کو تلاش کیا اور وہاں جا براجمان ہوا..چند نہایت دلچسپ حضرات سے ملاقات ہو گئی..ان میں سے ایک نہایت نستعلیق سردار صاحب نے کہ یقین جانئے سردار بھی نستعلیق ہو سکتے ہیں جب میری رہائشی زبوں حالی کی داستان سنی تو اُنہوں نے نہایت چاہت سے پیش کش کی کہ میں "نیو جواہر ہوٹل" سے فوری طور پر اُٹھ کر اُن کے ہاں جا قیام کروں..میں قدرے مائل ہوا کہ وہ نہایت بے لوث قسم کے سردار جی محسوس ہوتے تھے لیکن جب میں نے اُن سے اُن کے کاروبار حیات کے بارے میں استفسار کیا تو اُنہوں نے بتایا کہ وہ سکھ دھرم کے بارے میں ایک میگزین کے ایڈیٹر ہیں یعنی "خدام الدین" یا "چراغ اسلام" قسم کے میگزین کے..علاوہ ازیں وہ ایک مشنری بھی ہیں یعنی مبلغ ہیں اور وہ بھی سکھ مذہب کے..تو میں نے کچھ تامل کیا..ایک سکھ اور وہ بھی مبلغ..تامل میں نے صرف اس خدشے کی بنا پر کیا کہ ہم جاٹ لوگ ماضی قریب میں سکھ ہوا کرتے تھے..نہ شیونگ فوم کے محتاج تھے اور نہ بلیڈوں کا کوئی خرچہ تھا۔ نہ ہی قیمتی آفٹر شیو لوشن کی حاجت ہوتی تھی' بھنگڑے ڈالتے تھے' دارو پیتے تھے' کھیتوں میں مشقت کرتے تھے اور جانوروں کی طرح کرتے تھے..اپنے آپ پر ہنسنے کی صلاحیت رکھتے تھے..اور خود ہی سرداروں کے لطیفے سنا کر لوٹ پوٹ ہوتے تھے اور ہمہ وقت ہلّے ہلّے کرتے رہتے تھے' پھر ہمارے بزرگوں نے جانے کیا سوچا اور مسلمان ہو گئے..اس سے کم از کم ثابت یہ ہوتا ہے کہ سکھ سوچ بھی سکتے ہیں ورنہ کاہے کو مسلمان ہوتے..البتہ بدنیت فریق

مخالف یہ دعویٰ بھی کر سکتا ہے کہ اس سے یہ بھی تو ثابت ہوتا ہے کہ سکھ سوچ نہیں سکتے..اس لیے مسلمان ہوگئے تو خدشہ یہی تھا کہ ہم جاٹوں میں سکھوں کی کچھ خصوصیات چونکہ اب بھی پائی جاتی ہیں تو کہیں ایسے مبلغ حضرت کے وعظ سے متاثر ہو کر ہم پھر سے سردار نہ ہو جائیں' بس اسی لیے ٹال گیا..

ایک اور نہایت ہی مدبر اور سنجیدہ سردار صاحب سے ملاقات ہوئی جو ایک سینئر صحافی تھے..کم بولتے تھے لیکن جو بھی بولتے تھے کیا خوب بولتے تھے..میں نے اپنے لاہوری ہونے کا بتایا تو وہ خاموش ہوگئے..پگڑی تلے جو وسیع ماتھا تھا اُس پر شکنیں نمودار ہوگئیں..جنہیں اُنہوں نے نہایت متانت سے فوراً استوار کیا..اُن کی جنم بھومی لاہور تھی..اور 47ء کے لاہور سے اُن کی بہت ہی تلخ یادیں وابستہ تھیں..اُن کے بہت سے عزیز جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں اُس شہر میں زندہ جلا دیے گئے تھے..تو قابل فہم طور پر اُن کے دل میں کسی بھی لاہور سے آنے والے شخص کے لیے کوئی نرم گوشہ نہ تھا..کوئی محبت نہ تھی بلکہ نفرت کے شائبے تھے جنہیں میں محسوس کر سکتا تھا..میں اُنہیں دوش نہیں دے سکتا تھا..وہ کیسے بھول جاتے..جیسے مشرق پنجاب سے آنے والے مسلمان سکھوں کی خون آلود کرپانیں نہیں بھول سکتے..

کوئی بھی بھول نہیں سکتا..

اور یہاں منیر نیازی ہی نہ چاہتے ہوئے بھی کام آتا ہے کہ

؎ کس دا دوش سی کس دا نئیں سی
اے گلاں ہُن کرن دیاں نئیں

ویسے اُن سردار صاحب نے مجھے ناپسند کرتے ہوئے بھی کافی کی آفر کی..لیکن مجھ سے نظریں ملا کر بات کرنے سے اجتناب کرتے رہے کہ وہ میرے چہرے پر وہ راکھ دیکھتے تھے جو اُن کے پیاروں کے جلائے جانے کی تھی..وہ مجھ سے گفتگو تو کرتے تھے لیکن نگاہیں چرا کر..اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے..جب نشست برخاست ہونے لگی تو اُنہوں نے پہلی بار میری جانب براہ راست دیکھ کر پوچھا "لاہور کی نسبت روڈ کے چوک میں ایک بہت

گھنا اور بے شمار داڑھیوں والا پرانا برگد ہوا کرتا تھا..جس کے سائے میں جانوروں کے پانی پینے کے لیے ایک ناند ہوا کرتی تھی..تانگوں کے پیاسے گھوڑے لاہور کی گرمیوں میں اپنی تھوتھنیاں اُس پانی میں ڈال کر نتھنے سکیڑتے پُھرر پُھرر کرتے اپنی پیاس بجھاتے تھے..میرا بچپن اُس برگد کے سائے میں گذرا ہے..تو کیا وہ ناند ابھی تک ہے..وہ برگد ہے؟"

میں نے کہا "میرا کاروبار چیمبرلین روڈ پر ہے..اور میں وہاں سے اُٹھ کر نسبت روڈ چوک میں آتا ہوں اور وہاں اب تو وہ ناند نہیں ہے..لیکن برگد موجود ہے..اور میں اُس کے سائے تلے کھڑے ہو کر گھر جانے والی بس کا انتظار کرتا ہوں۔"

"اُس برگد کا کوئی پتہ ہی لے آتے صاحب.." اور اُن کی آنکھوں میں جھڑیاں لگ گئیں..چھم چھم برسنے لگیں اور آنسو اُن کی داڑھی بھگونے لگے..

میں نے نیو جواہر کے چوہوں سے بلکہ اُنہوں نے مجھ سے آج شب بھی ملاقات کرنی تھی تو اس ملاقات کی تیاری کے لیے..اُس کے ڈیپریشن کو کم کرنے کے لیے میں نے کناٹ پلیس کا ایک نہایت ہی مہنگا اور بڑھیا ماحول کا ریستوران رات کے کھانے کے لیے چُنا..میرا خیال ہے اگر انتظامیہ کو خبر ہو جاتی کہ میں نیو جواہر میں فروکش ہوں تو شاید مجھے وہاں داخلہ نہ ملتا..

ایک پرائے ملک میں..تنہا ایک ریستوران میں بیٹھنا بھی بے حد اذیت ناک ہوتا ہے..آپ تادیر مینو کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں کہ اُس میں درج شدہ خوراک کے نام قدرے مختلف ہوتے ہیں..ویٹر سے بھی مؤدب ہو کر بات کرتے ہیں اور اگر برابر کی میز پر بیٹھا ہوا کوئی شخص آپ کی جانب دیکھتا ہے تو آپ خواہ مخواہ مسکرانے لگتے ہیں اور وہ شخص قدرے حیران ہوتا ہے کہ یہ بھائی صاحب مجھے دیکھ کر کیوں مسکرا رہے ہیں..خوراک کا آرڈر کرتے ہوئے یہی خیال دامن گیر رہا کہ ظاہر ہے یہ ہندو ریستوران ہے اور ہر قسم کا گوشت جھٹکا گوشت ہوگا تو ذرا اجتناب کر لیا جائے..دال اور سبزی کھانے کی جانب طبیعت مائل نہ ہوتی تھی اس سے تو بہتر تھا کہ انسان فاقہ کر لے۔ چنانچہ بہت سوچ بچار کے بعد

فرائی مغز کا آرڈر کر دیا۔۔اور خوب سیر ہو کر جی بھر کے کھایا کہ ساتھ میں تندوری روٹیاں چلی آتی تھیں۔۔بہت بعد میں اُس شام کے بارے میں سوچا تو خیال آیا کہ بھائی جان وہ جس مغز کو آپ چٹخارے لے کر نوش کرتے رہے تھے وہ بھی تو کسی ایسے جانور کا تھا جسے حلال نہیں کیا گیا تھا تو وہ حلال کیسے ہو گیا۔۔شکر ہے یہ خیال بہت بعد میں آیا۔۔

اُن دنوں انڈین فلموں کی پاکستان میں بہت پیاس تھی۔۔لوگ خاص طور پر کابل جاتے تھے صرف تازہ ترین انڈین فلم دیکھنے کے لیے۔۔اِن دنوں کی کیبل، کیسٹ اور کمپیوٹر کی سہولت ابھی ایجاد نہ ہوئی تھی جس نے اُن کا طلسم توڑ دیا ہے۔۔مجھے ذاتی طور پر اتنا چاؤ نہ تھا انڈین فلمیں دیکھنے کا لیکن واپسی پر یار دوستوں میں بیٹھ کر بڑھ مارنے کے لیے اور عزیزوں پر رعب جمانے کی خاطر میں نے دو چار فلمیں بھی ملاحظہ کیں۔۔ان میں سے مجھے فلم ''اپریل فُول'' یاد رہ گئی ہے جس میں آج کا فربہ چربی کا پہاڑ ہلنے جلنے سے بھی معذور شخص شمی کپور ہیرو تھا۔۔کپور خاندان میں موٹاپا شاید اُن کے جہیز میں ہے۔۔پرتھوی راج جوان کے باوا آدم تھے وہ بھی بڑھاپے میں وسیع تن و توش کے حامل ہو گئے تھے اور فریم میں مشکل سے سماتے تھے لیکن وہ اپنی شاندار اور گھن گرج والی آواز اور اداکاری سے لوگوں کو مسحور کر کے مغل اعظم ہو جاتے تھے۔۔اور وہ پہلے اور آخری کپور تھے جن میں بڑی اداکاری کی صلاحیت تھی۔۔یا پھر ششی کپور میں کچھ جوہر تھا۔۔اور وہ بھی پتلے پتنگ ہوا کرتے تھے اور بالآخر وہ بھی پھُول گئے۔۔راج کپور نے عمر بھر صرف اپنی نیلی نیلی آنکھوں کی کمائی کھائی یا پھر چارلی چیپلن کے آوارہ گرد کی کاپی کرنے کی ناکام کوشش میں آوارہ ہوتے رہے۔اگرچہ اُنہوں نے ہدایت کاری میں کمال حاصل کیا۔۔تو شمی کپور کی فلم ''اپریل فُول'' کا شہرہ یوں بھی ہوا تھا کہ اُس میں اُن کے مقابل پری چہرہ۔۔جنھوں نے کبھی کوئی پری نہیں دیکھی تھی اُن کے بقول پری چہرہ نسیم کی بیٹی سائرہ بانو جلوہ گر تھیں۔۔حال ہی میں مغرب کے بہترین تعلیمی اداروں میں ماسوا تعلیم کے اور بہت کچھ حاصل کر کے لوٹی تھیں اور سچی بات ہے وہ روایتی فلمی ہیروئنوں سے بہت مختلف تھیں اور اُن کا حسن عارضی طور پر مجھ پر اثر کر گیا تھا اور آج بھی

میری ہمشیرہ یاد دلاتی ہے کہ بھائی جان دِلّی سے واپسی پر آپ دن رات سائرہ بانو کی خوبصورتی کی توصیف میں پُل باندھتے تھے اور کہتے تھے کہ اُس کی اُنگلیاں اتنی لامبی ہیں کہ کہنیوں تک آتی ہیں۔۔

تب تک میں نے شاہ گوری کی اُنگلیاں نہیں دیکھی تھیں جو دل تک آتی تھیں۔۔

بعد میں یہی سائرہ بانو دلیپ کمار کے سحر میں گرفتار ہوئیں اور ایک دنیا جو دلیپ کمار کی اُمیدوار تھی اُس کی نظر میں معتوب ٹھہریں۔۔آج دلیپ کمار اسّی کے پیٹے میں ہیں اور اُن سے کہیں کم عمر سائرہ اُن کے مقابلے میں بہت ڈھل چکی ہیں۔۔

دِلّی کی اس سیاہ تصویر میں سردار گانڈ سنگھ کی شخصیت ایک ہیرے کی طرح دمکتی ہے۔۔اُس کا نام تو یقیناً کچھ اور تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔۔۔ویسے سرداروں کے نام کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔۔الگ۔انوکھے اور براہ راست اور اکثر دھرتی سے جڑے ہوئے۔۔یعنی کیکر سنگھ۔۔بُوٹا سنگھ۔۔سرسوں سنگھ۔۔کھڑک سنگھ وغیرہ۔۔اور ان میں اقبال سنگھ بھی ہوتے ہیں اور غالب سنگھ بھی۔۔کہ وہ اپنے نام درآمد نہیں کرتے۔۔اسی سرزمین سے حاصل کرتے ہیں۔۔یہ بُرائی یا خوبی پٹھانوں میں بھی ہے جو مقامی پھولوں اور موسموں کے مطابق اپنے نام رکھتے ہیں۔۔بہرحال یہ سردار گانڈ سنگھ ایک ایسا شہسوار تھا جو دوسری جنگ عظیم کے ایک پرانے کھٹارہ موٹر سائیکل رکشا پر سوار کُل دِلّی فتح کرنے پر قادر تھا۔۔

لال قلعے کی طویل دیوار۔۔بُرج اور مینار تو آتے جاتے ہمیشہ نظر میں رہتے تھے۔۔مولانا آزاد کے مرقد سے پرے۔۔گندگی کے ڈھیروں کے پس منظر میں۔۔جب کبھی میں نیو جواہر کے چوہوں کے سامنے کورنش بجالا کر صبح سویرے اُن سے رخصت ہوتا تو وہ فصیلیں مجھے دُھند میں ڈوبی ہوئی دکھائی دیتیں۔۔

دِلّی سے میں کیسے۔۔لال قلعہ دیکھے بغیر جُدا ہو سکتا تھا۔۔

چنانچہ آج لال قلعہ۔۔

قلعے کے سرخ۔۔لال دروازے۔۔محرابی دروازے کے باہر کوئی ہجوم تھا۔غیر ملکی

سیاح بھی اور مقامی لوگ بھی.. یعنی ہندوستان کے طول وعرض سے آنے والے مقامی لوگ بھی.. ٹھیلے والے.. گائڈ.. جوتشی.. سپیرے اور ایک جانب پارکنگ لاٹ میں متعدد موٹر سائیکل رکشا اپنے انجن آن کیے پھٹ پھٹ کرتے.. میں اس لال دروازے کی جانب اپنے اکلاپے میں مگن.. چلتا جا رہا تھا جب ایک قدرے فربہ سردار جی پتلون اور بش شرٹ میں اور ظاہر ہے ایک کسی ہوئی پگڑی میں بھی میری جانب لپکے چلے آئے.. یعنی اپنی نیم فربہی کے باوجود جتنا بھی لپک سکتے تھے اتنا لپکے چلے آئے اور ہاتھ جوڑ کر بولے ''مہاراج پنجاب سے آئے ہو.. دلّی دیکھنے آئے ہو تو میں آپ کو پوری دلّی دکھاؤں گا.. ساتھ میں ہر ہسٹاریکل مانومنٹ کے بارے میں کومنٹری کروں گا.. یاد کرو گے.. آ جاؤ۔''

میں نے اُن سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا ''ارے ہم تو خود دلّی والے ہیں، تم ہمیں دلّی کیا دکھاؤ گے میاں..''

اس پر سردار جی متبسم ہوئے.. اپنی داڑھی میں جتنے بھی پُرتبسم ہو سکتے تھے ہوئے اور کہا ''چھڈو جی۔''

''کیوں جی.. کیوں چھڈو جی؟''

''ان ہندوستانیوں کی تو شکلیں ہی اور ہوتی ہیں مہاراج.. آپ تو پنجاب کے لگتے ہو.. کہاں کے ہو.. پٹیالے کے.. امرتسر.. جالندھر.. کہاں کے ہو؟''

''سردار جی.. آپ ہندوستانی نہیں ہیں؟''

''آپاں تے پنجابی آں.. ایہہ دلّی دے جیہڑے پرانے باشندے نیں ہندوستانی تے ایہہ نیں.. اردو بولن والے۔''

یہاں میں ایک شدید دھچکے کا ذکر کروں گا اور پھر آگے بڑھوں گا..

دلّی میں وارد ہو کر میں نے اپنے تئیں اپنی اردو صیقل کرنے کی خاطر.. ذرا لب و لہجہ درست کرنے کی غرض سے اپنے حلق پر خاصا ظلم کر کے شین قاف کے اخراج کا خیال رکھا تو اس کا جواب اکثر و بیشتر پنجابی میں آیا.. دوکانوں میں.. ریستورانوں اور سواریوں میں جواب پنجابی میں آیا.. اور حیرت یہ ہوئی کہ دلّی اب اردو کا شہر نہیں اس پر پنجاب اور اس کی

زبان کا غلبہ ہو چکا ہے..

اردو اگر ہے تو ہندوستانی کہلاتی ہے.. اور کہیں ہے تو جامع مسجد کے اڑوس پڑوس میں اور شدید اقلیت میں.. باقی شہر میں پنجابی کا راج ہے..

ایک سردار جی سے میں نے اس کا سبب پوچھا تو کہنے لگے ''آپ کے سندھی شہروں میں سندھی کوئی نہیں بولتا.. سب اردو بولتے ہیں، کیوں؟''

میں نے کہا ''سردار جی میں نے آپ سے ایک سوال کیا ہے.. آپ جواب دینے کی بجائے اُلٹا مجھ سے سوال کر رہے ہیں۔''

بولے ''مہاراج.. جو آپ کے سندھی شہروں میں ہوا ہے وہ ادھر دلّی میں ہوا ہے.. لو جی ہم اپنے لاہور راولپنڈی اور گوجرانوالہ سے لٹ پٹا کے.. برباد ہو کر خالی ہاتھ شرنارتھی ہو کر ادھر آئے.. پلّے دھیلا نہ تھا.. تو ہم لوگ فٹ پاتھوں پر بیٹھے.. محنت مزدوریاں کیں.. عزت کو پرے کر کے جو کام ملا وہ کیا.. جان ہلکان کی.. جس کے نتیجے میں آج واہ گرو کی کرپا سے سارے کا سارا برنس ہمارے ہاتھ میں ہے.. مہاراج یہ ہندوستانی کچھ کام کاج نہیں کرتے..''

''یعنی دلّی کے مسلمان..'' میں نے قطع کلامی سردار کی..

''نہیں جی.. مسلمانوں کے علاوہ ادھر جو ہندو تھا دلّی والا.. وہ بھی کوئی کام کاج نہ کرتا تھا اور اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ پنجابیوں نے دلّی پر قبضہ کر لیا ہے.. مہاراج ہم نے اپنے کیس کھول کر یہاں جنوروں کی طرح مزدوری کی ہے تو کیوں قبضہ نہ کرتے.. ہیں جی؟''

تو اب یہ سردار جی.. جو لپکے چلے آتے تھے اور اپنا سانس درست کرتے ہوئے مجھے دلّی کی سیر پر مائل کر رہے تھے اگر مقامی باشندوں کو.. بے شک اُن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی ہندوستانی کہتے تھے تو میں اُن کے ملکی معاملات میں دخل دینے والا کون ہوتا تھا..

یہ سردار جی مجھے اپنے لچھے دار گفتگو میں جکڑ کر.. اور یاد رہے کہ وہ صرف پنجابی میں ہی نہیں بلکہ ٹھیٹھ اردو اور انگریزی کی کاک ٹیل میں بھی مجھے جکڑ کر اپنے موٹر سائیکل رکشا

کے پاس لے گئے..

رکشے کے آگے وہی دوسری جنگ عظیم کی یادگار ایک فوجی براؤن رنگ کی مضبوط ہڈ پیر والی اگرچہ زنگ آلود موٹر سائیکل جُتی ہوئی تھی اور پچھلی نشست پر تین انتہائی سوگوار سے نوجوان منہ لٹکائے بیٹھے تھے..

''مہاراج.. پورا دلّی گھماؤں گا.. برلا مندر دکھاؤں گا. تغلق آباد کی سیر کراؤں گا.. گاندھی جی کی سمادھ پر لے جاؤں گا.. پنڈت جی کے میوزیم میں لے کر جاؤں گا. قطب مینار دکھاؤں گا صرف پچاس روپے میں..دوپہر کا بھوجن اپنے پلّے سے کراؤں گا..اور ساتھ ساتھ ہسٹری بتاؤں گا..اور واپسی پر پاکستان کا ایمبیسی بھی دکھاؤں گا..''

پاکستان ایمبیسی کے حوالے نے مجھے چونکا دیا کہ میں نے ابھی سردار کو اپنے پاکستانی ہونے کا نہیں بتایا تھا. شاید وہ جان گیا تھا اور میرے جذبۂ حُب الوطنی کو بھڑکا کر مجھے شکار کرنا چاہتا تھا ''سردار جی پر یہ پاکستان والوں کی ایمبیسی کیوں دکھاؤ گے؟''

''لو جی.. پورے ڈپلومیٹک انکلیو میں سب سے بڑھیا یہی ایمبیسی ہے' لوگ دور دور سے دیکھنے آتے ہیں..''

اور یہ حقیقت ہے کہ اُن زمانوں میں دلّی کے پاکستانی سفارت خانے کی نئی عمارت کا بہت شہرہ تھا' اس کے نہایت پُر جمال سبز گنبد اور عالی شان سجاوٹیں دیگر سفارت خانوں کو رشک میں مبتلا کر دیتی تھیں..سوائے امریکی سفارت خانے کے جسے ایک ماڈرن تاج محل کہا گیا.. جسے ماہر تعمیرات ایڈورڈ سٹون نے ڈیزائن کیا..اسی سٹون نے لاہور میں واپڈا ہاؤس کی عمارت کا نقشہ بنایا تھا..

پہلے تو عین ارادہ ہوا کہ رکشے میں سوار ہو جاؤں کہ آفر بہت زبردست تھی لیکن مجھے لال قلعہ بھی بے شک ایک نظر دیکھنا تو تھا ''سوری سردار جی.. پہلے لال قلعہ.. پھر دلّی کی سیر کے بارے میں سوچیں گے..''

''مہاراج اندر کچھ بھی دیکھنے والا نہیں..محل شحل ہیں پرانے..اور جو میں آپ کو دکھاؤں گا وہ دیکھنے والا ہے۔''

''سوری سردار جی..''

میں نے محسوس کیا کہ میرے انکار پر رکشے میں سوار تینوں نوجوانوں کے ملول چہرے مزید لٹک گئے ہیں..

لال قلعے کے صدر دروازے تلے بے شمار چھوٹے چھوٹے سٹال تھے جہاں سیاحوں کے لیے مخصوص سوونیئر' گائڈ بکیں اور ٹی شرٹس وغیرہ برائے فروخت تھیں.. بیشتر سٹالوں پر تلک سجائے معمولی شکل کی ہندنیاں وغیرہ تھیں..کچھ سردار حضرات بھی داڑھیاں سنوارتے تھے.. پاکستان سے آنے کی وجہ سے ایک مسلم عہد کی عمارت میں ان کفار کو کاروبار کرتے دیکھ کر مجھ کچھ عجیب سا لگا..

ٹکٹ خرید کر میں مغلوں کی عظمت کے اس آخری بجھتے ہوئے نشان کے اندر داخل ہوا جہاں حمیت تیمور کے گھر سے رخصت ہوئی تھی..

یہ ایک اداس اور مٹیالا سا کامپلیکس تھا جس میں دل کو گرفت میں لے لینے والا کوئی جادو نہ تھا..شاید ایسا ہوا کہ میں صرف اپنی خالی آنکھیں لے کر اس کے اندر داخل ہوا..اگر ان آنکھوں میں تاریخ بھر کر لے جاتا تو شاید ہر اینٹ اور ہر جھروکے اور ہر محراب میں مجھے داستانیں نظر آتیں اور میں اُن کے پاس پاس بیٹھ کر گریہ کرتا..کہ یہ صرف تاریخ ہوتی ہے جو ایک سیاہ پتھر کو بھی افلاک کے ہم پلہ کر دیتی ہے..کسی کھنڈر..اُس کی ہر اینٹ کو وقار اور حسن عطا کرتی ہے ورنہ ہڑپہ اور موہنجو ڈارو میں اینٹوں کے سوا کیا رکھا ہے..لیکن اُن کی ایک اینٹ نیویارک یا پیرس پر بھاری ہے۔ اگر تاریخ آنکھوں میں بھری ہو تو! لیکن تاریخ میں ایک یکسانیت اور اُکتاہٹ بھی ہوتی ہے کہ اُسے کتابوں میں سے پڑھ کر کوئی بھی اپنی آنکھوں میں بھر سکتا ہے اور پھر وہی دیکھتا ہے جو تاریخ دکھاتی ہے' خود کچھ نہیں دیکھتا..

اسی لیے میں نے تاریخ سے اجتناب کیا کہ جو جاننا چاہتا ہے وہ کتابوں میں پڑھ لے میں اُسے کیوں دوہراؤں..تو میں لال قلعے کے اندر صرف اپنی آنکھیں لے کر گیا اور انہیں یہی نظر آیا کہ ایک مٹیالا سا اور اداس عمارتوں کا جزیرہ ہے' محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں مدتوں سے بارش نہیں ہوئی..دلّی کی برساتوں میں صرف یہ جزیرہ تھا جو نہیں دُھلا..

میں خصوصی طور پر موتی مسجد میں بہت دیر تک رہا..اور میں وہاں تنہا تھا..کہا جاتا ہے کہ شاہی قلعہ لاہور کی موتی مسجد اس کی نقل ہے..

دیوان عام اور دیوان خاص بھی رنجیدہ موسموں اور سوگواروں میں تھے..

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لال قلعہ کسی حد تک شاہی قلعہ لاہور کی ماں ہے..لیکن یہ ماں بہت عمر رسیدہ اور زوال پذیر تھی اور اس میں کچھ کشش نہ تھی..لاہور کی موتی مسجد ایک موتی کی مانند اب بھی دمکتی ہے اگرچہ وہ اب ایک مملکت اسلامیہ میں ہے مگر وہاں کوئی نماز نہیں پڑھتا.لیکن دلّی کی موتی مسجد کے موتی ماند پڑ چکے ہیں..

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ نقل..اصل سے آگے نکل جاتی ہے..سلمان عالی شان اور سنان کی تعمیر کردہ نیلی مسجد' آیا صوفیہ چرچ کی ہو بہو کاپی ہے..اور اس کے باوجود اپنی نفاست اور حسن میں اُسے ماند کر دیتی ہے..کچھ ایسا ہی فرق لاہور اور دلّی کے قلعے کے درمیان آ گیا تھا..

ایک اور واضح سبب بھی تھا..

آدھا ہندوستان کھنڈروں سے اٹا پڑا ہے....دراوڑی شہر.. بدھ مت کے سٹوپے..ہندو راجوں مہاراجوں کی پُرعظمت نشانیاں..قلعے..مساجد..مندر اور جانے کیا کیا..تو وہ کس کس کو سنبھالیں..اپنے آپ کو سنبھالیں یا ماضی کی ان یادگاروں کو سنبھالیں..جس ملک کے پاس تاج محل ہو وہ اور کچھ بھی نہ سنبھالے تو اُسے دوش نہیں دیا جا سکتا..جب کہ پاکستان میں ایسی یادگاروں کی کچھ قلت ہے اور ہم ہندو شاہی عہد سے نظریں چُرا کر گندھارا کو کسی حد تک سنبھال لیتے ہیں اور مغل عہد کی یادگاروں کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں' جھاڑ پونچھ کر سینت سینت کر رکھتے ہیں اُنہیں لشکاتے چمکاتے رہتے ہیں جیسے ایک شخص جس کے پاس رہنے کو ایک مختصر سا کمرہ ہو وہ اُس کی آرائش اور زیبائش میں جُتا رہتا ہے جب کہ ایک وسیع حویلی میں رہائش کرنے والا کچھ لاپرواہ ہو جاتا ہے کہ سینکڑوں کمروں میں سے کس کس کا خیال رکھے..کسے سنبھالے..کتنے جالے صاف کرے اور کس کس اینٹ پر توجہ دے..

تو لال قلعہ میرے من میں ایک مندر نہ ہوا..

اُس نے مجھے لبھایا نہیں..دل پر اثر نہ کیا..

اسے میں نے اپنی تاریخ سے خالی آنکھوں سے محض ڈیڑھ دو گھنٹے میں بھگتا دیا..
اسے نپٹا کر باہر آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ سردار جی اب بھی قائم دائم ہیں...البتہ تینوں نوجوان سوار افیونیوں کی مانند ایک اونگھ میں ہیں..

مجھے لال قلعے سے باہر آتا دیکھ کر سردار جی پھر لپکے..یعنی اپنے بھاری تن و توش کو سنبھالتے جتنا بھی لپک سکتے تھے' لپکے..''مہاراج..اب تو آپ نے لال قلعہ دیکھ لیا..صرف پچاس روپے میں پوری دلّی دکھاؤں گا..ہسٹری بھی بتاؤں گا..آ جاؤ..''

میرے پاس کرنے کو اور کچھ نہ تھا سوائے نیو جواہر کے ڈربے میں جانے کے اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان سردار جی کی پیشکش کو رد نہیں کروں گا لیکن محض نخرے کرنے کی خاطر میں نے کہا ''پچاس روپے تو بہت زیادہ ہیں مہاراج..تیس روپے دوں گا..''

اس پر سردار جی قدرے طیش میں آ گئے ''پورے دلّی کے صرف تیس روپے..
واہگرو کی سونہہ..پچاس سے ایک آنہ کم نہ لوں گا..بیٹھنا ہے تو بیٹھو ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ..''

اُن کا یہ کہنا تھا کہ رکشے میں صدیوں سے بیٹھے اونگھتے ہوئے تین میں سے دو نوجوان نیچے اُترے' خیر میرے پاؤں تو نہیں پڑے لیکن نہایت عاجزی سے منت کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر اُنہوں نے کہا ''سَر..پلیز آپ آ جائیے..بے شک تیس روپے دے دیجیے بقیہ بیس ہم ادا کر دیں گے لیکن..فار گاڈ سیک آ جائیے..''

مجھے اُن کی جانثاری کی سمجھ نہ آئی..لیکن اُنہوں نے سمجھا دی ''سَر ہم بھی دلّی کے نہیں ہیں..جب دو تین گھنٹے پہلے ان سردار جی سے معاملہ طے ہوا تھا اور ہم ان کے رکشے میں سوار ہوئے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ میں تب تک موٹر سائیکل کو کِک نہیں ماروں گا جب تک ایک اور..چوتھی سواری نہیں آ جاتی..اور ہم نے قبول کر لیا کہ منظور..اب پچھلے ڈھائی گھنٹوں سے رکشے میں بیٹھے ہیں اور چوتھی سواری نہیں مل رہی..ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ ہم چوتھی سواری کی قیمت ادا کر دیتے ہیں آپ چلو..لیکن کہتے ہیں کہ نہیں..نانک نے ہمیشہ

سچا سودا کیا تھا' میں جھوٹا سودا نہیں کر سکتا.. چوتھی سواری ملے گی تو جاؤں گا.. پلیز آپ آ جائیے..پلیز۔"

ان تینوں میں سے دو راجھستانی تھے..ایک مسلمان اور ایک ہندو..یہ جو ہندو بالکا تھا وہ اپنے مسلمان یار کو دلّی چھوڑنے آیا تھا جہاں سے اُس نے اگلے روز برطانیہ روانہ ہونا تھا..اور تیسرا نوجوان دلّی وال تھا جو اُن دونوں کا مشترکہ دوست تھا..

تب میں نے اُنہیں اپنے پاکستانی ہونے کا بتایا..

اس پر پہلا ردعمل سردار جی کی جانب سے وارد ہوا.. چونکہ مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا سوائے اس کے کہ کچھ سنگھ تھے چنانچہ اُن کے پیشے کو مدنظر رکھتے ہوئے اُنہیں سردار گائیڈ سنگھ کہا جا سکتا ہے..وہ کہنے لگے.. "لو مہاراج آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا..کون سے شہر سے آئے ہو؟"

"لاہور"

لاہور ہمیشہ سے دلّی میں ایک جادوئی نام رہا ہے' جس کے ادا کرنے پر دروازے سے کھل جاتے تھے..کچھ دروازے تلخ یادوں کی بنا پر بند بھی ہو جاتے تھے۔ "میں ریاں شہر لہور دیاں.." گائیڈ سنگھ نے حسرت سے کہا "مہاراج آپ کو رکشے پر تو کیا سر آنکھوں پر بٹھا کر لے جائیں گے۔"

ہم بیٹھ گئے..رکشے پر..اُن تینوں کے ہمراہ اور اگلے چند لمحوں میں ہم دوست ہو چکے تھے اور گائیڈ سنگھ ہمارا انکل ہو چکا تھا..

دلّی یاترا شروع ہو گئی..

سواری آرام دہ تھی..ہوادار تھی..قدرے خود پسند اور تیز رفتار تھی..

موٹر سائیکل جس کے پیچھے ہم بندھے ہوئے تھے اور جس کی آہنی نشست پر گائیڈ سنگھ ایک شاہسوار تھے' تھا تو برٹش آرمی کا متروک شدہ پر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ہڈ پیر کا مضبوط تھا اور سڑک پر جم کر چلتا تھا' انجن کی آواز طاقتور اور سُر میں تھی..

ایک انجن سُر میں کیسے ہو سکتا ہے؟..یہ مجھے مہدی حسن نے بتایا..ٹیلی ویژن کے

ایک پروگرام کے دوران جب میں نے اُن کی ابتدائی زندگی کے بارے میں دریافت کیا تو کہنے لگے "تارڑ صاحب میں نے زندگی میں بہت کشٹ کاٹے ہیں.. بہاولپور میں ایک عرصہ موٹر مکینک کا کام بھی کیا ہے۔" میں نے پوچھا کہ حضور یہ کیسا بے سُرا کام آپ کرتے رہے ہیں تو کہنے لگے "نہیں..اصل سُر کی پہچان تو ایک بڑھیا مکینک کو ہی ہوتی ہے..اگر آپ ایک انجن کی ٹیوننگ درست کرتے ہیں تو اُس کی آواز میں ایک خاص ردھم آ جاتی ہے' وہ سُریلا ہو جاتا ہے..کان لگا کر سنیں تو کہیں بے سُرا نہیں ہوتا۔"

تو گائیڈ سنگھ کے موٹر سائیکل کی آواز سُر میں تھی..اور یہ کمال بھی اُسی کا تھا کہ وہ ایک کمال کا میکینک تھا..

جونہی ہم لال قلعے کی پارکنگ لاٹ کی بھیڑ میں سے نکلے..تو موٹر سائیکل کے ساتھ ہی گائیڈ سنگھ بھی سٹارٹ ہو گئے.. ہر عمارت' ہر شاہراہ اور ہر کھنڈر کے بارے میں تاریخی اور نیم تاریخی معلومات اردو' پنجابی اور زیادہ تر بہ زبان انگریزی بہم پہنچانے لگے..

ہم چاروں بے شک آپس میں باتیں کر رہے ہوں..قہقہے لگا رہے ہوں اُنہوں نے جو کچھ ایک گائیڈ کے طور پر پہنچانا تھا' بہم پہنچاتے رہے..بلکہ ایک بار ہم نے گزارش بھی کہ ہمیں اتنی وسیع معلومات درکار نہیں لیکن اُنہوں نے ایک نہ سنی..سنتے بھی کیسے کہ وہ ہم سے الگ تھلگ آگے براجمان انجن کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر باتیں کیے چلے جا رہے تھے یعنی ڈوئٹ گا رہے تھے..

ٹریفک کے ایک اشارے پر رُکے تو ہم سب نے مشترکہ طور پر درخواست کی کہ پلیز کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کر لیں' اس پر اُنہوں نے وہی گھنے بالوں میں سے نیم نمودار ہوتا تبسم کیا اور کہنے لگے "مہاراج پچاس روپے میں یہ میرا فرض ہے کہ میں ٹورسٹ لوگوں کو ساتھ میں گائیڈ بھی کروں.. مجھے اس کی ایسی عادت ہو گئی ہے..ساتھ میں گائیڈ کرنے کی کہ میں چپ بیٹھ کر موٹر سائیکل نہیں چلا سکتا..چپ ہو جاؤں تو اس کی بریکیں فیل ہو جاتی ہیں۔"

ہم نے اُنہیں بولنے دیا..

سب سے اول حیرت تو سنگ سرخ سے تعمیر کردہ صدارتی محل یا راشٹر پتی بھون تھا جو صرف ایک عمارت نہ تھی ایک حیرت کدہ شہر تھا۔کولونیل اور ہندوستانی طرزِ تعمیر کا ایک عجوبہ ایک شاہکار تھا..اس کی جانب بڑھتے ہوئے ہندوستان کی عظمت اور خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے..مجھے ایسی عالی شان اور بارعب عمارت کی توقع نہ تھی.. یوم جمہوریہ کی پریڈ اس کے سامنے جو ایک طویل شاہراہ ہے اُس پر منعقد ہوتی ہے جہاں داخل ہونے والا فوجی بینڈ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' بجاتا ہوا اس یوم کا آغاز کرتا ہے..شاید نہیں یقیناً دنیا بھر میں کوئی اور صدارتی محل..وہائٹ ہاؤس سمیت..اتنا پرشکوہ اور دیدہ زیب نہیں ہے..ہمارا صدارتی محل بھی برا نہیں ہے..صرف اس میں جو بیشتر صدر آتے ہیں وہ برے ہوتے ہیں..

برلا مندر کے باہر ہماری سواری پہلی بار رُکی..

یہ مندر دلی کے قابل دید مقامات میں شمار ہوتا ہے..جانے کیوں شمار ہوتا ہے..

میرا قیاس تو یہی تھا کہ یہ ایک ہزاروں برس قدیم پتھریلا..بھید بھرا..ایک معبد ہوگا اور ہم اس کی نیم تاریکی میں داخل ہو کر رامائن اور مہا بھارت کے زمانوں میں چلے جائیں گے..داخلے پر ایک گورو گھنٹال ہوگا جسے بجائیں گے کہ اے بُتان ہند خبردار..ایک بُت شکن آن پہنچا ہے..ایک مومن تمہارے قدیم مسکن میں آ گیا ہے..اگرچہ یہ مومن اندر سے ڈرا ہوا بھی ہے کہ کہیں اپنے پرانے خداؤں کے حضور پہنچ کر ڈگمگا نہ جائے اور سجدہ ریز نہ ہو جائے..لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے مجھے اس امتحان میں نہ ڈالا..مجھے مرتد ہونے سے بچا لیا کہ یہ مندر..برلا مندر..ایک بیہودہ سا مندر تھا..کچھ جدید سا نواں نکور شعبدہ مندر تھا..جیسے ایک فلم کا سیٹ ہوتا ہے..اس میں کچھ کشش نہ تھی..جانے کیوں دلی کے قابل دید مقامات میں شمار ہوتا ہے..

ہمارا دوسرا اسٹاپ گاندھی جی کی سمادھ تھی..

جہاں وہ جلائے گئے..

البتہ یہ ایک پُراثر اور دل کو چھونے والا مقام تھا..

کھلے آسمان تلے ''انڈین فقیر'' کی یادگار تھی.. بلکہ برہنہ انڈین فقیر.. بقول متعصب..ہندوستانیوں کو انسان نہ سمجھنے والے چرچل کے..

جسے اس کے ماننے والوں نے مہا آتما کہا..اور اہل مغرب نے بھی اُسے اوتاروں کے برابر میں جگہ دی..

میں نے انگلستان میں قیام کے دوران ایک چرچ کے باہر آویزاں بورڈ پر جہاں عام طور پر حضرت عیسٰی کے اقوال درج ہوتے ہیں' وہاں گاندھی جی کا ایک قول بھی درج دیکھا۔ ہمارے ہاں اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُس شخص کا دل ہندو تھا اور کیوں نہ ہوتا.. کیا ہم پسند کریں گے کہ ہمارا دل مسلمان نہ ہو؟ اس کے باوجود کہ اُس نے پاکستان کے حصے میں آنے والے اثاثوں کو منتقل کرنے کے لیے مرن برت رکھا اور جب کلکتہ میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو یہ گاندھی تھا جس نے حسین شہید سہروردی کے ہمراہ.. پاکستانی سیاست میں بھٹو کے علاوہ ذہین ترین شخص کے ہمراہ اُن فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا اور نفرت کی آگ کو بجھانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ نتھورام گاڈسے نے اسے صرف اس لیے قتل کر دیا کہ وہ مسلمانوں کا طرفدار ہے..میں نے حال ہی میں اس نتھورام گاڈسے کے ایک عمر رسیدہ بھائی کا ایک ٹیلی ویژن انٹرویو دیکھا جس میں اُس نے نہایت فخر سے کہا کہ اگر میں اپنے بھائی کی جگہ ہوتا تو میں بھی گاندھی کو قتل کر دیتا کہ وہ مسلمانوں کا طرفدار تھا۔ باقی رہ گئی اپنے..میرے بابا جناح اور گاندھی کے درمیان جو سیاسی اختلاف اور مخاصمت تھی' تو اُن دنوں کے درمیان ایک جنگ تھی اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے..

ایک اور اعتراض نہایت جسارت سے کیا جاتا ہے کہ گاندھی کی وہ بکری جس کے دودھ پر وہ گزارہ کرتے تھے' بادام کھاتی تھی... ہمارے ہاں اگر گھوڑوں کو سوس چاکلیٹ کھلائے جاتے ہیں تو اُن کی بکری نے اگر دو چار بادام پھانک لیے تو کیا مضائقہ ہے..البتہ اُن پر ایک الزام ایسا ہے جس میں خاصا وزن ہے کہ وہ جن خواتین کا سہارا لے کر چلتے

تھے..اور اُن میں ایک فرنگی حسینہ بھی ہوتی تھی..وہ نہایت نوخیز اور رُوح پرور ہوا کرتی تھی..
ظاہر ہے یہ ایک نہایت غیر شرعی حرکت تھی جس کا جواز تلاش کرنا مشکل ہے..اُنہیں چاہیے تھا کہ وہ اپنے جیسی سوکھی سڑی نقاہت زدہ..دو چار بوڑھیوں کا سہارا لے کر چلتے..یوں بھی ہندو تھے تو اُن پر شرع کا اطلاق نہیں ہو سکتا..اُن کی ہموار یادگار کے تھڑے پر گیندے کے چند پھول پڑے تھے..آسمان تلے جو سمادھ تھی جس پر گیندے کے چند پھول پڑے تھے اُس کے برابر میں ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا‘ جہاں عام ناتراشیدہ لکڑی کا ایک تختہ پڑا تھا جس پر قاتلانہ حملے کے بعد گاندھی جی کو لٹایا گیا تھا اور اِس تختے پر اُس ناتواں بابے کے خون کے دھبے نمایاں ہو رہے تھے اور اتنی برساتوں کے بعد بھی نہیں دُھلے تھے..

شیشے کا ایک مختصر شوکیس تھا جس میں گاندھی کی کُل متاعِ دنیا سجی تھی..یعنی ایک دھوتی..کمان دار گول شیشوں والی ایک عینک..ایک عصا اور لکڑی کی کھڑاویں..اگر وہ سادگی اور فقیری کا رُوپ بھرتا تھا تو کمال کا بہروپیا تھا..

ہم کچھ دیر وہاں اور ٹھہرتے لیکن گائیڈ سنگھ گھڑی پر نظر رکھتا تھا اور جتنی گھڑیاں اُس کے حساب سے ہم نے گاندھی کی سمادھ پر گزارنی تھیں‘ گزار چکے تھے..سفر پھر شروع ہوا تو راجھستانی ہندو لڑکے نے دِلّی کے بارے میں میرے تاثرات دریافت کیے‘ میں نے اپنی پِتا سنا دی..نو جواہر کے چوہوں سمیت تو وہ ذرا دُکھی ہوا کہ اُسے اپنی راجدھانی کے بارے میں ایسے تاثرات کی توقع نہ تھی ’’چلیے دِلّی آپ کو پسند نہیں آیا..تاج محل تو پسند آیا ہو گا؟‘‘

میں نے ایک اور پِتا سنا دی کہ کیسے میں نے اپنی ویزا کی درخواست میں دِلّی‘ بمبئی اور آگرہ کا اندراج کیا تھا اور تمہارے ظالم سفارت کاروں نے آگرہ انکار کر دیا..تو اب میں بے تاج ہی واپس جاؤں گا..

اس پر اُن تینوں حضرات نے آپس میں کھسر پھسر کی..اپنی اپنی بولیاں بولیں اور پھر ہندو بچہ کہنے لگا ’’ہم کل صبح تاج ایکسپریس کے ذریعے آگرہ جا رہے ہیں..اور آپ کو ساتھ لے کر جا رہے ہیں..آپ تاج محل دیکھیں گے..‘‘

’’نہ..میرے پاس آگرے کا ویزا نہیں ہے..پکڑا گیا تو پاکستانی جاسوس ہونے

کے الزام میں گندی گندی ہندوستانی جیلوں میں عمر بھر سڑتا رہوں گا..نہ..‘‘

’’سر ایک تو آپ ہمارے ساتھ ہوں گے..کسی کو شک بھی نہ ہو گا کہ آپ پاکستانی ہیں..اور شما کیجیے گا لیکن..آپ ہم سے بھی زیادہ ہندو لگتے ہیں بلکہ بہت ہی ہندو لگتے ہیں..‘‘

مجھے ازحد قلق ہوا کہ ہائیں ہم اب بھی ہندو لگتے ہیں..

مسلمان راجھستانی جو عازمِ انگلستان تھا‘ ہنسنے لگا ’’میرا یار درست کہتا ہے..آپ کی آنکھوں میں جو سُرخی ہے اور ناک نقشہ ہے وہ بالکل ان کے براہمنوں جیسا ہے..آپ بڑی آسانی سے کوئی مندر سنبھال سکتے ہیں..ذرا لنگوٹی باندھ لیں اور ماتھے پر تلک لگا لیں تو لوگ آپ کے چرن چھونے لگیں..‘‘

کنّیں مُندراں پا کے..متّھے تلک لگا کے..میں جاناں جوگی دے نال..

اگر اتنی سی بات تھی کہ کانوں میں بالے ڈال کے..ماتھے پر تلک لگا کے ہیر مل جاتی تو کس کافر کو انکار تھا..آپ جو بھی جتن کر لیں ہیر کُوکتی رہے کہ میں نئیں جانا کھیڑیاں دے نال..اُسے کھیڑے ہی لے جاتے ہیں۔ ویسے اپنی خوش شکلی کے بارے میں ہم نے جتنے زعم پال رکھے تھے‘ وہ ایک ایک کر کے ہماری پالتو قید سے فرار ہو گئے کہ ہم نے اس کافرانہ مشابہت کو کچھ پسند نہ کیا..اگرچہ کچھ لمحوں کے لیے اس پیشکش پر سنجیدگی سے غور کیا کہ یہ کیا کہ آپ قاہرہ میں ہوں اور اہرام دیکھے بغیر لوٹ جائیں..بیجنگ میں ہوں اور دیوار چین کا دیدار نہ کریں..لیکن پکڑے جانے کے خدشے اور جیل میں ڈال دیے جانے کے ڈر سے میں مغلوب ہوا اور انکاری ہو گیا..

تغلق آباد کی فصیل کے سائے تلے ہم پھٹ پھٹ کرتے گزرتے جاتے تھے اور گائیڈ سنگھ اس اجڑے ہوئے شہر کی تاریخ بیان کیے جاتا تھا..

جب میں آگرہ جانے سے انکاری ہو گیا تو راجھستانی حضرت نے ایک اور پیشکش کی ’’چلیے آپ تاج نہ دیکھیے..پرسوں ہم اپنے مسلمان دوست کو وداع کر کے واپس راجھستان جا رہے ہیں تو آپ بے خطر ہمارے ساتھ چلیے..ہمارا اپنا علاقہ ہے..کوئی چیکنگ نہیں ہو گی۔ ہم ذمہ داری لیتے ہیں..کوئی نہیں پوچھے گا کہ آپ یوں بھی کچھ

کچھ راجھستانی لگتے ہیں۔"

میں نے سوچا یہ ہندو لونڈے مجھے مروانے پہ تُلے ہوئے ہیں۔۔ابھی ابھی مجھے کسی مندر کو سنبھالنے کا مشورہ دے رہے تھے اور اب مجھے ایک شوخ رنگ کی پگڑی میں۔۔زرد۔ سرخ یا گلابی پگڑی میں مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے ایک راجھستانی کا رُوپ دے رہے ہیں۔ اگر ابھی میں نے بھوٹان کے بارے میں دلچسپی کا اظہار کیا تو یہ کہیں گے۔۔میری ستواں ناک اور بڑی آنکھوں کے باوجود۔۔کہ آہا آپ تو شکل سے سراسر بھوٹانی لگتے ہیں' مجھے بہرطور پھنسانے کے چکر میں ہیں' اگرچہ یہ چکر محبت اور خلوص کا ہے۔۔

میں نے بہرحال حتمی طور پر انکار نہ کیا اُن سے کچھ سوچ سمجھنے لینے کی اجازت چاہی کہ۔۔ہندوستان بھر میں پہلے تو وہ وادی میرے دل میں جگہ بناتی تھی جسے کشمیر کہتے ہیں۔ جہاں میرے اباجی کی پھولوں کی پہاڑی ہے۔۔

سرینگر کے نواح میں ہمارا ایک فارم ہوا کرتا تھا جہاں پھولوں کے بیج تیار کیے جاتے تھے۔۔ڈہلیا کے پھولوں کی فصلیں جھیل ڈل کے کناروں تک جاتی تھیں۔۔اباجی اُن دنوں پورا موسم گرما اُس فارم کی نگہداشت کے لیے سرینگر میں گزارتے تھے۔ وفات سے کچھ عرصہ پیشتر جب اُن کی نیلی آنکھیں بجھ رہی تھیں تو وہ کشمیر کو بہت یاد کرتے تھے اور اُنہوں نے مجھے اس پہاڑی کی کہانی سنائی۔

"سرینگر جاتے ہوئے درّہ بانہال سے ادھر نندہ بس سروس ایک مقام پر چائے کے لیے رُکی۔۔ باقی لوگ تو چائے پینے میں مشغول ہو گئے لیکن میں مختصر بازار کے آگے جو ایک چھوٹی سی بنجر پہاڑی تھی اُدھر چلا گیا۔۔ادھر آب و ہوا موزوں ہے' بارش بھی اکثر ہوتی ہے تو یہ پہاڑی بے آب و گیاہ کیوں ہے۔۔میں نے اُس کی مٹی مٹھی میں بھر کر سونگھی۔۔اُس کے رنگ اور ساخت پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ قابل ہے' زرخیز ہے۔ یہاں اگر مردہ بیج بھی بو دیئے جائیں تو وہ پھوٹ آئیں گے۔۔وہ برس تو گزر گیا۔۔اگلے برس جب میں سرینگر کے لیے روانہ ہوا تو میں نے اپنی سیڈ کمپنی (کسان اینڈ کمپنی) کے پرانے درآمد شدہ پھولوں

کے بیجوں کی ایک پوٹلی بھری۔۔بس اُسی مختصر سے بازار میں چائے کے لیے رُکی' باقی لوگ چائے پینے لگے اور میں اپنی پوٹلی سنبھالے ایک عدد چھوٹی سی رمبی سنبھالے اس پہاڑی کی جانب گیا۔۔رمبی سے مٹی پلٹتا اور اُس میں کچھ نہ کچھ ڈال کر برابر کر دیتا۔۔اگرچہ جوان تھا لیکن سانس چڑھ گیا کہ میں بس چلنے سے پیشتر اس پوری پہاڑی پر پھولوں کے بیج بکھیر دینا چاہتا تھا۔۔نیچے چائے خانے میں براجمان میرے ہم سفر مجھے حیرت سے تکتے تھے کہ یہ نوجوان پنجابی آخر کر کیا رہا ہے۔۔ پاگلوں کی مانند پہاڑی پر بے مقصد دوڑتا پھرتا ہے۔۔کبھی جھکتا ہے اور زمین کُریدتا ہے اور اُس میں اپنی پوٹلی سے جانے کیا نکال کر دباتا ہے۔۔سکھ بس ڈرائیور نے ہارن دینے شروع کر دیئے کہ سب سواریاں موجود ہیں تم بھی آ جاؤ ورنہ میں چلتا ہوں۔۔ میں جب ہانپتا ہوا اپنی پوٹلی خالی کر کے بس میں واپس آیا تو ہم سفروں نے بہت پوچھا کہ تم وہاں کیا کر رہے تھے اور میں نے کہا کہ سیر کر رہا تھا کیونکہ جو کچھ میں کر رہا تھا وہ اُن کی سمجھ میں نہ آ سکتا تھا۔۔

ایک اور برس گزر گیا اور میں ایک مرتبہ پھر بس پر سوار سرینگر جا رہا تھا۔۔بانہال درّے سے ذرا ادھر جب بس نے ایک موڑ کاٹا تو رنگا رنگ پھولوں سے دامن سے چوٹی تک بھری ہوئی رنگوں کی ایک پہاڑی نظر آئی۔۔اور میرا جی خوش ہو گیا۔۔میں نے کسی بھی ہم سفر سے تذکرہ نہیں کیا کہ ان پھولوں کے جو تم سو رنگ دیکھتے ہو۔۔اُن کو میں نے بویا تھا۔۔تذکرہ کرتا تو بھلا کیوں کرتا یہ سب کچھ تو میں نے اپنے لیے کیا تھا۔۔اس کے بعد دو تین برس تک سرینگر جاتے ہوئے میں نے اُس پہاڑی کو پہلے سے بھی زیادہ سرسبز اور گُل رنگ دیکھا۔۔ پھولوں سے اٹا ہوا دیکھا۔۔جانے وہ پہاڑی اب بھی ہے کہ نہیں۔۔دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔"

میں نے بھی اپنی حیات میں اپنے تئیں بنجر زمینوں میں پھول کھلائے۔۔ پہاڑوں کو گُل رنگ کیا لیکن میں۔۔چھوٹے دل کا تھا ہر کسی سے داد چاہتا تھا۔۔شہرت کا بھوکا تھا کہ دیکھو سب میری طرف دیکھو میری توصیف کرو کہ میں نے کیسا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔۔ میری ستائش کرو۔۔شاید اسی لیے میری تخلیق کردہ پھولوں کی پہاڑیوں میں لالچ اور شہرت کی

طلب کی امر بیلیں تھیں جوان پھولوں کو کھا گئیں.. میں اپنے اباجی ایسا بے غرض اور فرشتہ خصلت نہ ہو سکا..

تو ہندوستان میں میری ترجیح اول کشمیر تھا جہاں میرے اباجی کی پھولوں والی پہاڑی مجھے یقین ہے کہ اب بھی قوس وقزح کے رنگ بکھیرتی ہے اور میں اسے دیکھنا چاہتا تھا لیکن یہ 1965ء تھا. فروری تھا اور ستمبر میں اسی کشمیر کے لیے ایک جنگ کا آغاز ہونے والا تھا تو مجھے وہاں جانے کے لیے ویزا یا اجازت کیسے مل سکتی تھی..

ہندوستان میں میری دوسری پسند راجھستان تھا.. گلابی محلوں اور جادوئی جھیلوں اور لباس کی شوخی سے جھلملاتا راجھستان.. اسی لیے میں نے اس پیشکش کو فوری طور پر رد نہ کیا اور کچھ سوچ سمجھ لینے اور حساب کتاب کرنے کی اجازت چاہی..

لنچ بریک کے لیے سردار گائڈ سنگھ کا سُریلا رکشا ایک چھپر ہوٹل یا ڈھابے کے پاس آن رُکا..

ڈھابے کے چھپر تلے وہی مخصوص بنچ اور رعشہ زدہ چند کرسیاں تھیں اور اس پر ستم یہ کہ سراسر دال اور ترکاری کے معاملات تھے.. البتہ تنور سے جو گرم گرم روٹیاں مسلسل برآمد ہو رہی تھیں اُن کی مہک میری مومن بھوک میں دُھومیں مچاتی تھی.. صد شکر کہ وہاں انڈوں پر پابندی نہ تھی۔ چنانچہ میں نے آملیٹ کا آرڈر دیا.. آرڈر آیا تو ناتواں ویٹر.. شاید کہ وہ ناتواں نہ ہو لیکن پنجاب سے جانے والوں کو ہر دتی وال قدرے ناتواں لگتا ہے.. تو وہ آملیٹ کے ہمراہ دال کی ایک پلیٹ بھی میری جھولتی ہوئی میز پر رکھ گیا.. اس پر میں نے اُسے پکارا کہ بھائی میاں ہم نے دال کا قطعی طور پر آرڈر نہیں دیا..

اس پر اُس نے مرد ناتواں نے صرف اتنا کہا "چلتا ہے.."

"کیوں چلتا ہے.. میں نے آرڈر ہی نہیں دیا تو کیوں چلتا ہے؟"

"بس چلتا ہے" وہ یہ کہہ کر کہیں اور مشغول ہو گیا..

مجھے پیچ و تاب کھاتے دیکھ کر گائڈ سنگھ نے داڑھی سنوارتے ہوئے مجھے اطلاع

کی کہ.. مہاراج یہ دال کی پلیٹ ساتھ میں مفت میں آتی ہے چاہے آپ ایک روٹی آرڈر کرو.. جی نہیں چاہتا تو نہ کھائیں اس کے پیسے نہیں ہیں..

میں نے گرم روٹی کے ایک دو لقمے آملیٹ کے ساتھ کھائے اور پھر یونہی بر سبیل دال اُس دال میں سے ایک نوالہ لیا اور جانے ان ہندوؤں نے اُس میں کُفر کے کیسے کیسے تیز اور ذائقہ دار مصالحے ڈالے تھے کہ میں اُس کے ساتھ جُڑ گیا اور آملیٹ پڑا کا پڑا رہ گیا..

میں نے سوچا کہ اگر ہندو حضرات ایسی دال خوری کرتے ہیں تو کیا برا کرتے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم پھر موٹر سائیکل کے سُر کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگے.. مجھے اب احساس ہو رہا تھا کہ گائڈ سنگھ واقعی رزق حلال پر یقین رکھتا ہے۔ اگرچہ اس کی جیب میں جو انڈین کرنسی ہے اُس پر "رزق حلال عین عبادت ہے" نہیں لکھا ہوا اور اس کے باوجود یقین رکھتا ہے.. مجھے اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنے طویل فاصلے طے کرے گا.. اتنی ڈھیر ساری معلومات مسلسل مہیا کرے گا اور اُس کی داڑھی پر ایک شکن بھی نہ آئے گی..

طے شدہ شیڈیول میں مجھے سب سے اُکتا دینے والا سٹاپ "نہرو میوزیم" لگتا تھا.. عجائب گھروں میں دل کو لبھانے والے مقام نہیں ہوتے اور پھر نہرو کا عجائب گھر ہو تو ہم پاکستانی فوری طور پر الرجک ہو جاتے ہیں..

اور میں کتنا غلط تھا..

یہ کوئی اور نہرو تھا جس کے گھر میں میں داخل ہوا..

وہ گھر اور اُس کے آس پاس پھیلے وسیع سبزہ زار اور کُنج جہاں پنڈت جی نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دن اور راتیں گزاریں اُنہیں جوں کا توں محفوظ کر لیا گیا تھا۔ آپ ہندوستان کے پہلے وزیراعظم کے شب و روز میں یوں داخل ہو جاتے تھے کہ وہ اُس گھر میں اور اُس کے وسیع لان میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے.. ہر شے اُن کی حیات کی محفوظ تھی..

چھٹی جماعت سے شروع ہو کر ہیرو سکول اور یونیورسٹی تک کی.. اُن کی کتابیں،

نوٹس.. تھیسس.. بچپن کے کتابوں والے بستے.. ہر شے شوکیس میں سجی تھی..

سکول کے زمانوں کی کاپیاں.. پینسلیں.. قلم..

یہاں تک کہ پنجاب کے کسی تھانے میں اُن کے خلاف انگریز دشمنی کی پاداش میں جو ایف آئی آر درج ہوئی تھی اُس کا اوریجنل رجسٹر بھی.. کہ جواہر لال نہرو.. پسر موتی لال نہرو.. انگریز سرکار کے خلاف بغاوت.. وغیرہ وغیرہ!

مجھے اُس گھر میں گھومتے ہوئے اُن کی ذاتی لائبریری سے زیادہ دلچسپی تھی کہ وہ میرے لیے ایک سیاسی لیڈر کی بجائے ایک دانشور اور مصنف کے طور پر زیادہ اہمیت رکھتے تھے.. میں اُن کی تصنیف کردہ متعدد کتابوں کی ورق گردانی کر چکا تھا اور انگریزی میں اُن کی قادر الکلامی کا شدید مداح تھا.. میں نے اُن کی ''اے شارٹ ہسٹری آف دی ورلڈ'' بھی حال ہی میں پڑھی تھی جو جیل کی کوٹھڑی میں سے اُن کی لاڈلی بیٹی اندرا گاندھی کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل تھی.. اور انہوں نے یہ خطوط حوالوں کے بغیر.. صرف اپنی یادداشت کی زور پر لکھے اور بلا کسی تعصب کے لکھے.. اس کتاب کا اوریجنل مسودہ بھی شوکیس میں سجا تھا اور میں شوکیس کے شیشے سے ناک لگائے نہرو کے اپنے ہاتھوں سے لکھے اُن حروف کو پڑھ رہا تھا اور اُنہیں پہچان رہا تھا جو میں نے کاغذ پر چھپے دیکھے اور پڑھے تھے..

نہرو کی ذاتی لائبریری میں دنیا جہان کے موضوعات پر ضخیم کتابیں تھیں اور اُن میں حیرت انگیز طور پر مسلمانوں اور مغلیہ عہد کی تواریخ غائب تھیں۔ رہائش گاہ کی دیواریں.. بیڈ روم.. لائبریری یا ڈرائنگ روم کی دیواروں پر صرف دو اقسام کی تصویریں آویزاں تھیں.. نہرو کے ہمراہ مہاتما گاندھی..

اور نہرو کے ہمراہ.. خان عبدالغفار خان..

ان دونوں کے سوا پنڈت جی نے کسی اور شخصیت کو اس قابل نہ سمجھا کہ اُس کی تصویر اپنے گھر کی دیواروں پر سجاتے..

ہم اعتراف کر سکتے ہیں کہ سرخ پوش سرحدی گاندھی نے پاکستان کے قیام کی ڈٹ کر مخالفت کی اور کہا کہ آپ ہمیں بھیڑیوں کے حوالے کر کے جا رہے ہیں لیکن پاکستان

کے قیام کی مخالفت تو بیشتر مذہبی جماعتوں نے بھی کی.. اور دل کھول کر کی.. اور آج وہی جماعتیں اس ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر رہی ہیں..

کم از کم خان عبدالغفار خان.. باچا خان اپنے عقیدے پر قائم رہے.. خان قیوم کی مانند آخری لمحات میں کانگرس ترک کر کے اقتدار کی گاڑی میں سوار نہیں ہوئے.. ہم نے ہمیشہ ایسے لوگوں کی قدر کی جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے تھے اُنہیں اپنا ہیرو قرار دیا.. اور یہ کیسے نالائق اور موقع پرست ہیرو تھے..

تاریخ کے ایک بے سُرے طالب علم ہونے کے ناطے سے میں سمجھتا ہوں کہ خان عبدالغفار خان ایک ایسی عظیم شخصیت ہیں کہ اُنہیں سمجھا ہی نہیں گیا.. نہ انہیں پرکھا گیا.. وہ ایک بڑے اور گُنی شخص تھے جو محض ہماری عصبیت اور تنگ نظری کا شکار ہو گئے.. ہم نے راتوں رات کانگرس میں اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگانے والوں کو تو سینے سے لگا لیا کہ وہ ایسے لوگ تھے جو موقع کی تاک میں تھے اُنہیں احساس ہو گیا تھا کہ بن کے رہے گا پاکستان.. تو عافیت اسی میں ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے.. جیسے فتح مکہ کے بعد میرے نبیؐ کے شدید ترین مخالفوں نے بھی اسلام قبول کر لیا کہ عافیت اسی میں تھی..

ہم نے اپنے نظریے پر قائم رہنے والوں کو دھتکار دیا اور موقع پرستوں کو قبول کر لیا..

مہاتما گاندھی اور خان عبدالغفار خان کی تصویروں اور پینٹنگز کے علاوہ نہرو کے گھر کی دیواروں پر صرف مغل منی ایچر تصویروں کے شاہکار سجے تھے۔ کہیں بھی ان میں کسی ہندو دیوتا یا دیو مالا کی کوئی تصویر نظر نہ آئی...

باہر لان میں ایک بنچ تھا جس پر بیٹھ کر پنڈت جی صبح کا اخبار پڑھا کرتے تھے۔ وہ شخص یقیناً ایک نفیس اور خون میں رچے ہوئے ذوق جمال کا مالک تھا.. لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایسے خوش شکل شخص کی بیوی ایڈوینا یونہی تو اس شرمیلے ہندوستانی کے عشق میں فنا نہیں ہو گئی تھی..

بنچ کے قریب لان کی ہریاول کے بیچ ایک پتھر پر نہرو کی مکمل وصیت درج ہے جس میں وہ ہدایت کرتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری راکھ گنگا میں نہ بہائی جائے بلکہ

ہندوستان کے چپے چپے میں بکھیر دی جائے اور ایسا ہی کیا گیا..

نہرو میوزیم میں بے شک ایک ایسا شخص داخل ہو جس کی الگ پہچان اور شناخت کی اُس نے شدید مخالفت کی تھی لیکن اس کے باوجود جب وہ کچھ عرصہ اُس میں گزار کر باہر آتا ہے تو وہ بھی نہرو کی شخصیت سے متاثر ہو چکا ہوتا ہے..

کیا ہم آج تک قائداعظم کے حوالے سے کوئی ایسا متاثر کرنے والا میوزیم بنا سکے ہیں کہ جناح بیشتر حوالوں سے نہرو کے کندھوں سے بہت بلند ہو جاتا تھا.. ہم دن رات قائد کے فرمودات کی جگالی اخبارات اور ٹیلی ویژن پر تو کرتے رہتے ہیں' اُن کی سالگرہ اور برسی مناتے ہیں اور کروڑوں روپے ضائع کر دیتے ہیں.. ہر حکمران.. اور جو ناجائز حکمران ہو وہ سب سے زیادہ قائد کے نام کی ڈفلی بجاتا ہے اور اسے اپنی غیر قانونی حکومت کی بیساکھی بناتا ہے.. تاریخ میں کبھی بھی ایسی بے انصافی نہیں ہوتی کہ کسی ایسے شخص کو جو قانون کی حکمرانی کا سب سے بڑا پرچارک ہو.. غیر قانونی حکومتوں کا سہارا بنایا گیا ہو.. ہم سے تو علامہ اقبال کے گھر کی اینٹیں بھی نہیں سنبھالی جاتیں.. ہم اربوں روپوں کی لاگت سے ایک عظیم الشان ایوانِ اقبال تو تعمیر کر سکتے ہیں لیکن اُن کے گھر کی ایک اینٹ نہیں سنبھال سکتے کہ اس میں لگتی ہے محنت زیادہ.. اور محبت زیادہ! آج چالیس برس بعد بھی مجھے نہرو کی رہائش گاہ میوزیم میں گزاری ہوئی وہ دوپہر یاد ہے..

اور میں بہت آزردہ ہوا.. تب.. چالیس برس پیشتر ہوا اور اب بھی ہوں کہ ہمارے پاس تولے دے کے.. کہ باقی سب کھوٹے سکے تھے.. ایک ہی بابا جناح تھا اور ایک ہی اقبال تھا اور ہم اُن کو بھی نہرو کی مانند سنبھال نہیں سکے.. ہم ایسے نالائق ہیں.. اور صدیوں سے ہیں..

وہ علاقہ شروع ہو گیا جہاں غیر ملکی سفارت خانوں کی عمارتیں تھیں.. یعنی ڈپلومیٹک انکلیو.. کشادہ نظر شاہراہیں اور ایسی عمارتیں جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ سفارت خانہ کسی ایسے افریقی ملک کا ہے جس کے لاکھوں افراد باقاعدگی سے بھوک کا شکار

ہو کر مر جاتے ہیں.. امریکی سفارت خانہ واقعی دید کے قابل تھا.. ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ایڈورڈ سٹون نے اُس کی نازک عمارت کو زمین سے ذرا اوپر معلق کر رکھا ہے.. لیکن جب پاکستانی سفارت خانے کی سبز گنبدوں والی عمارت نظر آئی اور گائیڈ سنگھ اُس کی توصیف میں رطب اللسان ہوا تو میرا سر فخر سے قدرے اونچا ہوا کہ مجھے دیکھو یہ میرا سفارت خانہ ہے..

''گائیڈ سنگھ جی تم اُڑے جا رہے ہو.. ادھر ایک لمحے کے لیے رُک جاؤ.. یہ دلّی میں میرا اپنا گھر ہے.. تو ذرا جھانک لوں.. کسی سے سلام دعا کر لوں۔''

''نہ جی..'' گائیڈ سنگھ کی رفتار میں ذرہ برابر فرق نہ آیا ''یہاں تو رُکنا ہی نہیں ہے مہاراج.. دلّی بھر میں اتنی سی آئی ڈی نہیں ہوتی جتنی ادھر پاکستانیوں کے آس پاس ہوتی ہے.. رُک گیا تو سردار گائیڈ سنگھ بس اندر.. اور آپ بھی اندر..''

آخری منزل قطب مینار تھی..

میں قطب الدین ایبک کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ وہ گھر کی مرغی تھا.. اپنے لاہور کے باہر چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گرا تھا اور جاں بحق ہو گیا تھا.. بے شمار مکانوں کی گرفت میں آئی ہوئی اس کی قبر تھی.. جس پر اوپر کے مکانوں کے گندے پانی گرتے تھے.. تو میں نے اُس ایبک کو جو اتنی بے چارگی اور گمنامی میں ایک تنگ گلی کے اندر کہیں دفن تھا.. زیادہ اہمیت نہ دی کہ اگر یہ مینار بنوائے گا تو کیا بنوائے گا..

قطب مینار کو سامنے پا کر.. بلکہ یکدم اُس کے دامن میں پہنچ کر.. اپنا چہرہ اُٹھا کر اُسے فلک کے پار جاتے ہوئے دیکھ کر مجھے قیام دلّی کا سب سے بڑا دھچکا لگا..

وہ محض مینار نہ تھا.. ایک آسمانی جمال کا تخت تھا.. جس کی بنیادیں زمین میں تھیں اور وہ آسمانوں کے پار جاتا تھا..

جانے ایبک کی سلطنت میں وہ ماہرِ تعمیر.. آرکیٹیکٹ کہاں سے آئے تھے جنہوں نے اپنی آبائی سرزمینوں.. سمرقند.. بخارا.. غزنی یا ہرات کو بھلا دیا وہاں جتنی بھی عمارتیں تاریخ کی تھیں انہیں فراموش کر دیا اور ایک نئی جہت کو اختیار کر کے آسمانوں میں قیام پذیر روح

کے قریب جا پہنچے..اور ایسے پہنچے کہ وہ قرآنی آیات کو پتھر میں پھونکتے اُس تک جا پہنچے..
میں نے تب تک تاج محل نہیں دیکھا تھا..

لیکن جب دیکھا تو پھر بھی طرزِ تعمیر کے انوکھے پن میں قطب مینار' تاج سے کمتر درجے پر نہ تھا..

سو اُن دنوں کے دلّی کے جو کُوچے اوراق مصور تھے تو اُن اوراق پر صرف دو نقش اب تک قائم اور دائم ہیں..ایک نہرو میوزیم اور دوسرا قطب مینار..

میری جو آخری رات دلّی میں بسر ہوئی تو اُس میں "نیو جواہر ہوٹل" کے نستعلیق چوہے میری رفاقت میں رہے۔شب بھر رہے..مجھ سے اُلفت کا اظہار کرتے رہے' میری رضائی پر چہل قدمی فرما کر.. یا کبھی میرے پاؤں کے انگوٹھوں کو دانتوں سے کُترتے ہوئے..اور پھر جونہی لکڑی کے تختوں میں سے دن کی پہلی روشنائی در آئی تو وہ سب معذرت کرتے' آداب بجالاتے واپس چلے گئے...

اور میں اگلے روز پی آئی اے کی پرواز سے لاہور چلا گیا..

اور شکر کیا کہ میں لاہور میں پیدا ہوا تھا..

جیسے دلّی وال شکر کرتے ہیں کہ وہ دلّی میں پیدا ہوئے تھے..

ہر ایک کی..اپنی اپنی مجبوری ہے..

اور ہم اُس مجبوری سے بندھے ہوئے ہیں..

یہ چالیس برس پیشتر کا قصہ ہے جو میں نے بیان کیا ہے..

تو اب چالیس برس کے بعد کی جو دلّی کہانی ہے اُسے بیان کردوں..

"لودھی گارڈن کے مقابر...میرے قہقہوں سے پریشان ہوتے ہیں"

میں بے تحاشا قہقہے لگا رہا تھا..

ہنس ہنس کر دوہرا ہوا جاتا تھا..

ایک مکمل طور پر فاتر العقل بوڑھے کی مانند جو کہ میں کسی حد تک تھا یعنی فاتر العقل بھی اور بوڑھا بھی..قہقہے لگاتا لگاتا نڈھال ہو رہا تھا..

منہ کھلا ہوا' چہرہ سُرخ سُرخاب' ماتھے کی رگیں پھٹنے کو آتی ہوئیں اور بدن کی ہر شریان میں خون اُبلتا ہوا.....اور میں قہقہے لگا رہا تھا..

پانچ سو برس سے زیادہ قدامت کے... پُرجلال' شاندار' دل پر اثر کرتے صبح کی ہلکی دُھند میں سے جھانکتے نمودار ہوتے لودھی عہد کے مقابر..جن کے پتھریلے گنبدوں کی گولائیاں وینس ڈی میلو کی چھاتیوں ایسی پُرتناسب..دُھند میں کبھی یہ گولائیاں مکمل طور پر ظاہر ہو جاتیں اور کبھی روپوش ہو جاتیں..اتنے سو برس گزر جانے کے باوجود زمانے بیت جانے کے باوجود یہ پُرہیبت بھی اور پُرجلال بھی یہ مقابر..اہرام مصر کی مانند زمین کے سینے پر براجمان تھے اور جو کچھ ان برسوں اور زمانوں میں اُن پر گزرا تھا..سلطنتیں' بادشاہتیں' غلامیاں' نفرتیں' زلزلے اور ہزاروں موسم..یہ سب ان پر اثر انداز ہونے میں ہار گئے تھے..

وہ جوں کے توں قائم تھے اور لگتا تھا کہ اُن کا ارادہ ہمیشہ قائم رہنے کا ہے جب تک کہ صور نہیں

پھونکا جاتا..دلّی آخری بار تباہ نہیں ہو جاتی..

لودھیوں کے یہ مقبرے سیرے بے مُہار قہقہوں سے البتہ کچھ متاثر ہو گئے تھے اور قدرے پریشان لگتے تھے کہ یہ کون ہے' کہاں سے آیا ہے..کس کے ساتھ آیا ہے..سکندر لودھی' ایبک..التمش' بابر یا نادر شاہ کے ساتھ..نہ اس کے سینے پر زرہ بکتر سجی ہے نہ اس کا چہرہ خود میں ڈھکا ہے اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں تلوار ہے..شاید یہ اُن غیر ملکیوں میں سے ہے جو ادھر آتے رہتے ہیں اور اُن میں سے بیشتر اس جادو طراز سرزمین کے اسیر ہو کر تلوار ترک کر دیتے ہیں اور یہیں کے باسی ہو جاتے ہیں..اس دھرتی کے جتنے طلسم ہیں اُن میں رنگے جاتے ہیں اور اپنا آبائی رنگ بھول جاتے ہیں اور یہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں..سو پشت سے پیشۂ سپاہ گری کو فراموش کر کے شاعر ہو جاتے ہیں..کبھی غالب کبھی خسرو ہو جاتے ہیں اور کبھی نظام الدین اولیاء ہو جاتے ہیں..یہ اگر اپنے وطن میں رہتے تو گمنام رہتے..یہ اسی سرزمین کا اعجاز تھا جس نے اُنہیں نامور کیا..

غالب تو نہیں ہو سکتا..اُسے تو پہلے حال دل پہ ہنسی آتی تھی یوں قہقہے تو نہیں لگایا کرتا تھا..نہ خسرو ہے کہ اُس کی گوری تو سوئے سیج پر مکھ پہ ڈارے کیس..تو وہ گوری کے سرہانے کیسے ہنسے گا..اور جو گوری نظام الدین اولیاء کی صورت میں سوتی ہے تو وہ تو نہیں جاگے گی..

تو یہ کون ہے؟

کہاں سے آیا ہے؟

شاید یہ کہیں سے نہیں آیا۔

ہمیشہ سے یہیں تھا..

اس دھرتی کی مٹی کا بنا ہوا ہے..اس میں اجنبی سرزمینوں کی کچھ ملاوٹ نہیں..پرتھوی راج چوہان کے قبیلے کا لگتا ہے..اس کا ناک نقشہ بھی موہنجوداڑو کے پروہت ایسا دکھتا ہے تو یہیں کہیں کا ہو گا..

اگر یہ ہمیشہ سے یہاں کا ہے تو کیا ہمیشہ سے یونہی قہقہے لگاتا رہا ہے..

اگر ایسا ہے تو ہم آج اسے پہلی بار کیوں دیکھ رہے ہیں..

لودھی گارڈن..دلّی میں..اس کے وسیع سبزہ زاروں اور قدیم پیڑوں کے جھنڈ میں نمودار ہوتی..سر بلند مقابر کی عمارتیں ایک عجوبہ تھیں..

یہ ابھی ہندوستان میں نو وارد تھیں..

مقامی طرز تعمیر میں الگ سے نظر آتی تھیں..

وہ ابھی ابھی سنٹرل ایشیا سے سفر کرتی یہاں تک آئی تھیں اور اُن میں اپنے آبائی وطن کا جلال' ہیبت اور اجنبیت موجود تھی..ابھی اُن پر ہندوستان کی نزاکت اور نرماہٹ کا اثر نہیں ہوا تھا جو اُنہیں ایک تاج محل کا روپ عطا کر دیتی..

اگر میں قہقہے لگا رہا تھا تو اُس کا کچھ تو سبب تھا..

فاتر العقلی اور بڑھاپے کے سوا بھی تو کچھ سبب تھا..

زندگی کیا ہے' ابر کیا چیز ہے' ہوا کیا ہے..اگر تجھ بن کوئی نہیں موجود..؟ کیا تو موجود بھی ہے یا نہیں..اگر ہے تو ایسا گورکھ دھندہ کیوں ہے جس کی گتھیاں کھول کھول کر بندہ کافر ہو جاتا ہے اور اگر تو نہیں تو..یہ کیا کھیل تماشا ہے۔اس تماشے کا جو میری زندگی ہے' وجود ہے..ابھی وجود اور ابھی نابود..اگر تو نہیں موجود..بس یہی وہ گورکھ دھندا تھا جو مجھے قہقہے لگانے پر مجبور کر رہا تھا..

دراصل میں اپنے آپ پر ہی ہنس رہا تھا..

یہ دلّی میں میرا آخری دن تھا اور میں ہر سویر کی مانند انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کی قیام گاہ سے اُٹھ کر لودھی گارڈن میں چلا آیا تھا کہ بس یہی ایک مقام تھا جس سے بچھڑ جانے کا مجھے قلق ہو رہا تھا..اور یہاں پہلی بار میری ملاقات ''قہقہہ کلب'' کے ممبران سے ہو گئی تھی جو ایک لودھی مقبرے کی محراب میں کھڑے اپنی ہی دُھن میں مست بے دریغ قہقہے لگا رہے تھے..میں نے اس ''قہقہہ کلب'' کے بارے میں بی بی سی ٹیلی ویژن پر ایک نہایت دلچسپ رپورٹ دیکھی تھی کہ دلّی میں یہ حضرات اس عقیدے پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ قہقہے لگانا ہر

مرض کی دوا ہے.. بے شک اپنے آپ پر جبر کر کے اپنے آپ کو مجبور کر کے قہقہے لگاؤ کہ یوں زندگی کی تلخیاں بھولنے لگتی ہیں.. زندگی نے تمہارے ساتھ جو بڑا مذاق کیا ہے تم بھی زندگی پر ہنسو.. ایک قہقہہ لگانے سے تمہارے بدن کا نوے فیصد حصہ متحرک ہو جاتا ہے اور اس سے بہتر اور کوئی ورزش نہیں..

میں اپنی کرید کی جبلت سے مجبور اُن کے پاس جا کھڑا ہوا.. جب قہقہہ کلب کے ان ممبران کا طویل قہقہہ اختتام کو پہنچا اور وہ دم سنبھالنے کے لیے رُکے.. نیم خنک موسم کے باوجود پسینے سے شرابور' چہرے لال گلال ہانپتے ہوئے تو میں نے دخل در معقولات کیا' اپنا تعارف کروایا کہ پاکستان سے آیا ہوں' ایک لکھاری ہوں تو کیا میں چند لمحوں کے لیے اُن کی کلب کا عارضی ممبر بن کر اُن کے ہمراہ چند قہقہے لگا سکتا ہوں.. اُنہوں نے بخوشی مجھے قبول کر لیا اور قہقہے لگانے کی اجازت دے دی..

اُن کا طریقہ کار یہ تھا کہ ایک قہقہہ گرو سب سے پہلے منہ کھول کر پوری قوت سے قہقہہ لگانے لگتے تھے اور پھر بقیہ ممبران اُن کی پیروی کرتے تھے..

عام زندگی میں میں' کوئی قہقہہ بار شخصیت نہیں ہوں.. مسکراتا البتہ مسلسل ہوں کہ ٹیلیویژن کیمروں کا زندگی بھر سامنا کرنے کے بعد مجھے تجارتی طور پر مسکرانے کی عادت ہو چکی ہے.. کیمرے کی سُرخ لائٹ آن ہوتے ہی میں مسکرانے لگتا ہوں چاہے جی کسی کے سوگ میں جدائی میں پھٹا جا رہا ہو.. بے دریغ قہقہے ایک برس میں دو چار ہی ہوتے ہوں گے.. تو مجھے آغاز میں بے حد دشواری ہوئی.. کیسے ہنسوں.. کس پر ہنسوں.. یوں بھی بے وجہ قہقہے لگانے سے انسان کسی حد تک بلکہ بہت حد تک شدید احمق محسوس کرتا ہے.. تب میں نے اپنے رہنماؤں اور علماء کرام کے.. دانشوروں' تاریخ دانوں اور اپنے کچھ بزرگوں کے اُن بیانات کو یاد کیا' حکمت کے جو موتی وہ بکھیرتے تھے' اتنے بکھیرتے تھے کہ ہم اُن پر قدم رکھتے ہوئے پھسل جاتے تھے' منہ کے بل گرتے تھے اور تب میرا قہقہے لگانے کو جی چاہتا تھا لیکن لگا نہ سکا کہ مجھے اپنی جان بہت پیاری تھی.. پھر اپنے بے وجہ تکبر' تصنع اور شہرت کی ہوس کو یاد کیا' زندگی کو یاد کیا تو قہقہوں کے در وا ہو گئے.. اور میں ہنستا ہنستا پاگل ہونے کو آیا.. میرا

بدن درد کر رہا تھا' باچھیں اکڑ رہی تھیں اور گلا سوکھ رہا تھا اور چہرہ بیر بہوٹی ہو رہا تھا لیکن میں قہقہے لگاتا رہا.. اپنی گزشتہ زندگی پر.. اور جتنے بھی آئندہ دن کاتب تقدیر نے لکھے ہیں اُن پر.. چنداں دشواری نہ ہوئی..

میرے قہقہے لودھی مقبرے کے عظیم گنبد کی گولائی میں گھومتے پھیلتے گونجتے میرے پاس ہی واپس آتے اور میں اُنہیں سُن سکتا تھا.. چند لمحے پیشتر جو قہقہہ میرے حلق سے برآمد ہوا تھا وہ گنبد میں گونج کر میرے کانوں کے پردوں پر دستک دینے لگتا تھا..

یُوں یہ قہقہوں کی ایک دو رُخی سمفنی تھی..

ایک گونج اُس قہقہے کی جو ابھی دو چار لمحے پیشتر میرے حلق سے برآمد ہوا تھا اور گھوم پھر کر میرے کانوں میں آ گونجتا تھا اور دوسرا وہ جو میں منہ کھولے ساعتِ موجود میں بلند کر رہا تھا..

ایک مقبرے کی محراب تلے.. دُھند آلود سویر میں.. لودھی گارڈن میں..

یہ دِلّی میں میرا آخری دن تھا..

مجھے جب نہایت غیر متوقع طور پر ایک روزِ ابر دِلّی میں منعقد ہونے والی سارک ممالک کے ادیبوں کی گیارہویں کانفرنس میں شمولیت کا دعوت نامہ موصول ہوا تو میں تذبذب میں چلا گیا.. شاعر لوگوں سے میں اسی لیے حسد کرتا ہوں کہ وہ جیسے کیسے بھی ہوں.. زندگی میں صرف ایک مناسب شعر کہہ دیا ہو تو وہ مسلسل آتے جاتے رہتے ہیں.. اُنہیں بین الاقوامی دعوت ناموں کی کچھ کمی نہیں ہوتی.. غیر ممالک میں مقیم پاکستانی ''شعراء'' کے واہیات شعروں پر داد کے ڈونگرے برساتے ہیں.. اپنے کالموں میں اُن کا تذکرہ کرتے ہیں اور ہر برس اُن کی جانب سے ڈونگروں کے جواب میں امریکہ اور انگلستان کے ٹکٹ برسائے جاتے ہیں۔ شاعر ظاہر ہے عوام الناس کا دل بھی لبھاتے ہیں' اُنہیں محظوظ کرتے ہیں یعنی انٹرٹین کرتے ہیں.. جبکہ نثر نگار چاہے جو بھی کمال دکھا دے.. بین الاقوامی سطح کے ناول تحریر کر دے' کہانیوں سے جادو کر دے.. اس کا مول نہیں پڑتا کہ وہ ''محظوظ'' نہیں کر

سکتا..اُس کا آپ کیا کریں گے..اُس کی شکل تو نہیں دیکھیں گے..اس لیے اُسے کوئی دعوت نامہ مل جائے تو وہ تذبذب میں چلا جاتا ہے..

اگر میرے اس بیان میں سے شاعروں کے لیے بغض اور حسد کی بُو آتی ہے تو میں اقرار کرتا ہوں کہ ایک نثر نگار کے طور پر میرے احساس کمتری کے باعث آتی ہے..

اس غیر متوقع دعوت نامے کی وصولی پر ایک اور تذبذب تھا..

یہ کانفرنس دلّی میں منعقد ہو رہی تھی..

چالیس برس پیشتر جب میں دلّی گیا تھا تو وہ شہر کچھ پسندیدہ نہ ہوا تھا..نیو جواہر ہوٹل کے چوہے اب بھی میرے پاؤں کو کُترتے تھے۔چنانچہ میں کوئی خواہش شدید نہ رکھتا تھا اُس شہر میں دوبارہ جانے کے لیے..

میں نے بجھے دل سے اس دعوت نامے کو قبول کیا..

’’انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں دو حُسین..اور لچکیلی یوگن‘‘

اپنی پی آئی اے کا جہاز جب اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے کے لیے ناک نیچی کر کے جھکتا چلا جاتا تھا تو اُس کے نیچے ایک وسیع ہریاول بھرا جنگل دکھائی دینے لگا جو قریب آنے لگا..شہر نظر نہ آیا..یہ پہلی حیرت تھی کہ دلّی اتنا سرسبز اور درختوں سے ڈھکا ہوا شہر ہے..

ایئرپورٹ خاصا خستہ حال تھا..دل شکستہ تھا..ہر شے سست روی سے حرکت کرتی تھی..امیگریشن، پاسپورٹ اور کسٹم کے لوگ نہایت دھیرج سے شانتی سے سب کام سلوموشن میں کرتے تھے، بجھے بجھے سے لگتے تھے لیکن کام دل جمعی سے کرتے تھے اور اُن کے چہروں پر پاکستان سے آنے والوں کے لیے ہمدردی اور مسکراہٹیں تھیں کہ اُن دنوں بہت ہلچل تھی..غوغا تھا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستانہ تعلقات کے آغاز کا..اب جانے کون سے دن اس ہمدردی نے نفرت میں بدل جانا تھا اور مسکراہٹوں نے سمٹ جانا تھا۔صرف اُن کی جانب سے ہی نہیں ہماری جانب سے بھی کہ..جذباتی قوموں کے وقتی ابال اسی نوعیت کے ہوتے ہیں..ایک چھدری داڑھی والے ہراساں سے سردار جی عینک سنبھالتے پگڑی سنبھالتے سارک کانفرنس میں شریک ہونے والے ادیبوں کو مسلسل اسی ایئرپورٹ پر وصول کرتے کرتے عاجز آ چکے تھے اور اس کے باوجود ایک دو مسکراہٹیں اُنہوں نے بھی کسی نہ کسی طرح مونچھوں میں پوشیدہ ہونٹوں پر بکھیر لیں..

اُنہوں نے پہلے تو ہمیں ایک قطار میں کھڑا کر کے اپنے رجسٹر میں ہماری

حاضری لگائی کہ یہ تارڑ کون ہے اور یہ انوار احمد کون ہے اور پھر ہمیں ایک کوچ میں سوار کر کے لے گئے..

کہاں لے گئے؟

انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں..

یہ سنٹر ہمیں بتایا گیا کہ بنیادی طور پر دانشوروں' مصوروں اور موسیقاروں کے لیے.. جواہر لال نہرو کی خواہش پر تعمیر کیا گیا اور پھر رفتہ رفتہ ایسے تخلیق کاروں کا عمل دخل تو کم ہو گیا اور یہ دلّی کی ایک نہایت خصوصی کلب میں تبدیل ہو گیا جس کی ممبر شپ کے حصول کے لیے بیس برس کا انتظار بتایا جاتا ہے.. آپ اگر نہایت بے دریغ' دولت مند ہیں اور آپ اس کلب کی ممبر شپ حاصل کرنے کے لیے کچھ دولت بہا دینے پر رضامند ہیں تو بھی یہ پیشکش قبول نہیں کی جاتی.. آپ کو انتظار کرنا پڑتا ہے.. یہ ایسا خصوصی کلب ہے جہاں پرندہ پَر نہیں مار سکتا اور درندہ دَر نہیں مار سکتا.. اگرچہ اس کے چاروں اور ایسے کُنج ہیں اور گلستان ہیں جن میں رنگا رنگ پرندے مسلسل پَر مارتے ہیں اور انسان جو ایک نوعیت کے حیوان ہوتے ہیں اور اکثر اوقات درندے ہوتے ہیں وہ دَر مارتے رہتے ہیں.. اس کے مختلف ہالوں اور تھیٹروں میں ادب' رقص و موسیقی اور ذوق جمالیات کے مقامی اور بین الاقوامی پروگرام مسلسل ہوتے رہتے ہیں۔ ان پروگراموں کے اشتہار دیکھ کر ایک انسان.. بلکہ ایک پاکستانی انسان مخمصے میں پڑ جاتا ہے کہ آج کی شب کیا دیکھے اور کیا نہ دیکھے.. کیونکہ پاکستان میں اُسے کچھ بھی دیکھنے کو نہیں ملتا.. اور کیوں ملے کہ یہ سب عریانی اور فحاشی کے زمرے میں آتا ہے.. وہاں شمشیر و سناں اول کا درس دیا جاتا ہے.. طاؤس و رباب کو آخر قرار دیا جاتا ہے.. میں اپنی پوری نسل کے ساتھ حضرت علامہ کے پیروکاروں میں سے ہوں لیکن اُنہوں نے 'خفتہ مسلمانوں کو جگانے کے لیے کچھ ایسے اشعار بھی کہہ دیئے جو علامتی تھے لیکن ہم نے اُنہیں جوں کا توں پلّے باندھ لیا.. یقیناً اقبال آگہی کے ایک بلند مرتبے پر فائز تھے اور وہ بھی تاریخ کی ہم سے کہیں اعلیٰ سطح پر تفہیم کرتے ہوں گے اور جانتے ہوں گے کہ شمشیر و سناں اور طاؤس و رباب میں کسی ایک کو اولیت نہیں رہی ہے.. یہ دونوں ساتھ ساتھ چلے ہیں.. جب

محض شمشیر و سناں آئے تو نہ دل نرم ہوئے اور نہ خصلتیں.. اور جب محض طاؤس و رباب آئے تو محض زوال آیا.. جب بے مثل مغنی ابن اسحاق کا ایک نابغۂ روزگار شاگرد زریاب اپنے استاد کی غنائیت کی سرحدوں کے پار چلا جاتا ہے اور اپنی جان کے ڈر سے کہ.. آج کی طرح اُن دنوں بھی استاد برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اُن کا کوئی شاگرد اُن سے بڑھ جائے اور وہ بغداد سے فرار ہو کر اُندلس کا رُخ کرتا ہے اور جب قرطبہ پہنچتا ہے تو سلطان شہر سے باہر آ کر اُس کا استقبال کرتا ہے اور اپنے محل کی کنجیاں اُسے عطا کرتا ہے کہ تم یہاں بسیرا کرو اور اپنے گیتوں کی دُھنیں تیار کرو..

یہ اُندلس کا.. مسلمان تاریخ کا سب سے روشن عہد تھا..

اور اس لیے تھا کہ شمشیر و سناں کے ساتھ طاؤس و رباب کی بھی قدر تھی..

اس زریاب نے دھنیں ترتیب دینے کے علاوہ.. یورپ میں پہلی بار لکڑی کی ننگی میزوں پر چمڑے کے میز پوش بچھائے.. چھری کانٹوں کو رواج دیا ورنہ اس سے پیشتر اہل یورپ گوشت ہاتھوں میں پکڑ کر نوچ نوچ کر کھاتے تھے اور ہر نئے موسم کے آغاز میں یہی زریاب قرطبہ میں اپنے ڈیزائن کردہ ملبوسات کا ایک شو منعقد کرتا تھا اور مختلف ماڈل.. مرد بھی اور عورتیں بھی اُس کے تازہ ترین لباسوں میں ایک قسم کی ''کیٹ واک'' کیا کرتے تھے۔

سات آٹھ سو برس پہلے کی بات ہے.. اب اسے دوہرانے سے فائدہ!

بہرحال اس انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک نہایت زبردست اور دنیا بھر کے علوم سے بھری ہوئی ایک لائبریری ہے.. ایک پُر فضا مناظر والا ڈائننگ روم ہے جس کی کھڑکیوں میں سے جھانکئے تو نیچے ایک تالاب میں کنول کے سفید اور جامنی پھول پانیوں پر براجمان اپنی چھب دکھلاتے ہیں اور اُن پر کوئی ست رنگا پرندہ منڈلاتا نظر آتا ہے.. ایک ''کیفے ٹیریا'' بھی ہے جس میں ممبران کے سوا اور کوئی داخل نہیں ہو سکتا.. یہاں تک کہ مجھ ایسا عارضی رہائشی بھی اُس میں جھانک نہیں سکتا۔

وہاں بیشتر بوڑھے اونگھتے ہیں اور گئے دنوں کو یاد کرتے ہیں..

کوئی برطانوی عہد کو یاد کرتا ہے.. اور کوئی نوجوانی کے فوٹو البموں میں بُھوری ہو چکی تصویروں کو. کوئی بھی موجودہ ہندوستان کو یاد نہیں کرتا..

ان میں ایک "لاہوری گروپ" ہے.. جس کے سربراہ ٹول ہیں اور یہ بابا لوگ اس کیفے ٹیریا میں روزانہ بیٹھتے ہیں اور صرف اور صرف لاہور کو یاد کرتے ہیں.. لاہور کے سوا کسی اور شہر کا تذکرہ ممنوع ہے..

ایک نہایت پُر بہار اور پُر خمار کیفیتوں کا مے کدہ بھی ہے جس کا شُہرہ کُل دلّی میں ہے اور جسے بھی عدم کے بقول سفرِ حیات کا بے حد طویل لگتا ہے وہ اس مے کدے کی راہ سے ہو کر نکل جاتا ہے.. کچھ نہیں بھی نکل پاتے اور اُنہیں ویٹر نکالتے ہیں۔ عام حالات میں یہ ویٹر اتنے مؤدب ہوتے ہیں کہ پیدائشی طور پر کبڑے معلوم پڑتے ہیں.. مجھے تو مے سے کچھ غرض نہیں لیکن اس مے خانے میں دم پخت مچھلی کھانے کی غرض سے البتہ اکثر چلا جایا کرتا تھا..

تو یہ تھا انڈیا انٹرنیشنل سنٹر جہاں ہم ایسے فقیر قیام کرتے تھے..

ہم دونوں ہمسائے تھے..
اور ہم دونوں حُسین بھی تھے..
یعنی میں اور انتظار صاحب.. اگرچہ سوچ اور تحریر میں ہم الگ الگ حُسین تھے.. وہ کوثر و تسنیم میں دُھلے دھلائے حُسین تھے، ہند مسلم تہذیب گنگا جمنی کے نمائندے اور بے مثل کہانی کار تھے.. جب کہ میں حُسین راوی اور چناب کے پانیوں میں کچے گھڑے پر تیر جانے والا حُسین تھا..

چنانچہ ہم دونوں ہمسائے تھے..
وہ کمرہ نمبر دو میں فروکش تھے اور میں تین میں بسیرا کرتا تھا..
وہ بیک وقت دلّی اور لاہور میں سانس لیتے تھے اور میں صرف لاہور میں.. اس لیے اس شہر میں مجھے اُن کی رہنمائی درکار تھی۔

"انتظار صاحب.. شہر آپ کا ہے لِلّٰہ کچھ مدد فرمایئے.. سخت مشکل میں ہوں.. دراصل میں نشئی ہوں ایک مدت سے ایک لَت میں مبتلا ہوں یعنی صبح سویرے نور کے تڑکے چاہے بہاراں ہو نہ ہو دل کہتا ہے کہ چلتے ہو تو چمن کو چلیے.. یعنی کچھ جوگنگ وغیرہ کیجیے تو یہ فرمایئے کہ یہاں آس پاس یا کسی مختصر فاصلے پر کوئی ایسا مقام ہے.. کوئی ہریاول کوئی پارک وغیرہ ہے جہاں میں سیر کا نشہ پورا کر سکوں؟"

انتظار صاحب جو مسلسل مسکراتے ہیں اور اُن کی مسکراہٹ سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ موصوف آپ پر طنز کر رہے ہیں، توصیف فرما رہے ہیں یا آپ کے وجود سے بھی آگاہ نہیں اور عادتاً مسکرا رہے ہیں تو اُن کی مسکراہٹ منجمد ہو گئی اور وہ تقریباً سکتے میں آ گئے یا چلے گئے۔

"تارڑ صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بھئی یہ جو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر ہے جس میں ہم قیام پذیر ہیں تو یہ لودھی گارڈن کا ایک حصہ ہے.. اور اس گارڈن میں بہت سے لودھی دفن ہیں۔"

"سر میں فی الحال لودھیوں سے ملاقات کرنے کا اور وہ بھی فوت ہو چکے لودھیوں سے ملاقات کرنے کا متمنی نہیں ہوں۔" میں نے از راہِ تفنن کہا اور فوراً پچھتایا کہ آخر کس کو کہہ رہا ہوں..

"آپ اُن کے شاندار مقابر سے ملاقات کریں گے، اُن سے نہیں۔ لودھی گارڈن ہندوستان بھر میں اپنی تاریخی قدامت اور بے مثال ہریاول میں یکتائی رکھتے ہیں آپ کل صبح جانا چاہتے ہیں؟"

"جی بالکل۔"

"آپ کو جگا دوں؟"

"جی بالکل۔"

"میں کل صبح آپ کے فون کی گھنٹی بجا دوں گا.. آپ تیار رہیے گا، اکٹھے چلیں گے۔"

اب مجھے کیا پتہ تھا کہ انتظار صاحب قول اور فعل کے اتنے سچے ہیں کہ میں ابھی سویا ہوں اور ابھی جگا دیں گے اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھتا ہوں تو باہر گھپ اندھیرا ہے..

وہ میرے لیے تو پطرس کے وہ لالہ جی ثابت ہوئے تھے جنہیں پطرس نے صبح سویرے جاگ کر پڑھائی کرنے کی خاطر سرسری طور پر گزارش کی تھی کہ مجھے بھی جگا دیجیے گا اور جب لالہ جی نے اُن کا دروازہ دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا اور باہر دیکھتے ہیں تو ابھی رات ہے بلکہ کچھ ستارے بھی ٹمٹا رہے ہیں تو پطرس نے رضائی اوڑھتے ہوئے کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا کہ لالہ جی دستک مسلسل دیتے جاتے ہیں حالانکہ حضرت عیسیٰؑ بھی مُردے کو ایک بار قُم کہتے ہوں گے' مردہ زندہ ہو گیا تو خیر ورنہ لٹھ لے کر پیچھے تو نہیں پڑ جاتے ہوں گے.. کہ اُٹھ..

تو لالہ جی کی دستک کی مانند انتظار صاحب میرے فون کی گھنٹی بجاتے چلے جاتے تھے.. کچھ لحاظ نہ کرتے تھے کہ دلّی میں ایک اجنبی ابھی ابھی سویا ہے اور اُسے سونے دیا جائے.. اگرچہ باہر ابھی اندھیرا ہے..

جوگر اُڑس کر آنکھیں ملتا برآمدے میں آیا ہوں تو انتظار صاحب اپنے مخصوص کُرتے' پاجامے اور واسکٹ میں یوں تروتازہ اور کھِلتے ہوئے ہیں جیسے ابھی ابھی پھول والوں کی سیر کے میلے سے آئے ہوں.. ایسے بزرگانِ ادب روز روز کہاں نصیب ہوتے ہیں جو اس عمر میں بھی ایسی تروتازگی اور ہمت رکھتے ہوں' جب کہ ہم جیسے جونیئر ابھی سے پژمردہ اور ہمت ہارنے والے ہو چکے ہوں..

اور اس بزرگِ ادب نے کیا درست کہا تھا.. کہ ہم سنٹر کے ایک بغلی گیٹ کے اونگھتے ہوئے دربان سے نظریں بچا کر باہر قدم رکھتے ہیں تو لودھی گارڈن کے سرسبز دُھند میں ظاہر اور روپوش ہوتے سحر طراز حیرت کدے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

حیرت کدہ اس لیے بھی کہ دنیا بھر کے بہت سے باغوں سے میں آشنا ہوں.. بہت سے چمن اور گلستاں ہیں جواب بھی ہوں گے کہیں روم میں.. کہیں انگلستان میں یا کہیں

ایران میں جہاں اوائل عمری میں میں نے زمانے کی سیر کی.. لیکن دنیا بھر میں کوئی ایسا باغ تو نہ تھا جہاں پانچ چھ قدیم مقابر دُھند میں سے ظاہر ہوتے ہوں.. ایک مسجد ہو اور شکستہ دیواریں ہوں کسی قلعے کی.. اور اُن کے آس پاس اتنی ہریاول پھیلتی ہو اور اتنے نایاب پرند سنائی دیتے ہوں..

میں سیر کرنا تو بھول گیا اور لمبے لمبے سانس سویر کی کنواری اور آئینہ شفاف ہوا میں لینا یکسر بھول گیا اور مسکرانے لگا.. ایسے جیسے ایک محبوب شکل ہیجان کے بعد طمانیت سے ٹھنڈی ہونے لگتی ہے تو اُسے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہیں۔

یہ ایک عجائب گھر تھا..

ان عجائب کو تعمیر کرنے والے کب کے رخصت ہو چکے تھے..

جانے تب ان مقابر کے آس پاس کیا اور کیسے مناظر تھے..

ہم تو تاریخ کے کنویں کو گیڑنے والے وہ بیل تھے جن کی آنکھوں پر کھوپے چڑھے تھے.. وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ تاریخ اُنہیں ہانکتی چلی جاتی تھی اور وہ چلتے جاتے تھے.. نہیں جانتے تھے کہ کنویں کی گہرائی میں سے ماہل پر مونج کی رسی سے بندھے کچی مٹی کے جو کوزے اوپر آتے ہیں اُن میں پانی ہے کہ نہیں.. یا وہ خالی ہیں.. بیل نہیں جانتے کہ یہ تو تاریخ اور زمانے طے کر رہے ہیں کہ کوزوں میں پانی ہو گا یا نہیں..

لودھی مقابر اُن زمانوں کے تھے جب کوزے پانی سے بھرے ہوئے باہر آتے تھے اور میں.. تاریخ کی جبریت کا شکار وہ بیل تھا جو جان چکا تھا کہ میں بیکار گیڑے لگائے چلا جاتا ہوں.. اب یہ کوزے خالی باہر آ رہے ہیں..

ان تنہا اور سوگوار مقابر کو دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ.. مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے.. یعنی کسی کو کچھ خبر نہیں ان عظیم گنبدوں تلے.. کون دفن ہے.. کوئی نشان کوئی کتبہ نہیں.. وہ کیا نام رکھتے تھے جو کبھی شاہ تھے.. شہزادے تھے.. اس شہر پر حکمرانی کرتے تھے.. ان نامیوں کا کوئی نشان نہیں.. اور مجھے اس کا قلق بھی نہیں ہے.. کہ میں تو تاریخ کے کنویں میں جُتا ہوا ایک بیل ہوں جس کی آنکھوں پر کھوپے چڑھا دیئے گئے ہیں اور وہ گیڑے لگا رہا ہے.. اُسے

کیا غرض کہ باہر کی دنیا میں مہاتما بدھ برگد تلے نروان کی آس میں ہیں یا مہا بھارت کی جنگ جاری ہے۔ اشوک کالنگا کی جنگ کے بعد لاشیں دیکھ رہا ہے.. اور توبہ تائب ہو رہا ہے.. یا بابر اپنے فرغانہ کی بھوک اور ویرانی سے لاچار ہو کر ادھر کا رخ کر رہا ہے..

ایک بیل کو کیا غرض کہ کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے..

قصہ مختصر لودھی گارڈن میرے ایسے عادی سیریئے کے لیے ایک نایاب تحفہ تھا..

البتہ سیر کے دوران کچھ دھچکے سے لگے اور ان کا سبب یہ تھا کہ میں پاکستان میں نہ تھا' کہیں اور تھا..

سامنے سے دو نہایت خوش شکل سردار بوڑھے چلے آ رہے تھے جن کی نیکریں اور داڑھیاں گھٹنوں تک آتی آتی رہ گئی ہیں..

یا پھر کچھ خواتین ماتھے پر تلک لگائے ساڑھیوں میں جوگنگ کر رہی ہیں..

کچھ لڑکیاں ہیں جو نیکروں میں ہیں اور نیلی جینوں میں بھی.. اُنہیں دیکھ کر بھی ذرا دھچکا سا لگتا تھا کہ نظر کو عادت نہ تھی.. ماڈل ٹاؤن پارک میں تو ایک مُتشدد مولوی صاحب میری نیکر کے ازلی دشمن ہیں' ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں اور چھ ماہ بعد بھی غلطی سے پہن لوں تو پیچھے سے لفنگوں کی طرح نعرے لگانے لگتے ہیں' تارڑ صاحب نیکر کیوں پہن کر آتے ہیں' پارک میں بے حیائی کو فروغ ملتا ہے.. انتظامیہ پر دباؤ ڈال کر پارک میں جتنے بھی گھنے جھُنڈ تھے' جھاڑیوں اور بیلوں وغیرہ کے اُنہیں کٹوا دیا ہے تاکہ ان میں روپوش ہو کر فحش حرکات نہ کی جائیں.. ویسے یہ جو لودھی گارڈن میں نیکروں اور جینوں میں ملبوس خواتین نظر آئیں مجال ہے انہیں دیکھ کر کسی چیز کو بھی فروغ ملتا ہو کہ ان میں جو کچھ تھا وہ بس یونہی سا تھا اور ناکافی تھا..

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ دھچکا اس لیے لگتا ہے کہ نظر کو عادت نہ تھی.. اور نظر کو آسانی سے عادت ہو جایا کرتی ہے۔ مدتوں پہلے جب میں اپنے دو انگریز دوستوں کے ہمراہ جنوبی فرانس کے ساحلی شہر نیس میں گرمیوں کی چھٹیاں منانے کے لیے گیا تو وہاں اُن دنوں

ایک قریبی جزیرے ''آئل ڈے لواں'' کا بڑا چرچا تھا کہ وہ جزیرہ قدرتی حالت میں دھوپ سینکنے والوں کے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اِن دنوں تو یورپ اور امریکہ میں تقریباً ہر ساحل کا کچھ حصہ نیوڈ خواتین وحضرات کے لیے مختص کر دیا گیا ہے لیکن تب یعنی 1960ء کے لگ بھگ یہ ایک عجوبہ تھا۔ یہ عجوبہ دیکھنے ہم بھی گئے.. اور جزیرے پر کچھ وقت گزارا.. چونکہ کشتی سے اُترتے ہی جزیرے کی اخلاقی قیود کے تحت لباس سے آزاد ہونا شرط تھا۔ چنانچہ میرے انگریز یار تو پل بھر میں قدرتی ہو گئے البتہ میں بکری ہو گیا۔ میرے جیسے ڈرپوک حضرات کے لیے گنجائش رکھی گئی تھی کہ وہ ایک عدد مختصر لنگوٹ زیب تن کر کے جزیرے میں قدم رنجہ فرما سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے ایک لنگوٹ مقامی بازار سے حاصل کیا اور اُسے زیب تن کر کے اُس سے عیوب برہنگی صاف چھپتے بھی نہ تھے اور سامنے آتے بھی نہ تھے.. جزیرے کی برہنہ مخلوق میں شامل ہو گئے.. پہلے پہل تو شرمندگی کے مارے نظر نہ اُٹھاتے تھے' پھر کہاں تک ٹھوکریں کھاتے چلتے' نظر اُٹھانے پر مجبور ہو گئے.. جو دیکھا اُسے دیکھ کر کان سرخ ہو گئے.. چہرہ لال بھبھوکا کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے.. ان کے بدن تو براہ راست جانتے ہیں کہ ابر کیا چیز ہے' ہوا کیا ہے.. پورے خاندان چہل قدمی کر رہے ہیں.. بچے' بوڑھے جوان اور عورتیں سب کے سب.. اور یقین کیجیے کہ یہ کوئی اتنا دلچسپ نظارہ نہ تھا.. تھل تھل کرتے بھدّے بدرنگ بدن' جنہیں دیکھ کر مجھے تو کراہت آتی تھی.. بوڑھے بدنوں کے سوا جو بدن جوان تھے اُنہیں دیکھ کر بھی کچھ ہیجان پیدا نہ ہوتا تھا.. ایک خاتون ایک ہینڈ پمپ چلا کر پانی بھر رہی تھی اور جیسے وہ تھل تھل کر رہی تھی ویسا نظارہ تو خدا کسی دشمن کو بھی نہ دکھلائے..

کچھ دیر بعد نظر کو عادت ہو گئی اور وہ سب کچھ نارمل نظر آنے لگا.. کہنا میں یہی چاہتا تھا کہ نظر کو آسانی سے عادت ہو جایا کرتی ہے..

ایک اور سفید ریش سردار جی جن کی پگڑی نہ تھی تو وہ آسانی سے ہمارے علماء کرام کی صف میں کھڑے ہو سکتے تھے۔ میری شلوار قمیض کو دیکھ کر بھانپ گئے کہ میں پاکستانی پنچھی ہوں۔ کہنے لگے ''میں اس پارک میں سیر کرنے والوں کا منتخب صدر ہوں.. ہمارے کچھ ممبران سیر کے بعد فلاں ٹیلے پر بیٹھ کر روزانہ چائے پیتے ہیں۔ آپ آج ہمارے مہمان

ہیں‘ ضرور آیئے گا۔“

میرا پورا ارادہ تھا اُن کا مہمان بننے کا لیکن بعد میں بہت تلاش کیا لیکن وہ ٹیلا نہ ملا.. شاید ٹیلے سے مراد اُن کی کوئی ٹیلہ نہ تھا‘ کوئی سرسبز گوشہ یا کُنج تھا.. کہ سردار بھائی کبھی کبھار کہتے کچھ ہیں اور اُن کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے.. یہ بالکل حقیقت ہے کہ لنڈن میں گارمنٹس کے کاروبار کرنے والے ایک کروڑ پتی سردار جی نے اپنی نئی انگریز سیکرٹری کو کسی فرم کے لیے آرڈر لکھواتے ہوئے ڈکٹیشن دی کہ.. فوری طور پر پانچ ہزار زرد رنگ کی جینیں سپلائی کی جائیں.. اس پر نئی سیکرٹری نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا کہ سَر.. زرد رنگ کی جینیں.. تو سردار صاحب نے اُسے بہت پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا کہ ”پُتر.. میں نے جب کہنا ہے کہ زرد رنگ کی جینیں تو تم نے لکھنا ہے نیلے رنگ کی جینیں.. سمجھ آئی؟“

ویسے مجھے یہ جان کر از حد مسرت ہوئی کہ ہر پارک میں سیر کرنے والوں کا کوئی نہ کوئی جیسا کیسا بھی ہو ایک صدر ضرور ہوتا ہے.. لاہور کے ماڈل ٹاؤن پارک میں بھی ایک نہایت ہی صلح کن بیبے اور گورے چٹے‘ نہ کبھی ناراض ہونے والے نہ کبھی طیش میں آنے والے ایک مسلسل صدر ہیں شیخ ریاض صاحب.. مسلسل اس لیے کہ کسی کو کچھ یاد نہیں کہ اُنہیں سیر کرنے والوں کا صدر کس نے منتخب کیا تھا اور آخر کیا کیوں تھا.. اور وہ بھی مسلسل یہ ڈیکلیئر کرتے رہتے ہیں کہ آخر میں آپ کا صدر ہوں.. اُن کی صدارت کو کوئی چیلنج بھی نہیں کرتا کہ نہایت باقاعدگی سے پارک میں آنے والوں کو کھلاتے پلاتے رہتے ہیں.. گوجرانوالہ سے سری پائے امپورٹ کر کے ناشتے کرواتے ہیں.. یہاں تک کہ کوئی اُن کی نہایت قیمتی ٹی شرٹ کی تعریف کر دے تو اُسے اُتار کر پیش کر دیتے ہیں اور خود ٹھٹھرتے ہوئے گھر چلے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ یونہی مذاق ہی مذاق میں میں نے اعلان کیا کہ صدر کا باقاعدہ انتخاب ہونا چاہیے اور میں بھی امیدوار ہوں.. اس پر شیخ صاحب نے فوری طور پر مجھے ڈبل پٹونیا کے درجن بھر گملے عطا کیے اور ایک گرم جیکٹ مجھے تحفے کے طور پر پیش کر دی۔ چنانچہ میں بھی فوری طور پر رضا کارانہ طور پر مقابلے سے دستبردار ہو گیا..

ایک لودھی مقبرے کی پتھریلی اور نہایت عظمت والی بلند چار دیواری کے سائے

میں کیا دیکھتا ہوں کہ درجنوں خواتین و حضرات ہر نوعیت اور ہر عمر کے نہایت منظم گھاس پر اپنی اپنی چٹائیاں بچھائے اُن پر براجمان ہیں اور اُن کے سامنے ایک یوگا انسٹرکٹر.... ایک دھان پان لچکیلی لڑکی اپنے آپ کو جھکا کر اور لچکا کر بتا بھی رہی ہے کہ یوں.. میں اس منظر سے نہایت متاثر ہوا اور میں نے انتظار صاحب سے کہا کہ جناب کل سویرے میں بھی ایک عدد چٹائی بغل میں داب کر یہاں آؤں گا اور ان یوگیوں میں شامل ہو کر یوگی ہو جاؤں گا.. ویسے یوگی تو نہیں جوگی تو میں کب کا ہو چکا تھا.. کنیں مندراں پا کے‘ متھے تلک لگا کے.. جس کے بارے میں ہیر نے کہا تھا کہ میں جاناں جوگی دے نال!

انتظار صاحب میرے اس بیان پر وہی مسکراہٹ لبوں پر لائے جسے کوئی بھی سوفٹ ویئر سائفر نہیں کر سکتا کہ یہ حوصلہ افزائی کی علامت ہے‘ طنز ہے‘ ملامت ہے یا خوشی کا اظہار ہے.. مجھے خدشہ ہے کہ اُنہوں نے میری اس یوگیانہ خواہش کو یوگا سکھلانے والی دھان پان لچکیلی لڑکی کے کھاتے میں ڈال دیا تھا کہ یہ جو تارڑ ہے اسے یوگا سے کیا لینا دینا.. یہ یوگن کے لچکیلے پن میں لچک گیا ہے..

''جو شکل نظر آئی جین میں نظر آئی''

دتی میں ہونے کا جو بہانہ تھا کچھ اُس کا بھی بیاں ہو جائے..

سارک ملکوں کے ادیبوں کی کانفرنس کی بس اتنی سی کہانی ہے جتنی کہ ایسی کانفرنسوں کی ہوتی ہے..یعنی تقریریں.تحریریں..شاعری' ملاقاتیں' خواہ مخواہ کی بغل گیریاں اور لنچ اور ڈنر کے دوران تعارف..کہ یہ ہیں بنگلہ دیش کے..بھوٹان کے..نیپال یا پاکستان کے..مشہور ادیب..اور آپ جعلی مسکراہٹیں لبوں پر سجائے..جی بے شک...بے حد خوشی ہوئی آپ سے مل کر..اور بعد میں کچھ یاد نہیں رہتا کہ کسے ملے تھے اور وہ کون تھا..

ویسے ان ڈنرز اور لنچوں کے بعد ہم اکثر بھوکے ہی لوٹتے کہ ایک تو میل ملاقات مسلسل اور پھر ٹیلی ویژن انٹرویو لگاتار..ان دنوں انڈیا پاکستان میں روزانہ اتنے بچے پیدا نہیں ہو رہے جتنے ٹی وی چینلز جنم لے رہے ہیں اور ہر ایک کو اپنا پیٹ بھرنا ہے۔ چنانچہ وہاں سارک ادیب اتنے نہیں تھے جتنے ٹی وی کیمرے گردش میں تھے..ایک صاحب کاندھے پر کیمرے کا بوجھ اُٹھائے اور اُس کیمرے میں سے برآمد ہوتی ہوئی ایک کیبل جس کے آخر میں ایک مائیک اور مائیک کو ایک جنسی انداز میں تھامے ہوئے اکثر ایک خاتون..اتنی بہتات تھی کہ غسل خانے میں کموڈ پر بیٹھے ہوئے بھی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ابھی اس میں سے ایک مائیک برآمد ہو کر پوچھا جائے گا کہ تارڑ صاحب آپ ہندوستان کے غسل خانوں کے بارے میں کیا دوستانہ جذبات رکھتے ہیں..

ایک ایسے ہی انٹرویو کے دوران پوچھا گیا کہ جناب دتی کے بارے میں آپ

کے کیا تاثرات ہیں؟ تو میں نے کہا کہ حضور کونسی دتی...جب سے آئے ہیں ہر سویر لودھی گارڈن میں سیر سپاٹے کرتے ہیں..پھر سارا دن انڈیا سنٹر کے ہال میں تقریریں سنتے ہیں یا کرتے ہیں اور شام بھیگتی ہے تو ہم بار میں جا بھیگتے ہیں..یہاں سے باہر تو ابھی گئے نہیں تو کونسی اور کیسی دتی..

تو اس کونسی اور کیسی دتی میں لے جانے کے لیے زبیر رضوی نمودار ہو گیا..

زبیر تقریباً پچیس برس پیشتر لاہور میں پہلی بار نمودار ہوا تھا..مجھے اطلاع ملی کہ ہندوستان سے ایک شاعر آئے ہیں لاہور میں قدم رکھتے ہی اُنہوں نے بیان دیا کہ میں تو یہاں بس مستنصر حسین تارڑ سے ملنا چاہتا ہوں..یہ بیان مجھ تک پہنچا تو مجھے پہلی بار اپنے ادبی مرتبے کی سربلندی کا احساس ہوا اور میں نے دیگر ادیبوں کو نظر حقارت سے دیکھنا شروع کر دیا کہ میاں انڈیا میں ہماری ایسی دُھوم ہے..ملاقات ہوئی تو موصوف کہنے لگے ''میں تو آپ سے صرف اس لیے ملنا چاہتا تھا کہ جب کبھی ہم ریڈیو کے لیے نیوز کاسٹر بھرتی کرتے ہیں تو اُنہیں پڑھنے کے لیے تحریر دیتے ہیں اُس میں کہیں آپ کے نام کا اضافہ کر دیتے ہیں..اگر تو اُمیدوار آپ کا نام اٹکے بغیر پڑھ جائے تو وہ پاس ورنہ فیل..صرف اس لیے آپ سے ملنا چاہتا تھا..آپ کے نام کی وجہ سے..شنید ہے کہ آپ کچھ لکھتے لکھاتے بھی ہیں..کیا لکھتے ہیں؟''

میں اُن دنوں حلقہ ارباب ذوق کا سیکرٹری ہوا کرتا تھا تو میں نے زبیر کے لیے حلقے میں ایک شام کا اہتمام کیا اُس کی بدتمیزی کے باوجود..صدارت حبیب جالب کے ذمے تھی..

مجھے یاد ہے کہ زبیر نے ترنم کے ساتھ اپنی ایک نظم سنائی جس میں ایک مصرعہ کچھ یوں تھا کہ..

''میرے لیے موسم کے پھل لے کے آنا..''

ارباب ذوق گم صم بیٹھے رہے نہ واہ کی نہ آہ..اس پر حبیب جالب کہنے لگے' برخوردار کوئی کام کی چیز ہے تو سناؤ..زبیر ظاہر ہے اس سرد مہری سے بہت نروس ہوئے اور پھر ایک دو غزلیں پیش کیں اور ان پر واہ بھی ہوئی اور ایک آدھ آہ بھی..

یہ ایک آدھ آہ رُوحی بانو کی جانب سے آئی۔ یہ بے مثل اداکارہ شروع سے ہی کچھ تجریدی سی تھی' کھوئی کھوئی سی رہتی تھی اور اب تو بدقسمتی سے بالکل ہی کھوگئی ہے۔ چنانچہ اجلاس کے دوران وہ بار بار زبیر سے کہتی.. اچھا تو موسم کے کون کون سے پھل لے کر آؤں.. خربوزے یا تربوز.. اور پھر ہنسنے لگتی.. زبیر نے بعد میں بہت شکوہ کیا کہ تارڑ صاحب میں نے یہ نظم بمبئی کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی تو پچاس ہزار کا مجمع.. یوں کھڑا ہوگیا تھا اور اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ یوں.. اس پر میں نے معذرت کی کہ بھائی یہ لاہور والے ہیں اور ظالم لوگ ہیں' یوں نہ بیٹھتے ہیں نہ کھڑے ہوتے ہیں.. مرضی کے مالک ہیں اور موسم کے پھلوں میں چنداں دلچسپی نہیں رکھتے..

زبیر رضوی یقیناً اب بھی ایک خوش شکل ''نوجوان'' ہیں اور اُن پر آسانی سے ریشہ خطمی ہوا جاسکتا ہے.. اپنی انوکھی آپ بیتی میں بڑے فخر سے اقرار کرتے ہیں کہ برصغیر کے نامور شعراء یعنی جوش اور فراق وغیرہ اُن پر ریشہ خطمی اس حد تک ہوا کرتے تھے کہ بعض اوقات زبردستی پر اُتر آتے تھے۔ چنانچہ اُن کے خاندان نے عزت سادات بچانے کے لیے اُنہیں شہر سے باہر کہیں بھجوادیا تھا۔ چونکہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے ہیں' اس لیے میں نے ایک بزرگ پر ریشہ خطمی ہونے کا ارادہ ترک کردیا اور اُن کی عزت کرنے لگا..

تو یہی زبیر رضوی ایک روز انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں نمودار ہوگئے.. ان بزرگ کے کھنڈر بتا رہے تھے کہ عمارت عظیم ہوا کرتی تھی.. اس کے بعد میرا اور اُن کا چولی دامن کا ساتھ ہوگیا' یہ جیسا بھی ساتھ ہوتا ہے..

کہنے لگے ''آپ دتی میں کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا ''صرف تین لوگوں سے ملاقات کی تمنا ہے' خوشونت سنگھ' امرتا پریتم اور قرۃ العین حیدر سے۔''

کہنے لگے ''اس کے علاوہ..''

میں نے عرض کیا کہ ''اپنی بہو اور بیٹی کے لیے اُن کے شایانِ شان ساڑھیاں خریدنا چاہتا ہوں اور ہلدی رام کی برفی کھانا بھی اور ساتھ بھی لے جانا چاہتا ہوں۔''

اس پر زبیر قدرے رنجیدگی سے بولے ''آپ لال قلعہ.. جامع مسجد.. قطب مینار.. ہمایوں کا مقبرہ اور دیگر تاریخی مقامات نہیں دیکھنا چاہتے؟''

''ساڑھیوں کی خریداری اور ہلدی رام کی برفی کے بعد اگر کچھ وقت ہوا تو سوچیں گے۔''

زبیر ایک بے دام غلام کی طرح مجھے دتی میں لیے لیے پھرا..

جب ساڑھیوں کی خرید کا مسئلہ زیر بحث تھا تو اصغر ندیم سید نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا ''میں اپنی نئی نویلی بیگم اور متعدد سالیوں کے لیے متعدد ساڑھیاں خریدنا چاہتا ہوں۔''

چنانچہ ہم تینوں دتی کی ایک شام میں سنٹر سے باہر آئے.. ایک تین پہیوں والی سواری میں بیٹھ کر جانے کہاں جا اُترے.. جدھر بھی اُترے وہاں دتی کی شام جوان تھی.. پُررونق اور پُربہار تھی.. شاندار سٹور اور بین الاقوامی برانڈ کے ملبوسات کے شوروم تھے اور عوام الناس ہر سُو بھنبھناتے پھرتے تھے.. بے حد کوشش کی کہ دتی میں ہیں تو کوئی شکل نظر آئے جو تصویر نظر آئے.. پر جو بھی شکل نظر آئی وہ جاتی ہوئی ہی تصویر نظر آئی کہ نیلی جینوں میں ہی نظر آئی..

تو نیلی سے یاد آیا کہ ہم ''نیلی'' کی ایک شاخ میں چلے گئے..

اگرچہ یہ نیلی نہ تھی بلکہ نِیلی تھی.. اور ''نِیلی'' کی دتی میں درجنوں شاخیں ہیں جہاں ہندوستان بھر کے مختلف صوبوں کی خاص و عام.. سُوتی اور سلک کی ساڑھیاں میسر ہیں..

آسائش اس ''نِیلی'' میں یہ ہے کہ ہر کاؤنٹر کے ماتھے پر درج ہے کہ یہاں تین سے چار ہزار تک.. چار سے آٹھ.. اور آٹھ سے بارہ.. بیس چالیس ہزار کی مالیت تک ساڑھیاں مہیا کی جاسکتی ہیں..

چنانچہ آپ اپنی جیب دیکھتے ہیں اور پھر اُسی حساب سے اُس کاؤنٹر پر جا کھڑے ہوتے ہیں جو آپ کی جیب کے مطابق ہے..

چونکہ میری بیگم نے.. جو اُن دنوں امریکہ میں اپنی.. بلکہ ہماری بیٹی عینی اور نومولود نواسے نوفل کے ساتھ فروکش تھیں وہیں سے ہدایت کی تھی کہ انڈیا جا رہے ہو تو خبردار حسب معمول بے سروپا اور بیکار قسم کی شاپنگ نہ کرنا.. کم خریدنا لیکن مہنگا اور اچھا خریدنا.. چنانچہ میں

نے مہنگے ترین کاؤنٹر کا رخ کیا اور اپنی بہو کے لیے.. بیٹی کے لیے اور چھوٹے بیٹے ثمیر کی متوقع دلہن کے لیے ایسی شاندار ساڑھیاں خریدیں کہ ایشوریا رائے اور مادھوری نے بھی ''دیوداس'' میں کیا پہنی ہوں گی.. لیکن یہ سب کچھ میری جیب میں جتنے بھی ہندوستانی روپے اور امریکی ڈالر تھے' اُنہیں آگ لگا دینے سے ہوا..

قیمت کی ادائیگی کے لیے جب کیش کاؤنٹر پر پہنچا تو اُس کے عقب میں لمبی سونڈوں والے متعدد گنیش دیوتا گیندے کے ہار پہنے مجھ پر خندہ زن تھے کہ اے مومن بالآخر تو ہماری ساڑھیوں کے فریب میں آ گیا.. کاؤنٹر پر کچھ نہایت خستہ حال' ناتواں اور بیچارے سے مالک حضرات براجمان تھے اور مجھے حیرت ہوئی کہ بنیا ہونے کے باوجود وہ حساب کتاب میں سخت نالائق تھے..

ہم نے تو بزرگوں سے یہی سُن رکھا تھا کہ بنیا لوگ حساب کتاب میں بے حساب ہوتے ہیں لیکن یہ حضرات جو لمبی سونڈھوں والے دیوتاؤں کے گلے میں گیندے کے ہار ڈالے کاؤنٹر پر بیٹھے تھے.... ایک عرصے تک یہی حساب کرتے رہے کہ اگر میں اتنے ہزار ہندوستانی روپے ادا کر رہا ہوں تو بقیہ رقم اگر ڈالروں میں ادا کرنا چاہوں تو ڈالروں کی کل تعداد کتنی ہو گی..

میں کاؤنٹر پر کھڑا کھڑا اُکتا گیا.. جمائیاں لینے لگا اور اُن سے گزارش کرتا رہا کہ میرے حساب سے اتنے سو ڈالر مزید بنتے ہیں لیکن وہ اپنا حساب کرتے رہے.. آپس میں بحث مباحثہ کرتے رہے اور بالآخر وہی حساب ہوا جو میرا حساب تھا..

''نیلی'' سے لدے پھندے ہم باہر نکلے.. شاہ صاحب ملتان کے تھے اور بنیا لوگوں کے نزدیکی عزیز تھے۔ چنانچہ انہوں نے سوچ سمجھ کر خریداری کی تھی اور اُن کی جیب اب بھی بھاری تھی.. اور میں لاہوریا تھا.. ''نیلی'' سے لُٹ پُٹ کر نکلا تھا..

زبیر ہمارا رہنما تھا.. اُس کی سائڈ برنز یا قلمیں اُس کے عمر رسیدہ گالوں پر بے جان جرابوں کی مانند سوکھتی تھیں اور ان جرابوں پر ایک زمانے میں کیسے کیسے لوگ عاشق ہوئے تھے..

''کاکے دا ہوٹل.. اور مست گُردے کپورے''

ایک روز جب میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کی سرکاری.. ہندوستان کی غیر جانبدار خارجہ پالیسی سے بڑھ کر غیر جانبدار خوراکیں نوش کرتا کرتا تنگ آ گیا.. کہ اپنے تئیں پلیٹ میں کوفتے ڈالے ہیں تو وہ گوشت کی بجائے کسی سبزی ترکاری کے گولے سے ہیں اور اگر چکن بھی ہے تو بے حد معذرت کرتا ہو کہ میں سبزی کیوں نہ ہوا تو میں نے زبیر سے فریاد کی ''یار میرا تالو ترس گیا ہے.. بے جان اور لسلسا سا ہو گیا ہے.. یہاں آس پاس کوئی جاندار قسم کی خوراک نہیں مل سکتی.. کوئی چٹخارہ کوئی سواد نہیں مل سکتا..''

زبیر رضوی جیسا بھی تھا ایک نستعلیق شخص تھا' کہنے لگا ''تارڑ.. آپ پنجابی لوگ لکھتے تو بہت عمدہ ہیں لیکن چٹورے بہت ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا ''زبیر.. ہم اسی لیے تو عمدہ لکھتے ہیں کہ چٹورے بہت ہیں.. تو مجھے کہیں لے چلو.. ورنہ میری تخلیقی صلاحیتیں جتنی بھی ہیں بس آخری دموں پر ہیں۔''

''ہم کاکے کے ہوٹل چلتے ہیں۔'' اس نے ہراساں ہو کر کہا..

''یہ کاکا کہاں ہے؟''

''کناٹ پلیس میں..''

''کتنا بڑا کاکا ہے؟''

''جی..'' زبیر نے مؤدب ہو کر کہا..

''کچھ نہیں.. چلو کاکے کے پاس چلتے ہیں۔''

لیکن کاکے کے پاس جانے سے پیشتر ہم کناٹ پیلس کے آس پاس ہندوستان کے مختلف صوبوں کی دستکاریوں کے جو مرکز تھے وہاں ہم باری باری گئے.. نیت بہت خریداری کی تھی لیکن قدرے مایوس ہوئے.. کہ وہاں کوئی ایک شے.. کوئی ایک دستکاری نہ تھی جسے دیکھ کر بندہ بے اختیار ہو جائے اور خریدار ہو جائے.. کچھ بے رنگ اور بے رُوح کھدر کے کُرتے خریدے.. نٹ راج کا پیتل کا ایک مجسمہ خریدا اور وہ بھی محض اس لیے کہ چالیس برس پیشتر کناٹ پیلس کے برآمدے میں اسی نٹ راج کے مجسمے سجائے ایک نیپالی عورت سے اسی نوعیت کا ایک مجسمہ خریدا تھا.. میں تنگ نظری اور وطن دوستی سے جدا ہو کر صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ صرف ہمارے سندھ کی دستکاریوں میں جو ذوق جمال اور رنگوں کے امتزاج کے جو مُعجزے ہیں' اُن کے سامنے یہ کُل ہندوستان ہیچ تھا.. وادیٔ سوات کی چوب کاری اور ملتان کی نیلی اینٹوں کے جو مُعجزے ہیں وہ ان پر حاوی ہیں..

صرف یہ کہ ہم اپنے مُعجزوں کو فروخت نہیں کر سکتے..

اور یہ لوگ.. فروخت کرنا جانتے ہیں..

بہر حال کاکے کا ہوٹل آ گیا..

کاکے کے ہوٹل کے برابر میں کچھ اور کاکے بھی تھے..

یعنی بھاپے دا ہوٹل یا چاچے دا ہوٹل وغیرہ..

معلوم ہوا کہ سب ایک خاندان کی ہی شاخیں ہیں لیکن بھیڑ کاکے کے ہوٹل میں ہی تھی.. ایک بہت ہی مختصر اور تنگ دوکان کے باہر ہمارے ہاں کے تنور ہوٹلوں کی مانند خوراک کے دیگچے اور ہانڈیاں مہک آور ہو رہی تھیں اور بے شمار لوگ اپنی باری کے منتظر تھے.. کیش کاؤنٹر کے پیچھے ایک نوجوان بال سنوارتے منیجر سے معلوم پڑتے تھے۔ میں ذرا دھکم پیل کر کے اُن کے قریب ہوا اور اپنے پاکستانی اور لاہوری ہونے کا بتایا اور نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا یعنی بال سنوارتے وہ ذرا سے فرینڈلی ہو گئے۔ "بھا جی.. ہم بھی لاہور کے ہیں.. چوپڑا ہیں.. انارکلی بازار میں جہاں بینک آف پنجاب ہوا کرتا تھا اس کے نزدیک میرے

باپو کا ہوٹل تھا اور وہ بھی کاکے کا ہوٹل کہلاتا تھا.. تو اجڑ کر دلّی میں آئے تو یہاں بھی یہی کاروبار شروع کر دیا.. کیا کھاؤ گے؟"

"چوپڑا صاحب بس اچھا کھانا کھائیں گے جو بھی ہو۔"

"اچھا تو سبھی ہے.."

"بس آپ جو کھلائیں گے وہی کھائیں گے.."

"لاہوری ہو تو جانتے ہو گے کہ ساگ گوشت بنانا کسی کسی کا کام ہے.. اور یہ بادشاہوں کا کھانا ہے مہاراج.. ساگ گوشت ٹرائی کرو اور مہمان ہو تو میری طرف سے گُردے کپورے کھائیے.. ذرا چکھ لینا.. سواد نہ آئے تو کہنا میں لاہوری نہیں ہوں' ہندوستانی ہوں۔"

"ہندوستانی تو آپ ہیں چوپڑا جی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو ہیں مہاراج پر دلّی والے ہندوستانی نہیں۔ ان ہندوستانیوں کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کھانا کیسے بناتے ہیں۔ یہ بس باتیں بناتے ہیں اور سارا زور مرچ مصالحے پر.. انہیں تو ہم لاہوریوں نے کھانا بنانا اور کھانا سکھایا.."

چوپڑا کا یہ کاکا ہوٹل کلکتے کی بلیک ہول کوٹھڑی سے مشابہ تھا.. تنگ اور نیم تاریک کہ کہیں کوئی روشندان یا کھڑکی نہ تھی.. میزیں کرسیاں آپس میں جڑی ہوئی تھیں اور رش اتنا تھا کہ آپ لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے احتیاط نہ کریں تو برابر میں بیٹھے ہوئے صاحب کو اپنا کھانا اپنے ہاتھوں سے کھلا رہے ہوں گے..

ساگ گوشت واقعی بہت ذائقے دار اور فرحت آمیز تھا.. اور اس کے ہمراہ جو مختلف چٹنیاں اور سلادیں مہیا کی گئیں وہ مرچوں اور مصالحوں میں بھیگی ہوئی تھیں اور چٹخارے دار اتنی تھیں کہ تالو بار بار اُن کا شکریہ ادا کرتا تھا.. اور گُردے کپورے بھی لاہور کی میکلوڈ روڈ کے مقابلے کے تھے.. روٹیاں البتہ دلّی کے مزاج کی تھیں یعنی بمشکل دو لقمے بنتے تھے مگر تنور کی تھیں اور گرم گرم آتی تھیں..

ہم چوپڑا کے تیار کردہ کھانے نوش کر کے باہر نکلے تو ہنکارتے اور پھنکارتے

ہوئے نکلے کہ ہم اُن کے ذائقے سے قدرے مست ہو گئے تھے.. ایک بار خیال آیا کہ ہندو ہوٹل تھا گوشت جانے کس نوعیت کا تھا لیکن پھر یہ خیال فوراً ہی مست ہو کر کہیں روپوش ہو گیا.. بھلا جھٹکے کے گوشت میں اتنی مستی کیسے ہو سکتی ہے اور گردوں کپوروں کو کیا فرق پڑتا ہے کہ اُنہیں جھٹک دیا گیا یا حلال کیا گیا.. بہر طور اُن کی رُوح لاہوری تھی..

"سارک ادیبوں کی کانفرنس اور مے خانے میں جمالِ یار کی باتیں"

اُدھر سارک ادیبوں کی کانفرنس زور و شور سے جاری و ساری تھی..

کانفرنس کو صراطِ مستقیم پر چلانے والی بے چین رُوح سردارنی اجیت کور تھی.. جس پر پون صدی نے کچھ اثر نہ کیا تھا اور وہ ایک بھنبیری کی مانند گھومتی چلی جاتی تھی.. ہر مندوب پر منڈلا رہی ہے.. خیال بھی رکھ رہی ہے اور شور بھی مچا رہی ہے کہ آپ نے تقریر کرنی ہے.. آپ نے پریذیڈیم پر پدھارنا ہے.. تم نے کویتا سنانی ہے' تم نے کچھ بھی نہیں سنانا.. میں اُسے باجی اجیت بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اللہ نہ کرے میری باجی ایک سردارنی ہو اور آنٹی اُس کے منہ پر کہہ دیتا تو وہ میرا منہ توڑ دیتی تو یہ اجیت پنجابی کی ایک نہایت موہنی اور شاندار نثر نگار ہے اور اُس کی دُھوم بہت ہے.. جب تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہے تو پھر بیٹھتی نہیں.. اردو' پنجابی اور خاص طور پر انگریزی میں یکساں طور پر دل پذیر ہوتی ہے.. وہ اتنی دیر تک دل پذیر ہوتی رہتی ہے کہ اُسے یاد دلانا پڑتا ہے کہ میڈم آپ نے صرف ایک مندوب کی آمد کا اعلان کرنا ہے.. معاشرے کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کرنا.. سارا دن بھاشن نہیں دینا..

اجیت کور اور کشور ناہید میں بے شمار مماثلتیں ہیں.. ایک تو یہ کہ دونوں سردارنیاں ہیں.. دونوں متحرک پھرکیاں ہیں جو پھرتی رہتی ہیں نہ خود چین سے بیٹھتی ہیں نہ دوسروں کو چین سے بیٹھنے دیتی ہیں.. دونوں پر حکومتِ وقت کے ساتھ رابطوں کے الزامات لگتے رہتے

ہیں.. دونوں ایک پل میں کچھ اور دوسرے پل میں کچھ اور ہو جاتی ہیں.. کینچوؤں کی طرح سست اور افیونیوں کی مانند کاہل ادیبوں اور شاعروں کو ہانک ہانک کر کسی بھی ادبی فنکشن کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہیں.. مجھے اجیت کور کے بارے میں علم نہیں لیکن کشور ایسی عورت ہے جو ہر اُس ادیب کی مدد کو اُڑتی ہوئی پہنچتی ہے جو کسی بھی ابتلا میں مبتلا ہو چاہے وہ اُسے زندگی بھر گالیاں ہی کیوں نہ دیتا رہا ہو..

کشور کو چونکہ کہیں احمد آباد وغیرہ جانا تھا اس لیے وہ کانفرنس میں آخری روز پہنچی.. اُس کی آمد پر کچھ پاکستانی ادیبوں نے سُکھ کا سانس لیا کہ بھیڑوں کی رہنمائی کرنے والی گڈرین آن پہنچی ہے.. یہ بھیڑیں اس سے پیشتر بان بان کرتی لاوارث پھرتی تھیں..

احمد فراز کے آنے پر بھی کچھ بیماروں کا حال اچھا ہو گیا..

ان میں سے بیشتر دلّی کی وہ کافر خواتین تھیں جنہیں اُس کے اشعار نے بیمار بنا رکھا تھا. فراز ہندوستان میں بھی پسندیدگی کی معراج پر فائز ہے اور وہاں ایسی دیوداسیوں کی کچھ کمی نہیں جو اُس کی پرستش کرتی ہیں.. اگرچہ اس پرستش سے فراز کو کہولت زدہ ہونے کے باعث چنداں بدنی فائدہ نہیں ہوتا.. بے شک اب تو صرف ہاتھ میں ہی جنبش ہے لیکن آنکھوں میں تو دم ہے..

اُس کے آتے ہی رونقیں ہو گئیں..

اُس کے کمال کے غیر شریفانہ فقرے ایسے تھے کہ لودھی گارڈن کے پرندوں کو بھی چہچہانے پر مجبور کر دیا.. بے شک اُن میں سے بیشتر کوّے تھے..

فراز اگر شاعر نہ بھی ہوتا تو اپنی فقرہ بازی سے روزی کما سکتا تھا..

شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے..

اُن دنوں میں ایک بدنامِ زمانہ ٹیلی ویژن شو ''شادی آن لائن'' کی میزبانی کر رہا تھا اور فراز کو اُس میں میری شمولیت پر شدید اعتراض تھا اور اس اعتراض میں میرے لیے اُس کی بہت سی محبت شامل تھی.. اُس کا خیال تھا کہ یہ شو میرے ادبی مرتبے کے لائق نہیں ہے.. اگر کوئی مرتبہ وغیرہ ہے اور میں بار بار گوش گزار کرتا تھا کہ فراز تمہاری جیبوں سے تو

امریکہ' آسٹریلیا اور یورپ کے ہوائی ٹکٹ ایسے برآمد ہوتے ہیں جیسے ہم جیسوں کی جیبوں سے مُرید کے یا زیادہ سے زیادہ اسلام آباد کے بس کے ٹکٹ.. ہم نثر نگاروں کو کون پوچھتا ہے تو اس شو کی برکت سے میں نے حج کیا. گھر کی مرمت کروائی.. نئے صوفے بنوائے اور اب نئی کار کے خواب دیکھ رہا ہوں تو صرف ادبی مرتبے سے تو ایسے خواب نہیں دیکھے جا سکتے اور وہ ہمیشہ غصے میں آ کر کہتا کہ وہ لوگ تمہیں کتنے پیسے دیتے ہیں.. میں تمہیں اتنے پیسے دیتا ہوں تم وہ شو چھوڑ دو' وہ تمہارے لائق نہیں. چنانچہ میں اُسے قائل نہ کر سکا اور وہ مجھے ہر محفل ہر نشست میں اسی شو کے طعنے دیتا تھا اور اپنی ناراضی کا اظہار کرتا تھا..

کانفرنس کے دوران اگر کوئی بھی خوش شکل خاتون مجھ سے کلام کرتی ہے تو فراز دور سے نعرے لگانے لگے گا کہ بی بی خبردار تارڑ سے بات نہ کرنا یہ تمہاری شادی کروا دے گا..

میں اگر کانفرنس میں ایک سنجیدہ علمی مقالہ بہ زبان انگریزی پڑھ رہا ہوں تو کُل مندوبین میں سے صرف فراز ہو گا جو مجھے ہُوٹ کر رہا ہو گا کہ چھوڑو یار تمہارا ادب سے کیا واسطہ. تم تو ''شادی آن لائن'' ایسا شو کرتے ہو..

فراز کا ذکر آئے اور مے خانے کا تذکرہ نہ آئے.. یہ کیسے ممکن ہے!

میں عرض کر چکا ہوں کہ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں دیگر سہولتوں کے علاوہ ایک خوش نظارہ کوزی اور خصوصی بار بھی تھی جسے میں فسادِ خلق کے باعث بار کم ریستوران ہی کہوں گا..

میں اس خانہ خراب میں مے سے خراب ہونے کے لیے نہیں.. تندوری مچھلی چکھنے کے لیے آتا جاتا رہتا تھا..

فراز بس آتا تھا اور پھر جاتا نہیں تھا جب تک کہ اُس کو کوئی لے نہ جائے.. اور اُسے لے جانے والوں کی کچھ کمی نہ تھی..

دلّی میں ورود کی پہلی شام جب ابھی فراز کا نزول نہیں ہوا تھا' میں کچھ بھوٹانی اور نیپالی ادیبوں پر اپنے ادب کی دھاک بٹھا رہا تھا اور اُن کے ہمراہ شام کر رہا تھا اور شام کے اختتام پر میں نے ویٹر سے اُسی شام کا بل طلب کیا تو اُس نے جھکی ہوئی حالت میں مؤدب

ہو کر کہا ”صاحب آپ کا بل اُن صاحب نے ادا کر دیا ہے۔“

”کن صاحب نے؟“ میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

”اُن صاحب نے سر..“ اُس نے کن اکھیوں سے بار کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھے صاحب کی جانب اشارہ کیا اور رخصت ہو گیا..

میں نے اُن صاحب کی جانب نگاہ کی تو اُنہوں نے سر جھکا کر ایک خفیف سی مسکراہٹ سے نواز دیا..

اپنی نشست سے اُٹھ کر میں اُن کے پاس گیا.. ”جناب آپ کی پیشکش کا بہت شکریہ لیکن میں اپنا بِل خود ادا کرنا چاہتا ہوں..“

وہ صاحب موسموں کا آزمودہ چہرہ رکھتے تھے اور میری عمر کے آس پاس ہوں گے۔ مسکرائے ”آپ پاکستان سے آئے ہیں..“

”جی“

”اور لاہور سے آئے ہیں..“

”جی“

”تو پھر آپ جب تک یہاں ہیں بِل ادا نہیں کر سکتے.. آپ میرے مہمان ہیں..“ اور اس فقرے میں محبت کے علاوہ خفیف سی دھمکی بھی شامل تھی..

میں لاچار ہو گیا.. ”آپ کا تعارف..“

اُنہوں نے اپنا کارڈ پیش کیا ”کیپٹن رام سنگھ.. ریٹائرڈ“

”تھینک یو کپتان صاحب..“

ایک شام جب تندوری مچھلی اور کسی سادہ مگر خنک مشروب کی خواہش ہوئی تو میں نے بار میں جھانک کر پہلے اطمینان کر لیا کہ کہیں کپتان صاحب تو براجمان نہیں ہیں اور وہ نہیں تھے.. بعد میں ویٹر کو بِل لانے کے لیے کہا تو اُس نے حسبِ روایت جھک کر کہا ”سَر.. کیپٹن رام سنگھ نے ہمیں ہدایت کر رکھی ہے کہ آپ جب بھی یہاں تشریف لائیں اُن کے مہمان ہوں گے.. آپ صرف بِل پر سائن کر دیجیے۔“

ایک اور شام تھی جب اس گوشۂ عافیت میں ایک شخص داخل ہوا.. بلند قامت.. خوش شکل اور خوش لباس بھی.. بال گھنے کہیں سیاہ اور کہیں سفید.. اور اُس کے ہمراہ اُس کی نہایت نفیس اور دراز قامت اہلیہ تھی.. فراز نے تعارف کروایا کہ یہ مظفر علی ہیں.. میں نے واجبی سلام دعا کے بعد برابر میں بیٹھے ہوئے جاوید شاہین اور اُس کے ایک دوست ونود جو ”غزل“ نام کا ریستوران چلاتے تھے، اُن سے محوِ گفتگو ہو گیا.. متو بھائی اُسی شام بذریعہ ٹرین پہنچے تھے اور نہایت بے دریغ موڈ میں ہکلائے بغیر اپنی تازہ ترین پنجابی شاعری سنا رہے تھے جو انہوں نے صرف بیس برس پہلے لکھی تھی.. ٹیلی ویژن پر سیاسی پروگراموں کی میزبانی کرنے والے خوشگوار شخصیت کے طلعت حسین ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کا دورہ کر کے لوٹے تھے اور اپنے تاثرات بیان کر رہے تھے..

اس دوران اُن مظفر علی نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کرتا ہوں.. میں نے بتا دیا اور پھر اُن سے پوچھا کہ وہ کیا کرتے ہیں..

اس پر فراز چہک اٹھے ”تارڑ تم مظفر کو نہیں جانتے.. جان بھی کیسے سکتے ہو تم تو ”شادی آن لائن“ جیسا شو کرتے ہو.. بھئی یہ مشہور ہدایت کار ہیں ”امراؤ جان ادا“ نہیں دیکھی؟“

ظاہر ہے میں قدرے شرمندہ سا ہوا کہ میں اس شخصیت کی صلاحیتوں کا مداح تھا اور اُسی سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ کیا کرتے ہیں..

بہت عرصہ پہلے.. شاید بیس برس پہلے گوپی چند نارنگ کی آمد پر میرے گھر میں ایک ناشتے کا بندوبست تھا.. حاجی کی نہاری.. سری پائے اور ہریسہ وغیرہ کے علاوہ میں نے احتیاطاً حلوہ پوری اور آلو کی بھُرجی کا انتظام بھی کر لیا کیونکہ شُدھ ہندو حضرات بھی تشریف لا رہے تھے.. نارنگ صاحب نے مجال ہے حلوہ پوری وغیرہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا ہو.. نہاری اور سری پائے نہایت رغبت سے نوش کرتے رہے.. اُن کے ہمراہ ایک نہایت خاموش طبع ڈرے ڈرے سے صاحب بھی ہندوستان سے آئے تھے جو کھاتے بہت کم تھے اور بولتے اُس سے بھی کہیں کم تھے.. نارنگ صاحب نے ناشتے کے بعد تعارف کروایا کہ یہ

شہر یار ہیں..شاعر ہیں..اور یہ وہی شہر یار تھے جنہوں نے میرا بہت دل پسند نغمہ ''اس شہر میں تم جیسے دیوانے ہزاروں ہیں'' فلم ''امراؤ جان ادا'' کے لیے لکھا تھا..

اور آج یہ مظفر علی تھے جو اُس فلم کے خالق تھے..

اگرچہ فراز نے بہت کوشش کی کہ ہم دونوں کسی قسم کی سنجیدہ گفتگو نہ کرسکیں..لیکن میں اُس کے فقروں کی زد سے بچتا' اُس کے لطیفوں پر جان بوجھ کر پتھر چہرہ بنائے کسی نہ کسی طرح مظفر سے اپنی محبت اور پسندیدگی کا اظہار کرنے میں کامیاب ہوگیا..

اور اُن سے تازہ ترین وابستگی کا سبب عابدہ پروین کی گائی ہوئی وہ عارفانہ غزلیں تھیں جو ہندوستان میں ریکارڈ کی گئیں اور جن کی موسیقی بہت انوکھے اور پُر اثر انداز میں مظفر نے ترتیب دی تھی.. میں نے اُنہیں بتایا کہ اُن کی ترتیب دی ہوئی حسرت موہانی کی غزل ''روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام..'' میں جب بھی سنتا ہوں تو یہ کیا ہے کہ اُس کے ظاہری معانی معدوم ہو جاتے ہیں اور مجھ پر ایسی کیفیت اُترنے لگتی ہے کہ میں روضۂ رسولؐ کی جانب بڑھ رہا ہوں اور میرے آس پاس جو لوگ آنکھیں نم کیے سر جھکائے چل رہے ہیں تو یہ وہ انجمن ہے جو میرے یار کے جمال سے روشن ہو رہی ہے..

مظفر کو میں پہلی بار مل رہا تھا اور لگتا تو یہی تھا کہ مذہب سے اُن کا لگاؤ نہیں ہے اور اس کے باوجود وہ متاثر ہوئے اور کہنے لگے ''اس سے بڑا کامپلی منٹ مجھے آج تک نہیں ملا..''

کیسی عجیب بات ہے..ایک مے خانے میں جمالِ یار کی باتیں..حُسنِ یار کی باتیں..

''یوگا..یوگی..یوگن اور ہری اوم..اللہ''

''معاف کیجیے گا..میڈم آپ کے پاس ایک چٹائی ہوگی..؟''

''چٹائی..اے مَیٹ؟'' انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے ریسیپشن کاؤنٹر پر ہمہ وقت تھرکتی متحرک مسکراتی تلک شدہ ایک ساڑھی میں بھلی لگتی خاتون کے لبوں پر جو ہمہ وقت مسکراہٹ کھیلتی تھی وہ سمٹ گئی ''سَر..آپ اپنے کسی گیسٹ کے لیے ایک میٹرس چاہتے ہیں؟''

''نہیں میں ایک چٹائی چاہتا ہوں..اپنے لیے..''

''آپ فوم کے بیڈ پر نہیں سو سکتے..ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق..کیا ایسا ہے؟''

''نہیں بی بی ایسا نہیں ہے۔'' میں نے ہنستا کر کہا ''میں کل سویر لودھی گارڈنز میں یوگا کرنے والے گروپ میں شامل ہونا چاہتا ہوں اور مجھے ایک چٹائی درکار ہے' گیلی گھاس پر بچھانے کے لیے اور یوگا کرنے کے لیے۔''

بھلی لگتی یکدم مستعد ہوگئیں..متعدد فون کیے..سنٹر کے ملازمین کو حاضر کیا..اُنہیں سٹور کی جانب روانہ کیا۔ ہر جانب سے طرح طرح کی معلومات حاصل کیں اور بالآخر کہنے لگیں ''سوری سَر..سنٹر میں چٹائی نہیں ہے..کیا ایک سفید بیڈ شیٹ کام دے جائے گی؟''

''نہیں جی..'' میں نے اُس کی مستعدی سے خوش ہو کر کہا اور اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

اگلی سویر حسبِ معمول انتظار صاحب نے مجھے کچی نیند کی مخمور شدہ حالت میں فون کی گھنٹیاں مسلسل بجا کر زچ کیا اور بیدار کر دیا..

وہ برآمدے میں چاک و چوبند اور چوکنّے میرے منتظر تھے.. یہ اگلے وقتوں کے لوگ تھے' بے شک ہمارے اور ان کے درمیان دس برس کا بھی وقت نہ تھا پھر بھی میں اُنہیں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کہ حضرت آپ نے کس چکی کا پسا ہوا آٹا کھایا ہے جو ابھی تک تھکاوٹ کے کچھ آثار نہیں.. ہم سے زیادہ متحرک ہیں..

لودھی گارڈن میں داخل ہوتے ہی میں نے انتظار صاحب سے معذرت کر لی۔

''جناب آپ سے گوش گزار کر چکا ہوں کہ آج میرا اور آپ کا ساتھ عارضی ہوگا.. میں نے چٹائی میسر نہ ہونے کے باوجود تہیہ کر رکھا ہے کہ لودھی مقابر کی فصیل کے سائے میں یوگا گروپ میں شامل ہو کر یوگی ہو جاؤں گا.. ورزشیں کروں گا..''

''آپ کریں گے؟''

انتظار صاحب کے اس فقرے کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا تھا.. یعنی ''آپ'' کریں گے.. اس بھدے تن و توش کے ساتھ.. یا ایک شاباش کے ساتھ کہ ٹھیک ہے آپ کر لیں..

وہ لچکیلی اور البیلی اگرچہ شکل سے واجبی خاتون کمر پر ہاتھ رکھے جسے مقامی زبان میں کمریا بھی بولتے ہیں' ایک کمان کی مانند تھی اور اُس کے سامنے قطار اندر قطار چٹائیوں پر ایک ترتیب سے براجمان چالیس پچاس کے لگ بھگ سولہ سے ستّر سال تک کے خواتین و حضرات آسن جمائے اُس کے اشاروں پر پُتلیوں کی مانند حرکت کر رہے تھے..

میں ایک خصوصی التجائی' درخواستی اور مسکین سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرے اُس لچکیلی نار کے قریب ہوا اور عرض کیا کہ یہ بندہ پاکستان سے آیا ہے.. لکھتا ہے اور اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ذری کی ذری آپ کے گروپ میں شامل ہو کر کچھ اُٹھک بیٹھک کر لے..

اُس لچکیلی ناری نے نہ ہی مجھے کسی اُلفت بھری نظر سے نوازا اور نہ ہی کسی بھی نوعیت کے تبسم سے نوازا.. نہ پاکستان اُس پر اثر انداز ہوا اور نہ لاہور کا حوالہ.. بس سیدھے سیدھے روکھے پھیکے انداز میں میکانکی انداز میں سر ہلا کر اجازت مرحمت فرما دی..

میں اُن کے برابر میں اوس زدہ گھاس پر پسکڑا مار کر بیٹھ گیا اور اُن کی بدنی لچک پر غور کرنے لگا کہ کمال ہے اتنی لچک بھی ہو سکتی ہے.. پھر مجھے احساس ہوا کہ میں اُنہیں دیکھنے نہیں آیا اُن کی یوگا کی ہدایات پر عمل کر کے ایک جداگانہ تجربے سے گزرنا چاہتا ہوں.. میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ اب کیا کروں تو اُنہوں نے مجھ پر نظر ڈالی..

''آپ پلیز میری چٹائی پر بیٹھ جائیے.. گیلی گھاس پر نہ بیٹھیں۔''

''جی نہیں شکریہ... میں یہاں بہت آرام سے ہوں۔''

''میری چٹائی پر بیٹھیے۔'' موصوفہ نے لچک کر نہیں گرج کر کہا۔

یہ موصوفہ عمر میں کچھ نہیں تو چالیس برس تو مجھ سے چھوٹی ہوں گی لیکن بزرگوں کا کچھ لحاظ نہ کرنے والی دکھائی دیتی تھیں' اس لیے میں گھاس پر سے کان لپیٹ کر اُٹھا اور اُن کی ذاتی چٹائی پر جا براجمان ہوا..... براجمان ہو کر دیگر یوگی خواتین و حضرات کے تتبع میں یوگا کا مخصوص آسن اختیار کرنے کی خواہش میں ٹانگیں سکیڑ کر پاؤں اُن کے اندر جکڑ کر مہاتما بدھ کی مانند بیٹھنے کی کوشش کی تو رائیگانی کے سوا کچھ نہ ملا.. ٹانگیں سوکھی لکڑیوں کی مانند خم ہونے سے انکاری ہو گئیں.. رانیں پریشان ہو گئیں اور گھٹنے پتھر ہو گئے' ٹس سے مس نہ ہوئے.. بہر حال کسی نہ کسی طرح اُس حالتِ زار کو اختیار کر ہی لیا..

اب میرا مقام بھی عجیب تھا..

یعنی میں یوگا اُستانی کی میٹرس پر بیٹھا تھا اور میرا رُخ انور اُن چالیس پچاس خواتین د حضرات کی جانب تھا اور میں ایک حماقت آمیز مسکراہٹ لبوں پر بکھیرے اُنہیں دیکھتا تھا اور وہ سب صرف مجھے دیکھتے تھے اور نہایت ذوق و شوق سے میری شلوار قمیض کو دیکھتے تھے' پر یوگا کے ڈسپلن کی پاسداری کرتے ہوئے مجھ پر مسکراتے نہ تھے' بس دیکھتے جاتے تھے کہ یہ کیا شے ہے..

اس کے بعد کی داستان مزید دردناک ہے.. اور درد کوئی ایک مقام سے تھوڑا اُٹھتا تھا' دل و جان کے علاوہ جانے کہاں کہاں سے اُٹھتا تھا..

لچکیلی خاتون کمر پر ہاتھ رکھے بائیں جانب جھکتی چلی جاتی اور دایاں بازو سر کے

اوپر سے جھکائے جاتی.. سامنے بیٹھے یوگی اُس کی پیروی میں جھکتے چلے جاتے.. میں بھی اگر ایسا کرتا تو جہاں تک جھکتا قیامت تک وہیں جھکا رہتا.. پھر اُس نے ٹانگیں پھیلا کر دائیں بازو سے بائیں پاؤں کا انگوٹھا جا چھوا اور وہیں ساکت ہوگئی.. میں نے یہ حرکت کرنے کی کوشش کی تو کمر میں کچھ کڑاکا سا باقاعدہ سنائی دیا.. یہ ورزش خطرے سے خالی نہ تھی اس لیے میں بمشکل سیدھا ہوا اور شرمندگی سے اُن بابا حضرات کو تکنے لگا جو مجھ سے کہیں سینئر بابے تھے اور نہایت آسانی سے قدرتی لچک سے یہ ورزش کر رہے تھے..

یہ طے ہے کہ اگر میں بھی دیگر یوگیوں کے ہمراہ ہوتا تو چپکے سے کھسک جاتا لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں اُن سب کے سامنے کھڑا تھا اور لچکیلی خاتون برابر میں گویا میرے سر پر سوار تھی.. ویسے تو میں اتنا عاجز ہو چکا تھا کہ اس مقام سے بھی ذرا ڈھیٹ بن کر فرار ہو جاتا لیکن میں اپنے پاکستانی ہونے کا بتا چکا تھا اور اب ملک کے وقار کا مسئلہ تھا.. وہ ہندوستانی مجھے بگٹٹ بھاگتا ہوا دیکھ کر کیا کہتے کہ پاکستانی ایسے ہوتے ہیں.. میں نے اپنے آپ پر بہت جبر کیا اور یہ درد آمیز اور کمر توڑ ورزشیں کسی نہ کسی طرح جاری رکھیں.. اس دوران انتظار صاحب نہایت مزے سے سیڑھیوں پر بیٹھے مجھے مسلسل نظر میں رکھے میری حالت زار سے لطف اندوز ہوتے رہے..

لیکن ابھی عشق کے امتحاں اور بھی تھے..

خدا خدا کر کے جب یوگا کا یہ سیشن اختتام کو پہنچا تو سب خواتین و حضرات نمستے کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور آنکھیں بند کر کے بلند آواز میں لگے کوئی منتر جنتر الاپنے.. میں نے ہاتھ تو جوڑ دیے لیکن یہ جو بھجن وغیرہ گائے جا رہے تھے' اُن میں شامل ہونے سے گریز کیا کہ میں تو ''میرے مولا بلا لو مدینے مجھے'' الاپنے والوں میں سے تھا.. آخر میں ایک اور بپتا آن پڑی سب یوگیوں نے سانس کھینچ کر ایک نہ ختم ہونے والا.. او..او..اوم کا ورد شروع کر دیا.. میں لب بھینچے کھڑا رہا لیکن پکڑا گیا.. لچکیلی خاتون نے مجھے یوں مُہر بلب پایا تو ڈانٹ کر کہا ''بلند آواز میں ''اوم کہیے..او..اوم''

دراصل میری اوم سے کچھ شناسائی نہ تھی.. میں نے اس اوم کو صرف لاہور میں

ہندو حویلیوں کے ماتھے پر دیوناگری میں لکھا ہوا دیکھا تھا.. یا پھر میں اداکار اوم پرکاش کو جانتا تھا جو لاہور کا رہنے والا تھا..

البتہ اُس لچکیلی خاتون کی بے دینی پر مجھے شدید رنج ہوا کہ اُن کے بارے میں پہلے روز مجھے اطلاع ملی تھی کہ وہ خیر سے مسلمان ہیں.. اور اس کے باوجود ایک مسلمان کو ''اوم'' کہنے پر اُکسا رہی تھیں..

میں نے اُس لمحے تجزیہ کیا کہ یہ کیا ہے کہ میں غیر مذاہب کی تقاریب میں دل و جان سے شامل ہوتا رہا ہوں' یہ جاننے کے لیے کہ رب کی یہ مخلوق اپنے اپنے رب کو کس انداز میں یاد کرتی ہے' پکارتی ہے.. شام کے دروز لوگوں کی دعاؤں میں شامل ہوا ہوں.. تہران کے گوردوارے میں سکھوں کے ہمراہ گرنتھ صاحب کا پاٹھ سر جھکائے سنتا رہا ہوں.. فلارنس کے گرجا گھر ''ڈومو'' میں ایک موم بتی روشن کر کے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا رہا ہوں تو یہ کیا ہے کہ صرف ایک لفظ ''اوم'' کہنے سے ہچکچا رہا ہوں.. شاید اس لیے کہ میرے اندر کا ہندو ابھی تک کروٹیں لیتا تھا' ابھی تک میرے تعاقب میں تھا.. صرف اسی لیے.. چنانچہ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر عزیز میاں قوّال کی مانند ایک گہری آواز میں ''اللہ'' پکارا.. پھر کلمہ شریف کا ورد کیا اور پھر آخر میں ایک خفیف سے ''اوم'' بھی پکار دیا..

لودھی مقابر کے دُھند میں سے اُبھرتے ڈوبتے گنبدوں نے شاید میری اس حرکت کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا لیکن میں کیا کرتا.. میں اُن کی آمد سے پیشتر کا ایک شخص تھا اور ان زمانوں میں ''اوم'' کا ہی چلن تھا..

''عزتِ نفس کی پامالی اور ادبی خانہ جنگی''

میں بے شک اپنی خصلت سے مجبور اور دیہاتی انا کے باعث بہت گھاٹے میں رہا لیکن میری بے مُہار اور آوارہ رُوح کبھی بھی پابند نہ ہو سکی.. نہ کسی سیاسی وابستگی کے بندھنوں میں قید ہوئی اور نہ ہی کسی بھی ادبی گروہ سے سراسر منسلک ہو سکی.. درست کہ مجھے شروع شروع میں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا.. مجھے نظر انداز کیا گیا لیکن میرے حرف نے مجھ سے وفا کی اور میرا ساتھ دیا اور مجھے اُس پار لے گیا جہاں کم لوگ پہنچتے ہیں.. میں اپنی سوچ اور تخلیق میں ہمیشہ آزاد رہا..

دلّی پہنچ کر مجھے اسی نوعیت کے دو دھچکے لگے..

پنجاب کے ایک لکھاری.. اور یہ پہلے روز کی بات ہے.. میرے کمرے میں تشریف رکھتے تھے، جب ریسپشن سے فون آیا کہ اجیت کور آپ سے ملنا چاہتی ہیں.. میں باہر چلا گیا۔ اجیت کا ایک ٹریڈ مارک ہے ''جپھّی''.. کُھلے دل کی لاہورن ہیں، ہاتھ ملانے یا آداب بجالانے پر یقین نہیں رکھتیں.. دور دور سے نہیں ملتیں بہت قریب قریب ہو کر جپھّی ڈال کر ملتی ہیں اور ہر کس و ناکس سے بے دریغ ملتی ہیں۔ اگر جوانی میں بھی اُن کی یہی عادت تھی تو اس سے بُہتوں کا بھلا ہوا ہوگا.. ویسے کانفرنس کے اختتامی سیشن تک میرا پورا نام لینے سے قاصر رہیں کہ سردارنی تھیں تو میں ریسپشن پر پہنچا تو اُنہوں نے نہایت شفقت سے مجھے جپھّی ڈالی کہ اُن کی عمر ہی شفقت والی ہے اور کہنے لگیں ''وے تارڑ.. میں نے تمہارے ساتھ کچھ مشورے کرنے ہیں، کانفرنس کے بارے میں..''

میں نے کہا ''آپ میرے کمرے میں آجائیں، اطمینان سے باتیں کریں گے۔''

کہنے لگیں ''وہاں اور کوئی تو نہیں؟''

میں نے عرض کیا کہ.. ''فلاں پنجابی لکھاری ہے.. آجائیں۔''

اجیت.. عام حالات میں بہت ٹھنڈی ٹھار اور منظّم خاتون لکھاری کا نام سن کر یکدم آگ بگولہ ہو گئیں..

''وہ....'' اس وہ.. کے بعد جو القاب اُنہوں نے استعمال کیے وہ درج نہیں کیے جا سکتے.... ''وہ یہاں کیا کر رہا ہے.... تمہیں پتہ ہے کہ اُسے اس کانفرنس میں آنے کی دعوت نہیں دی گئی.. زبردستی آیا ہے اور اپنا ٹکٹ خرچ کر کے یہاں پہنچ گیا ہے.. ایئرپورٹ پر جو کانفرنس کا نمائندہ تھا وہ بھی حیران تھا کہ جس شخص کا نام مندوبین کی فہرست میں نہیں ہے اُس کا کیا کروں.. یہاں آیا ہے تو شور مچا رہا ہے کہ مجھے دعوت نامہ کیوں نہیں بھیجا گیا، میں تو بہت بڑا لکھاری ہوں اور میرے تعلقات ہریانہ کے چیف منسٹر سے ہیں.. سنٹر میں ظاہر ہے اُس کے نام کا کوئی کمرہ نہیں تھا.. اُسے وائی ایم سی اے بھیجا گیا اور وہاں بھی اُس نے شور مچایا کہ مجھے سنٹر میں ٹھہرایا جائے.... یہاں بہت مشکل سے کسی اور مہمان کا کمرہ اُسے دیا گیا صرف اس لیے کہ وہ بدمزگی پیدا نہ کرے.. وہ.. تمہارے کمرے میں کیا کر رہا ہے؟''

یہ ردعمل سچی بات ہے میرے لیے بہت ہی غیر متوقع تھا.. ''وہ ایک زمانے میں میرا دوست ہوا کرتا تھا اور ہم کمرے میں بیٹھ کر سراسر منافقانہ باتیں کر رہے ہیں..''

''اُسے ابھی.. اور اسی وقت کمرے سے نکال دو.. کِک ہم آؤٹ.. وہ..'' اس وہ.. کے بعد اجیت نے القابات کی وہی ناقابل بیان گردان کر دی..

میں نے پہلے تو اجیت کو سرد کرنے کی ایک سعیٔ لاحاصل کی لیکن وہ اُبلتی رہی۔ تب میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا ''اجیت.. یہ نہیں ہونے کا.. وہ اس لمحے میرا مہمان ہے اور وہ میرا دوست رہا ہے.. بے شک بقول آپ کے وہ بن بلائے آدھمکا ہے لیکن میں.. اُسے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم میرے کمرے سے چلے جاؤ، اجیت نے آنا ہے.. چاہے تم مجھے کانفرنس

سے ابھی چلے جانے کا کہو..اور میں چلا بھی جاؤں گا تم جانتی ہو۔"

اجیت سیانی سردارانی تھی..جان گئی کہ میں بھی سردار ہو چکا ہوں..اس نے میرا کندھا تھپکا اور چلی گئی..یہ اُس کی مہربانی تھی..

میں کمرے میں واپس آیا تو اُس لکھاری نے مجھے متاثر کرنے کی غرض سے بہت ڈینگیں ماریں کہ میں تو بہت مصروف تھا' اجیت نے پیغام بھیج کر ناک میں دم کر دیا کہ تم نے آنا ہے..اس سنٹر کی کیا حیثیت ہے' میرے لیے تو ہریانہ ہاؤس میں دائمی بنیاد پر ایک لگژری سویٹ مخصوص ہے۔تب میں نے اُسے اجیت کے ردعمل کے بارے میں آگاہ کیا..القابات کے علاوہ جو کچھ اُس نے کہا تھا' اُسے بتایا..

ذاتی طور پر اس معاملے میں میرا کچھ عمل دخل نہ تھا..لکھاری نے اپنی بڑائی کے بارے میں جو کچھ کہا وہ میں نے خاموشی سے سُن لیا اور جو کچھ اجیت نے اُس کے بارے میں کہا تھا' اُسے بیان کر دیا..

اُس نے کچھ دیر اپنے غصے کا اظہار کیا لیکن اُس نے اس امر سے انکار نہ کیا کہ وہ بن بلائے اپنے خرچ پر یہاں آن پہنچا ہے۔اگرچہ پتہ نہیں کس چیف منسٹر کی گاڑی اُسے دو روز بعد اجمیر لے جا رہی ہے..اور اُسے ایسی تھرڈ ریٹ کانفرنسوں میں شرکت کی کچھ تمنا نہیں..
البتہ اُس نے کھلے دل سے یہ اقرار کر لیا کہ لاہور میں جو سارک ادیبوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اُس نے اس کے بارے میں پریس میں کچھ بیان دیے تھے کہ یہ لوگ..اجیت..کشور..فراز اور منو بھائی وغیرہ حکومتوں کے پٹھو ہیں..کوئی ذاتی ای میل تھی اجیت کے نام جو اُس نے کشور کو فارورڈ کر دی..اس لیے وہ اتنی سیخ پا ہو رہی تھی..

ادب میں کیسے کیسے فسادات اور سازشیں تھیں..چودھراہٹ کے کیسے قضیے تھے..میں ان سے آگاہ نہ تھا..

میرے لیے یہ ایک اجنبی سرزمین تھی..

میں روز روز یہاں آتا جاتا نہ تھا..

مقامی ادبی سیاست سے واقف نہ تھا..

نہیں جانتا تھا کہ ادب میں عزت نفس نام کی کوئی شے نہیں ہوتی..کوئی نہ بھی بلائے تو آیا جاتا ہے..

دوسرا دھچکا تب لگا جب میں نے ایک پاکستانی مندوب سے پوچھا کہ یار یہاں بہت سے ہندوستانی ادیب نظر آ رہے ہیں..زبیر رضوی' شمیم حنفی' افضال قاضی جوگندر پال نظر آ رہے ہیں لیکن جدید تنقید کے گورو اور میرے دوست گوپی چند نارنگ نظر نہیں آ رہے تو اُس نے ہونٹوں پر شہادت کی اُنگلی جما کر کہا "چپ تارڑ..یہاں نارنگ کا نام نہ لو..چپ.."

"پر کیوں چپ..وہ میرے دیرینہ دوست ہیں اور نہاری بہت شوق سے کھاتے ہیں۔"

"یار یہ الگ الگ گروپ ہیں..اجیت اور نارنگ..اس لیے چپ.."

یہ دوسرا دھچکا تھا..

پہلا عزت نفس کی پامالی کا اور دوسرا ادبی خانہ جنگی کا..

”کیا میں ایک بنیاد پرست‘ تنگ نظر ادیب ہوں؟“

منیر نیازی کو ایک زمانے میں جب ایک طویل مالی خشک سالی کے بعد کسی مشاعرے سے دو چار سو کا چیک وصول ہو جاتا تھا تو وہ کہا کرتے تھے کہ یار میں افراطِ زر کا شکار ہو گیا ہوں.. سمجھ میں نہیں آ رہا اتنی دولت کا کیا کروں..

تو جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں ان دنوں معاشرہ افراطِ ٹیلی ویژن چینلز کا شکار ہو چکا ہے اور ہر کس و ناکس کے آگے مائیک رکھ کر اُس سے اپنی من مرضی کے سوال پوچھے جاتے ہیں.. تو ایسے بے شمار چینلز کے میزبانوں نے اپنے مائیک میرے آگے بھی سرکائے... میں ذہنی طور پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کی بہتری کے بارے میں اپنا نکتہ نظر بیان کرنے کے لیے تیار ہوتا اور اُدھر سے اکثر و بیشتر بارود سے بھرے ہوئے سیاسی سوال داغ دیئے جاتے.. میں تو کھلے دل سے پاکستان کی خامیوں اور ناکامیوں کا اقرار کرتا.. جمہوریت کی رخصتی اور فوج کے راج کے بارے میں افسوس کا اظہار کرتا لیکن دوسری جانب کے دل اکثر بند ہی رہتے.. پھر میں کبھی کبھار اپنا دل بند کر لیتا‘ اُسے کھلا نہ کرتا.. ایک نہایت مسکین شکل کی معنک میزبان نے.. اور اگر میں اُس کی جگہ ہوتا تو شاید میں بھی.. ایسے ہی چُبھتے ہوئے سوال کرتا مجھے ایک کونے میں کھڑا کر کے سوالات کی بھر مار کر دی.. یہ ہندوستان کا اہم ترین نیوز چینل تھا.. سوال کچھ اس قسم کے ہوئے اور جواب بھی جتنا یاد رکھ سکتا تھا‘ اسی نوعیت کے دیئے گئے..

”پاکستان میں اظہار رائے کی پابندی ہے.. آپ کا پی ٹی وی صرف سرکاری

نکتۂ نظر پیش کرتا ہے..“

”بالکل درست فرمایا آپ نے.. پی ٹی وی یہی کرتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے اظہار رائے پر شدید پابندی ہے.. پاکستانی جو کچھ کہنا چاہتے ہیں‘ نہیں کہہ سکتے ہندوستانیوں کی طرح..“

”بی بی دنیا بھر کے حکومتی ٹیلی ویژن ہمیشہ حکومت کی طرفداری کرتے ہیں اور ان میں بی بی سی اور آپ کا دُوردرشن بھی شامل ہے.. یہ اُن کی مجبوری ہے لیکن پاکستانی ان دنوں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ کہہ رہے ہیں اور بہت کچھ کہہ رہے ہیں.. البتہ پرائیویٹ چینلز پر.. یقین کیجیے ہمارے ہاں فوجی حکومت اور سیاستدانوں کے بارے میں ایسے پروگرام بلاخوف و خطر چلتے ہیں.. جیسے شاید آپ کے ہاں بھی برداشت نہ کیے جاتے..“

”یعنی جنرل مشرف کی حکومت میں آپ کو اظہار رائے کی آزادی ہے؟“

”کم از کم پرائیویٹ چینلز پر تو بالکل ہے.. ماضی میں ہمیں ایسی آزادی کم ہی نصیب ہوتی ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جمہوریت کے خلاف جنرل مشرف کی حکومت کو بہتر سمجھتے ہیں؟“

”بی بی ایسا ہرگز نہیں ہے.. لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت برسوں بعد ہم کھل کر اپنی بات کر سکتے ہیں.. ایک پرائیویٹ چینل نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے عوامل کے بارے میں درجنوں نہایت حساس پروگرام آن ایئر کیے جن میں فوج پر شدید ترین تنقید کی گئی اور میں بھی ان میں سے دو پروگراموں میں مدعو کیا گیا تھا.. بنیاد پرستی کے بارے میں یہاں تک کہ نظریۂ پاکستان کی نفی کے بارے میں بھی..“

”یعنی آپ جنرل مشرف کو سپورٹ کرتے ہیں؟“

”میں عرض کر چکا ہوں کہ ہرگز نہیں.. اگر ہماری قسمت میں صرف جنرل لکھے ہیں تو کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم ایک ضیاء الحق کی بجائے ایک مشرف کو مجبوراً قبول کر لیں..“

”پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں دو صحافیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا.. آپ کیا کہتے ہیں؟“

"یقیناً بنایا گیا ہوگا..اور میں اس کی مذمت کرتا ہوں۔"

"اور پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں.."

"بی بی کیا آپ جانتی ہیں کہ مقبوضہ کا لغوی مطلب کیا ہوتا ہے..زبردستی قبضہ کرنا..کسی غیر ملکی فوج کا ایک ایسے علاقے پر قبضہ کرنا جہاں کے عوام اُنہیں قبول نہ کرتے ہوں..ہندوستان کی دس لاکھ فوج آپ والے کشمیر کے گلی کوچوں میں ہے..ہمارے والے کشمیر میں یقین کیجیے جتنی فوج ہے سرحدوں پر ہے' گلیوں بازاروں میں نہیں ہے.."

مسکین شکل کی مغنک میزبان مسکراتی رہی.."پاکستان جنگی جنون کو ہوا دیتا ہے..جارحیت کے عزائم رکھنے والا ملک ہے۔"

"بالکل ہے..لیکن مجھے آپ سے بھی ایک شکایت ہے..اتنے امن پسند ہونے کے باوجود آپ نے ایٹمی دھماکوں میں پہل کی..ہم نے تو نہیں کی..جواب میں ہم نے بھی اپنی تباہی کی قبر کھود لی۔"

"ہندوستان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ایک شاندار اور عظیم ملک..اور اُسے اپنے رویّے سے یہ ثابت بھی کرنا چاہیے..ہم جیسے ایک چھوٹے بے شک نٹ کھٹ ملک کے لیے فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے..جو نہیں ہوا..ہمیں تو آپ سے خطرہ ہو سکتا ہے لیکن آپ کو ہم سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے..جب جی چاہے آپ ہمیں روند سکتے ہیں۔آپ ایک ہاتھی ہیں لیکن دل ایک چڑیا کا رکھتے ہیں..اور ہم تو ہیں ہی ایک چڑیا۔"

"ایک ادیب سے تو ایسے بنیاد پرست رویّے کی توقع نہیں کی جا سکتی..آپ تو بہت ہی تنگ نظر ہیں۔"

"جی..آپ نے درست کہا..ایک ادیب کو یقیناً اپنے وطن کو برا بھلا کہنا چاہیے۔"

میں نہیں جانتا کہ یہ انٹرویو دوردرشن کی نیوز چینل پر آن ایئر گیا یا میری تنگ نظری کے باعث ڈراپ ہو گیا..

سارک ادیبوں کی کانفرنس میں جو مقالہ میں نے پڑھا اُس میں بھی بہت تنگ

نظری تھی اور اسے ایک قنوطی ردعمل کا نام بھی دیا گیا..اس میں فیض کا بھی ذکر آیا کہ

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ہم لوگ..برصغیر کے بندے جذبات کی رَو میں بہہ جانے والے بندے ہیں یا تو ایک دوسرے کے گلے کاٹتے ہیں اور یا ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگتے ہیں اور ہم کبھی بھی اعتدال کی راہ پر نہیں چلے..کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کوئے یار اور سُوئے دار کے درمیان میں کہیں ملاقات کر لیں..اور ایسی ملاقات کریں کہ وہاں ٹھہرے رہیں' وہاں سے پسپا نہ ہوں..پھر سے واپس نہ چلے جائیں..میں نے پچھلے پچاس برسوں میں خیر سگالی اور دوستی کے ایسے متعدد عارضی جوالا مکھی پھٹتے دیکھے ہیں اور پھر اُنہیں یکدم سرد ہوتے دیکھا۔دشمنی کے لاوے میں راکھ ہوتے دیکھا ہے..مجھے اب بھی یہی خدشہ ہے..میری خواہش ہے کہ ہم اعتدال کی راہوں کے مسافر ہو جائیں..کوئے یار اور سُوئے دار کے درمیان میں کہیں گلے ملیں اور وہیں قیام کر جائیں..

مجھے حیرت ہوئی جب بیشتر سارک ادیبوں نے میری اس "تنگ نظری" کو سراہا اور ایک مبصر کی حیثیت سے شامل ہونے والے انڈین ایئر فورس کے ایک سابق چیف ایئر مارشل لطیف اور اُن کی بیگم بلقیس نے بھی کچھ مدح کی..میرا دل رکھنے کی خاطر..جو کوئے یار سے نکلے تو..

''دیکھتے نہیں میں پوجا کر رہا ہوں..
اور کانفرنس کا آخری دن''

دلّی کی پہلی سویر تھی..

میں لودھی گارڈن سے لوٹا.. غسل خانے میں گیا تو احساس ہوا کہ ایک صبح کا آغاز کرنے کے لیے چند نہایت اہم اشیاء بھول آیا ہوں.. یعنی ٹوتھ برش.. ٹوتھ پیسٹ۔ صابن اور ٹشو پیپرز.. چنانچہ ان کے حصول کے لیے انڈیا سنٹر کے قریب ایک خان مارکیٹ میں گیا جہاں دوکانیں ابھی کھل رہی تھیں..

ایک دکان پر ''جین جنرل سٹور'' کا بورڈ آویزاں تھا.. میں اندر چلا گیا.. دوکاندار صاحب ایک کونے میں ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے اور میری آمد سے یکسر بیگانے کھڑے رہے.. میں نے قریب ہو کر اُن سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس ایک ٹوتھ برش ہو سکتا ہے یا ٹوتھ پیسٹ ہو سکتی ہے تو اُنہوں نے کچھ جواب نہ دیا اُسی حالت میں ساکت رہے۔ جب میں نے اپنی گزارش دہرائی تو اُنہوں نے گردن میں بل ڈال کر ناگواری سے مجھے دیکھا اور کہا ''دیکھ نہیں رہے کہ میں پوجا کر رہا ہوں۔''

یہ فقرہ اگرچہ بے حد سادہ تھا اور اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کوئی پیچیدگی نہ تھی۔ اس کے باوجود یہ میری سمجھ میں نہ آیا اور میں نے حیرت سے ایک ''جی؟'' کہا اور اُسی لمحے مجھ پر وارد ہوا کہ دراصل یہ فقرہ میری موجودہ ثقافت اور آس پاس میں نہیں، اجنبی ہے اس

لیے فوری طور پر مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکا.. میں ایسا فقرہ زندگی میں پہلی بار کسی فلم میں یا کتاب میں دیکھنے یا پڑھنے کی بجائے سُن رہا تھا کہ.. دیکھتے نہیں میں پوجا کر رہا ہوں.. اس فقرے نے دراصل مجھے پاکستان سے ہندوستان پہنچایا اور مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی نہیں کسی اور سرزمین پر ہوں.. میں مؤدب ہو کر ایک جانب کھڑا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا.. یہ انتظار کتنا طویل ہو سکتا تھا اس کا بھی مجھے قطعی اندازہ نہ تھا، جیسے شاید اس جین مت کے پیروکار کو ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھ کر بھی یہ اندازہ نہ ہو کہ یہ ''پوجا'' کتنی دیر جاری رہے گی.. میں نے کن اکھیوں سے دیکھا کہ شیلف میں سجی روزمرہ کی ضروریات کی اشیاء کے درمیان میں دو چھوٹے چھوٹے مجسمے رکھے ہیں اور دوکاندار اُنگلی سے اُن کے چہروں پر سرخ رنگ لگاتا ہے اور پھر کچھ پڑھتا ہے اور پھونکتا ہے..

پوجا کا دورانیہ ایک منٹ سے زائد نہ تھا.. میں نے برش اور ٹوتھ پیسٹ خریدتے ہوئے اُس کی نظروں میں وقعت حاصل کرنے کی خاطر اُسے بتایا کہ میں لاہور سے ہوں اور وہاں کا جین مندر شہر کے اہم مقامات میں شمار ہوتا ہے.. وہ یہ سن کر مسکرایا تک نہیں لاتعلق رہا.. جب میں نے ادائیگی کی تو اُس نے رقم کو پہلے اپنے بُتوں کے چرنوں میں رکھا اور پھر اُنہیں کیش بوکس میں ڈالتے ہوئے بھی کوئی دُعا وغیرہ کی.. دراصل میں آج کے دن اُس کا پہلا گاہک تھا، میں نے اُسے ''بوہنی'' کرائی تھی اور اس حوالے سے میری ادا کردہ رقم اُس کے لیے برکت کا باعث تھی.. البتہ میں اُس کے چہرے پر صاف پڑھ سکتا تھا کہ دن کے پہلے گاہک کے طور پر اُسے ایک غیر مذہب کے شخص کی آمد خاصی ناگوار گزری تھی لیکن وہ اتنا سیانا تھا کہ اُسے میری رقم ناگوار نہ گزری تھی..

بعد میں ولود سے جب میں نے اس خریداری کا تذکرہ کیا تو اُس نے مجھے بتایا کہ جین لوگ کامیاب ترین بیوپاری ہیں.. ویسے تو کیڑوں مکوڑوں کو سانس کے ساتھ اپنے منہ داخل ہونے سے روکنے کے لیے منہ پر کپڑا بھی باندھتے ہیں یہاں تک کہ اُن کے ایک مندر میں یہ اہتمام تھا کہ پانی کے نل کے اندر جو چمڑے کا ٹکڑا ہوتا ہے، اُسے نکال کر کہ وہ کسی جاندار کی کھال کا حصہ تھا اُس کی جگہ پلاسٹک نصب کیا گیا تھا.. اور اس کے باوجود جہاں تک

کاروبار کا تعلق ہے جین لوگ ہندوستان میں چمڑے کے سب سے بڑے سوداگر ہیں..

اسی خان مارکیٹ کے ایک پی سی او سے میں نے لاہور ٹیلی فون کیا اور ہندوستان بھر میں قدم قدم پر اس سہولت کا قائل ہوا جہاں آپ دنیا میں کہیں بھی فوری طور پر فون کر سکتے ہیں اور نہایت ارزاں کر سکتے ہیں.. آپ کے فون کی سکرین پر کال کا دورانیہ اور لاگت دکھائی دیتی رہتی ہے اور آپ حسب منشا بات کر سکتے ہیں.. دلّی کے پہلے دن کا میرے لیے سب سے اہم فقرہ یہی تھا کہ دیکھتے نہیں میں پوجا کر رہا ہوں جس نے مجھے پاکستان سے الگ کر کے ہندوستان میں لا کھڑا کیا..

دلّی میں.. بلکہ دلّی سے باہر انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں جو چند روز گذرے اُن میں میرا معمول یہ تھا کہ سویرے سویرے انتظار صاحب کی رفاقت میں لودھی گارڈن کے ٹریک پر ایک دو پھیرے.. کمرے میں واپس آ کر صبح کے معمولات سے فارغ ہو کر فوری طور پر سنٹر کی پہلی منزل پر واقع وسیع اور پُرفضا ڈائننگ روم کی ایک مخصوص میز پر ناشتہ قدم آدم شیشے کی کھڑکی کے پہلو میں لگی میز پر.. اور اس کھڑکی میں ہمہ وقت ہریاول اور پھول بھرے ہوتے تھے اور کبھی کوئی رنگین پرندہ بھی اس کے فریم میں داخل ہو جاتا تھا' کسی شاخ پر ٹھہر جاتا تھا اور میری آنکھوں میں بھی ٹھہر جاتا تھا اور پھر جب وہ اُڑان کر جاتا تھا تب بھی میری آنکھوں میں ٹھہرا رہتا تھا وہاں ایک گھونسلا بنا لیتا تھا..

کھڑکی کے شیشے سے جُڑی کرسی پر بیٹھے ہوئے نہ صرف لودھی گارڈن کا ایک کُنج ہرا بھرا سویر کی ہوا میں ہولے ہولے حرکت کرتا نظر آتا تھا بلکہ اس ڈائننگ ہال کے عین دامن میں جو ایک ٹھہرے ہوئے سبز پانیوں والا سجیلا تالاب تھا اور اُس میں جو بڑے بڑے پتے تھے کنول کے.. اور ان کے درمیان میں سے سر نکالتے جو شوخ گلاب رنگ کنول کھلے ہوئے تھے وہ میری اس سویر کو من موہنی کر دیتے تھے..

اگر مجھ پر بے جا رومانویت کا الزام نہ لگایا جائے تو میں ایک منظر بیان کرنا چاہتا ہوں.. ویسے لگا بھی دیا جائے تو چنداں قباحت نہیں۔ وہ منظر میری آنکھوں کے راستے بدن

کے کینوس پر ابھی تک نقش ہے اور اُس کے رنگ ابھی تک گیلے ہیں.. کھڑکی کے پار ایک خوش رنگ ہُد ہُد کہیں سے نمودار ہوا... پھڑ پھڑاتا ہوا ایک کنول کے اوپر کچھ دیر معلق رہا.. اور پھر اُڑان کی اور تالاب کنارے جو ہریاول گھنی تھی وہاں ایک جھکی ہوئی پانیوں کو تقریباً چھوتی لمبی شاخ پر جا بیٹھا.. شاخ اُس کے بوجھ سے لچکی اور جھولی.. ہُد ہُد نے اپنا توازن قائم رکھا.. دو تین جُھولے لے کر وہ پھر اُڑا اور کنول کے اُسی پھول کے گرد ہو گیا.. وہاں سے واپس اُسی شاخ پر آیا اور جُھولنے لگا.. یوں جُھولتے جُھولتے.. سہگل کی آواز میں جھولنا جھلا دَرے.. جھولتا جب کبھی اپنا توازن قائم نہ رکھ سکتا تو پھڑ پھڑاتا اور پھر سے اُڑ جاتا.. اسی کنول کے پھول کے آس پاس منڈلاتا اور اگلے لمحے لوٹ آتا اور لچکیلی شاخ پر براجمان ہو کر ہُلارے لینے لگتا.. یہ طے تھا کہ ہُد ہُد جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے اور اُس شاخ پر بیٹھ کر جُھولے لیتا ہے اور اُن سے لطف اندوز ہوتا ہے..

اور میرا ناشتہ.. کسی بھی پھل کا تازہ رس.. ایک فرائی انڈہ.. ٹماٹر کی ایک دو قاشیں' فرائی آلوؤں کا بھرتہ اور دو ٹوسٹ.. اور چائے کے بغیر تو نہیں اور ظاہر ہے یہ ایک رنگین پرندوں سے بھرا اور ہریاول سے نچڑتا ہوا زندگی بخش ناشتہ ہوتا..

فارغ ہو کر نیچے اُسی تالاب کے کنارے آ بیٹھتا اور دن کا پہلا اور سب سے جادو بھرا پہلا سگریٹ پیتا.. صرف اس پہلے سگریٹ کی وجہ سے آپ بقیہ دن درجنوں بے کیف اور بے وجہ سگریٹ پھونکتے ہیں..

کمرے میں واپس آ کر کچھ دیر نیند کرتا.. صبح کی سیر کی کچھ تھکن اُتارتا اور پھر ایک تازہ اور البیلے ذہن کے ساتھ.. اُس روز کے کانفرنس کے شیڈول کا مطالعہ کرتے ہوئے کانفرنس ہال میں جا بیٹھتا..

کسی بھی کانفرنس میں چاہے وہ کتنی ہی بین الاقوامی اور اہم کیوں نہ ہو میرے لیے ایک نشست پر بندھ کر پہروں بیٹھے رہنا ایک کڑا امتحان ہوتا ہے.. اور میں پہلو بدلتا رہتا ہوں.. کبھی واش رُوم جانے کے بہانے اُٹھتا ہوں اور کبھی ایک سگریٹ پھونکنے کا جواز تلاش کر لیتا ہوں.. مجھے رشک آتا ہے اُن لوگوں پر.. جو کیسی دل جمعی سے اور دانشورانہ سنجیدگی چہروں پر

سجائے نہایت مگن بیٹھے رہتے ہیں اور بیٹھے ہی رہتے ہیں..البتہ معمول کے مقالوں اور معانی کھو چکی دانش کے مسلسل تذکروں سے جدا کبھی کوئی ایسا شخص بھی سٹیج پر آ جاتا ہے جسے آپ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں اور بہت کچھ سیکھتے ہیں..

چائے یا کھانے کا وقفہ ہوتا تو میں باہر آ کر سنٹر کے صحن میں واقع ایک ممتاز مجسمہ ساز کے مجسموں کی قربت میں ایستادہ اُن درجنوں پوسٹرز اور اعلانات کو بصد حسرت دیکھتا جن میں دلّی کے درجنوں تھیٹر ہالوں میں دکھائے جانے والے کھیلوں کی اطلاع ہوتی..نہ صرف دلّی بلکہ ہندوستان بھر سے آئے ہوئے معروف موسیقاروں' رقاصاؤں اور گویوں کے جو کانسرٹ منعقد ہو رہے تھے اُن کی خبر ہوتی۔ صرف یہی نہیں بلکہ درجنوں غیر ملکی.. جرمن۔ ایرانی' روسی۔ ترکی یا برازیلین ثقافتی گروپس کے مظاہروں کی بھی اطلاع ہوتی۔ علاوہ ازیں آرٹ فلموں کے خصوصی شوز اور فلسفیانہ مباحث کے پوسٹر بھی آویزاں ہوتے..

اور میں ان کو بصد حسرت دیکھتا..

کہ میں اس دنیا سے منقطع ہو چکا تھا..

اور ان ہندوستانیوں کا کل دنیا سے رابطہ تھا..

میرے ہاں ایسے رابطے عریانی اور فحاشی کے ضمن میں آتے ہیں۔ ڈنڈہ بردار طلباء تنظیمیں میدان عمل میں آ جاتی ہیں..

ایک روز سنٹر کے اسی صحن میں ایک لاٹھی ٹیکتے عمر رسیدہ شخص سے ملاقات ہو گئی جس نے بتایا کہ یہاں جو مجسمے آویزاں ہیں وہ اُن کا خالق ہے..ہمارے درمیان تعارف تو ہوا لیکن مجھے اُس مجسمہ ساز کا نام یاد نہیں رہا..کیا یہ ایک المیہ نہیں کہ ہم بھی..اور وہ بھی..دنیا بھر کے ناول نگاروں..موسیقاروں اور مصوروں کو جانتے ہیں..اُن کی تخلیقات پڑھتے ہیں' تصویریں دیکھتے ہیں' دھنیں سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں لیکن یہ جو سرحد کے اس جانب ہیں اور اُس پار ہیں ان کو نہیں جانتے..ایک دوسرے کی تخلیقات سے ناواقف ہیں..وہ تو بہت ہی ناواقف ہیں کہ ہم تو اُن کے ایم ایف حسین کو جانتے ہیں لیکن وہ ہمارے خالد اقبال اور سعید اختر کو نہیں جانتے..نہیں' ہم بھی ناواقف ہیں بہت' حسین کو صرف اس لیے جانتے ہیں

کہ وہ دو ایک بار لاہور تشریف لائے اور مادھوری ڈکشت کے باعث ہمیں ذرا عزیز ہوئے.. اُنہوں نے مجھے ایک نہایت غیر معمولی تصویر سے نوازا جو میری سٹڈی کی زینت ہے.

انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے کیفے ٹیریا میں باقاعدگی سے نشست کرنے والے کچھ لاہوری بابے ہیں جو وہاں "لاہوری گروپ" کے نام سے جانے جاتے ہیں..کوئی غیر لاہوری ان کی محفلوں میں شامل نہیں ہو سکتا..یہ پرانے لاہور اور اُس میں گزرے ہوئے زمانوں کو یاد کرتے ہیں اور ابھی تک دلّی سے مفاہمت نہیں کر پائے..میں نے ان کا کھوج لگایا تو ان کے ٹیم لیڈر نول پران سے ملاقات ہو گئی جنہوں نے لاہور کے بارے میں ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے..وقت کی کمی اور بے وجہ بھاگ دوڑ کے باعث میں اس گروپ کی رفاقت سے محروم رہا..

ایک روز جوگندر پال ملنے کے لیے آ گئے.."نادید" اور "کو دو بابا کے مقبرے" والے جوگندر جو مختصر افسانے میں سند کا درجہ رکھتے ہیں اور ہندوستان میں میرا چرچا بہت کرتے ہیں.."بہاؤ" اُنہی کے توسط سے ہندوستان میں پڑھا گیا..وقت اُن پر اثر انداز ہو چکا تھا اور کیوں نہ ہوتا وہ بھی تو وقت پر اثر انداز ہوتے رہے تھے..البتہ اُن کی بیگم ابھی اس اثر سے باہر تھیں خط و کتابت کے لیے خشونت سنگھ کی مانند جوگندر بھی پوسٹ کارڈ کا استعمال کرتے ہیں..

شمیم حنفی کے کاندھوں پر شاید اب بھی وہی رنگین تھیلا تھا جو آج سے پچیس برس پیشتر جب وہ لاہور آئے تھے' تب اُن کے کاندھوں پر تھا..وہ مجھے میری جوانی یاد دلاتے تھے جو میں بھول چکا تھا..اُن دنوں کا بار بار تذکرہ کرتے جب ٹیلی ویژن پر ایک اداکار کے طور پر میرا ایک سیریز بہت ہٹ ہوا تھا اور میں ایک عارضی سا سپر سٹار ہو گیا تھا..اُن کا کہنا تھا اور مجھے واقعی یاد نہ تھا کہ تم ایسے پسندیدہ تھے کہ اپنا سرخ ہونڈا موٹر سائیکل پارک کر کے کہیں جاتے تھے تو واپسی پر اُس پر لپ سٹک کے نشان ہوا کرتے تھے..وقت وقت کی بات ہے اب ہم بقلم خود ذاتی طور پر کہیں پارک ہو جائیں اور پہروں پارک رہیں تب بھی کوئی نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتا..شمیم ہمارے مشترکہ دوست شکاگو کے سی ایم نعیم کو بہت یاد کرتے رہے جو

میری گوالمنڈی کی دوکان پر پہروں براجمان رہتے‘ دنیا بھر کے ادب کے بارے میں گفتگو کرتے اور کبھی میرے ملازم کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر اپنی کتابیں پیک کرنے لگتے..شمیم کی شخصیت کو میں اردو کی محدودیت میں کچھ بیان نہیں کرسکتا..البتہ انگریزی میں بلکہ لنڈن کے کاکنی لہجے کی انگریزی میں ایسے شخص کو LOVEY- DOVEY کہا جاتا ہے اور اس کا اردو ترجمہ اگر ہوسکتا ہے تو پیارا اور فاختہ ایسا شخص ہی ہوسکتا ہے..

یہاں پروفیسر افضال قاضی بھی نظر آتے رہتے..وہ دن رات اسی جستجو میں جتے ہوئے تھے کہ پاکستانی لکھنے والوں کو سرکار سے اجازت حاصل کر کے ایک روز کے لیے اپنی یونیورسٹی علی گڑھ لے جائیں..وہ نہ لے جاسکے کہ دوستی کے شور کے باوجود سرکار ابھی اتنی نرم دل نہ ہوئی تھی..اُنہوں نے لاہور میں منعقد ہونے والی سارک کانفرنس کے دوران اردو فکشن کے بارے میں پڑھے جانے والے اپنے مقالے میں صرف ’’راکھ‘‘ کا ذکر کیا تھا اور ہم ایک دوسرے سے قطعی طور پر ناواقف تھے.. پتہ نہیں یہ ذاتی حوالہ اُن کے حق میں جاتا ہے یا خلاف..

بمبئی سے باقاعدگی سے اور برسوں سے شائع ہونے والے ادبی جریدے ’’شاعر‘‘ کے مدیر مظہر امام اتنے عمر رسیدہ ہوگئے تھے کہ مجھ سے پہچانے نہ گئے..برسوں پیشتر جب وہ لاہور آئے تھے تو اُن سے کیسی کیسی ملاقاتیں ہوئی تھیں..

کانفرنس میں غلام محمد شیخ بھی شریک تھے..وہ نہ صرف ہندوستان کے اہم ترین مصوروں میں شمار ہوتے تھے بلکہ شاعر بھی تھے۔اُنہوں نے جو مقالہ پڑھا وہ ذرا صبر طلب تھا لیکن اُس میں پتے کی بہت سی باتیں تھیں‘ وہ نئے اور گذرے ہوئے زمانوں کا ادراک رکھتے تھے..انہوں نے ’’آوارہ گرد‘‘ ’’سرحدوں کے پار‘‘ ’’کہت کبیر‘‘ اور ’’سراب‘‘ جیسی شاہکار تصویریں تخلیق کی ہیں..

یہاں اپنی دھوتی اور کُرتے میں دراز قامت نامور سنگھ بھی تھے جو لاہور کانفرنس میں بھی شریک ہوئے تھے..ہم اُن کے قدرے احتیاط پسند مداح تھے..وہ قدیمی دانش کا ایک سمندر تھے لیکن اُس میں ایک ایسی محدودیت تھی جو اُسے ایک تنگ جھیل بنا دیتی تھی..

اُنہوں نے پوری کانفرنس پچھلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے بسر کر دی اور یوں اُن سے تفصیلی ملاقاتیں نہ ہوسکیں..

اگرچہ اس کانفرنس میں ہندوستانی ادیبوں سے کہیں بڑھ کر میں بنگلہ دیشی ادیبوں سے ملاقات کا متمنی تھا لیکن وہ ہم سے کھنچے کھنچے دور دور رہتے تھے.. پاس آتے تو ہم اُنہیں بتاتے کہ صرف ہماری نسل کے باعث تو ہم سے نفرت نہ کیجیے..ہم سب ایک جیسے تو نہیں تھے اور آپ ہمیں ایک جیسے ہی سمجھتے ہیں..ہمارے سینے پر بھی آپ کی جدائی کا ایک گھاؤ ہے جو مندمل نہیں ہوتا...آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں..تو ہائے گُل پکار میں پکاروں ہائے دل..عندلیب تُو کبھی میرا ناول ’’راکھ‘‘ تو پڑھ کہ میں نے تمہارے دکھ درد کو کیسے بیان کیا ہے‘ کیسے محسوس کیا ہے..یونہی بیٹھے بٹھائے.. پاس آئے بغیر...اپنی اور ہماری سنے بغیر ہم سب کو قابل گردن زدنی قرار دینا تو کچھ انصاف نہیں..غیروں سے کہا تم نے..غیروں سے سنا تم نے..کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا..

کانفرنس کا آخری دن تھا..

عین اُس لمحے جب میں متعدد صدور میں سے ایک صدر تھا یعنی پریذیڈیم میں براجمان تھا‘ اجیت اُڑتی ہوئی آئی ’’تُوں کیہہ پڑھیں گا؟‘‘

’’میں نے کیا پڑھنا ہے..میں تو صدارت کے عہدے پر فائز ہوں۔‘‘

’’نہیں..تم نے کچھ نہ کچھ پڑھنا ہے۔‘‘

’’میں اپنا مقالہ جو پڑھ چکا ہوں..تم نے مجھے پہلے کہا تھا کہ مجھے کچھ پڑھنا بھی ہے؟‘‘

’’تم جُھنے کا کے ہو..یہ نہیں جانتے کہ سب لوگ کچھ نہ کچھ پڑھ رہے ہیں..اور میں تمہیں بتاتی کہ کچھ پڑھنا ہے..‘‘

’’میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘

’’کوئی کویتا ہی پڑھ دو..‘‘

"اجیت.. تم کیسی جاہل خاتون ہو کہ یہ بھی نہیں جانتی کہ میں شاعری وغیرہ نہیں کرتا۔"

"تو جو کچھ بھی کرتے ہو وہ پڑھ دو.. کوئی لکھت کوئی کہانی کچھ بھی پڑھ دو۔"

یہ ساری گفتگو سرگوشیوں میں ہوئی..

اب میں اس لکھت پڑھت کے لیے تیار ہی نہ تھا.. ورنہ کوئی چناؤ کر لیتا.. میرے ہمہ وقت کے ساتھی.. میرا پاسپورٹ.. انڈین کرنسی اور ڈالر سنبھالتے ساتھی اِکیا کے سیاہ بیگ میں "بہاؤ" کی ایک کاپی تھی جس کے اوراق میں نے اُلٹ پلٹ کیے کہ کونسا باب پڑھوں لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا اور میں نے اُس کا پہلا باب.. مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر پڑھ دیا.. اہل کانفرنس اتنے فراخ دل تھے کہ اُنہوں نے کویتاؤں اور شاعریوں کے ہیجان کے بعد میری نثر کے مدھم ٹھہراؤ کو بھی قبول کر لیا اور بچے کھچے واد کے ڈونگرے مجھ پر برسا دیے..

تقریباً ایک برس بعد غزالہ سلطان دلّی گئیں تو اُن کی ملاقات ایک معروف شاعرہ سے ہوئی جو وہاں کے ایک بہت مہنگے اور وسیع سکول کی پرنسپل تھیں.. اُنہوں نے کہا کہ سارک کانفرنس میں میں بھی شریک تھی اور میں نے وہاں اپنی شاعری بھی سنائی تھی اور وہاں میں نے کسی بہت ہی مشکل نام والے پاکستانی ادیب کی ایک تحریر سنی تھی جو کسی پرندے کے بارے میں تھی.. ایسی تحریر تو میں نے پہلے کبھی نہیں سُنی.. وہ کون ہیں.. کیا اُن سے ملاقات ہو سکتی ہے اگر میں پاکستان آؤں تو..

اشوک واجپائی جن سے لاہور میں ایک سرسری آنی جانی ملاقات ہوئی تھی جو بعد میں کسی کو یاد نہیں رہتی.. اور یہاں دلّی میں بھی سلام دعا ہوتی رہتی تھی لیکن وہ بھی پہلی بار فرینک ہو گئے.. وہ اتنے معروف ہیں کہ ہر کس و ناکس کو خاطر میں نہ لاتے تھے کہ "کہیں نہیں.. یہیں" ایسے شعری مجموعے کے خالق تھے اور وہ بھی مجھے خاطر میں لے آئے "تارڑ صاحب.. میں نے آج تک کسی بھی ناول کا ایسا آغاز نہ پڑھا نہ سنا.. آپ تو شاعر ہیں۔"

مجھے اس موازنے سے ہمیشہ چڑ رہی ہے.. کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر شاعری بلند

درجے پر فائز ہوتی ہے تو وہ موثر نثر کی صورت اختیار کر جاتی ہے نہ کہ..

"میرے لیے سب سے تکلیف دہ یہی کامنٹ ہے.. میں نثر کو شاعری سے بہت افضل جانتا ہوں.."

"اور آپ نے ثابت کر دیا ہے۔" یہ اشوک واجپائی نے کہا۔

اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ ہندوستان میں جو نثر لکھی جا رہی ہے وہ بہت کمزور ہے کہ میری نثر بھی تو بہت لاغر ہے۔

کانفرنس کا آخری دن تھا۔

کشور نے سب کو اطلاع کر دی تھی جو ایک دھمکی کی صورت میں تھی کہ خبردار کل کوئی اِدھر اُدھر ہوا تو.. کل بروز اتوار ہم عینی آپا کے ہاں کھانے پر جا رہے ہیں.. اور تم.. تارڑ.. تم نے ہر صورت جانا ہے کہ عینی آپا نے خاص طور پر تمہارا پوچھا تھا..

لیکن ہمارے ارادے کچھ اور تھے..

ڈاکٹر انوار احمد اور اصغر ندیم سیّد کو میں نے پھانس لیا تھا اور ہمارے ارادے یہ تھے کہ ہم کل آگرہ جا رہے تھے.. تاج محل دیکھنے جا رہے تھے.. بے شک عینی تاج سے کم نہ تھیں لیکن ایک مرتبہ دیکھی جا چکی تھیں۔ اگرچہ دوسری بار دیکھنے کی ہوس تھی لیکن تاج محل تو ایک بار بھی نہ دیکھا تھا اور اُس کے دیکھنے کی ہوس سوا تھی..

شاہ جی کی بھاری مونچھوں پر عمر کی برف دھیرے دھیرے اُتر رہی تھی اور وہ اُنہیں تاؤ دیتے ہر قسم کی معلومات سے لیس تھے "تاج ایکسپریس تو بہت سویرے سویرے نکل جاتی ہے اور اُس کے لیے ایڈوانس بکنگ بھی درکار ہے.. پرائیویٹ بسوں میں بہت خواری ہوتی ہے اس لیے میں نے ایک جیپ والے سے بات کی ہے کہتا ہے ایئر کنڈیشنڈ ہے آنے جانے کے چھ ہزار مانگتا ہے۔"

"یار چھ ہزار تو بہت زیادہ ہیں.. پاکستان روپوں میں آٹھ نو ہزار ہو جائیں گے۔"

"ڈھائی ڈھائی ہزار فی بندہ پڑ جائیں گے.. اتنے روپوں میں تاج محل برا ہے کیا.."

"اچھا بھی نہیں..میں نے نہیں دیکھنا۔"

میں نے یونہی مذاق میں کہا تھا لیکن شاہ جی باقاعدہ روٹھ گئے اور پرے پرے ہونے لگے..تب میں اُن کے قریب قریب ہوا "سیّد بادشاہ..اپنے پلّے میں سلک کی ساڑھیاں خریدنے کے بعد جتنے ڈالر بچ گئے ہیں سب کے سب لٹا دیں گے تاج محل پر..تم سودا کرو۔"

چنانچہ شاہ جی غائب ہو گئے..

"دلّی کے آسمان سے میرے ذاتی جن کا نزول"

یہ کانفرنس کا آخری دن تھا..

پچھلے پہر کی چائے کا وقفہ تھا..اور میری چائے پیالی میں ٹھنڈی ہو رہی تھی' میں اُسے تب سُڑکتا اگر مسلسل بولنے میں کوئی وقفہ آتا تو..ٹیلی ویژن چینلز کے میزبانوں میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی کہ یہ ادبی پرندے پھر کہاں ہاتھ آئیں گے..کل کو بھوٹان' نیپال' بنگلہ دیش' پاکستان اُڑ جائیں گے..ان کی چہچہاہٹ ریکارڈ کر لو..اُن کو کچھ پروا نہ تھی کہ پرندے بے چارے مسلسل بول بول کر بیان دے دے کر نڈھال ہو چکے ہیں' اُن کے حلق خشک ہو چکے ہیں چونچیں سوکھ رہی ہیں تو انہیں ایک آدھ گھونٹ چائے کا پی لینے دیا جائے..ایک انٹرویو اپنے آخری سانسوں پر ہوتا تو دوسرا منتظر میزبان آپ کی گردن پر سانس لینے لگتا..اس دوران ایک درمیانے قد کے عینک سنبھالتے خاکی شکاری جیکٹ اور جین میں ملبوس صاحب میرے قریب ہوئے۔

"تارڑ صاحب..مجھے آپ کے صرف پانچ منٹ درکار ہیں..پلیز"

"جی میں ان سے فارغ ہو کر حاضر ہوتا ہوں"

وہ ایک آرام دہ گارڈن چیئر پر دراز ہو کر اطمینان سے انتظار کرنے لگے..

اس انٹرویو سے فارغ ہوتے ہی میں تیر کی طرح اُن کے پاس گیا تا کہ راستے میں مجھے اور کوئی نہ دبوچ لے..اور یاد رہے کہ یہ ٹی وی میزبان صرف مجھ پر ہی مہربان نہیں ہو رہے تھے کانفرنس میں جو بھی شریک تھا' اُس کے گرد ہو رہے تھے یہاں تک کہ وہ سردار

صاحب جو ہمیں ایئرپورٹ پر وصول کرنے آئے تھے اور سنٹر میں ملازمت کر رہے تھے' اُن کے بھی انٹرویو کیے جا رہے تھے..

''جی فرمایئے..'' میں نے خاکی جیکٹ والے عینک سنبھالتے صاحب سے کہا جو مجھے دیکھ کر آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے..''آپ کے پانچ منٹ شروع ہو گئے ہیں۔''

''میں صرف ایک منٹ میں ہی بتا سکتا ہوں کہ میں آپ کو پچھلے پندرہ برس سے پی ٹی وی پر دیکھ رہا ہوں..آپ میری پسندیدہ شخصیت ہیں اور آپ سے میزبانی کے کچھ آداب میں نے بھی سیکھے ہیں۔''

دلّی میں پہلی بار کسی نے میری اس نوعیت کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ چنانچہ اس قدر دانی پر خوش ہو کر میں فوراً اُن کے برابر میں بیٹھ گیا۔''آپ کیا کرتے ہیں؟''

''میرا تعلق بھی میڈیا سے ہے..اور میرا نام ونود دُعا ہے..''

''دُعا؟''

''جی''

''آپ شاعر ہیں؟'' میں نے ہراساں ہو کر پوچھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُنہوں نے اپنی شاعری سنانے کے لیے مجھے گھیرا ہے اور اتنی توصیف کی ہے..

''جی نہیں..'' وہ مسکرانے لگے''دُعا میرا تخلص نہیں' ہم ہندو کھتریوں کی ایک ذات ہے.. ویسے لکھا اردو دعا کی طرح ہی جاتا ہے..اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو میری خواہش ہے کہ ہم بار میں چل کر جوس وغیرہ پئیں۔''

''میں دن کے وقت تو جوس ہی پیوں گا البتہ آپ ''وغیرہ'' پی لیجیے گا۔'' میں نے فوراً ہامی بھر لی..ایک تو شکاری جیکٹ والے دعا بھی مجھے ایک اچھی روح لگتے تھے لیکن دراصل میں اُس ہجوم سے اور خاص طور پر ٹی وی کیمروں سے فرار ہونا چاہتا تھا..

اُس لمحے مجھے ذرہ برابر شک نہ ہوا کہ یہ ونود دُعا دراصل ایک جن ہے جو دلّی کے آسمانوں سے خصوصی طور پر میرے لیے اُترا ہے' میری ہر خواہش پوری کرنے کے لیے اور اُسے حاضر کرنے کے لیے مجھے کسی چراغ کو رگڑنے کی بھی حاجت نہ تھی کہ وہ غائب ہی نہ

ہوتا تھا' ہمہ وقت حاضر رہتا تھا اور مجھے عاجز کر دیتا تھا پوچھ پوچھ کر کہ مالک اب کیا حکم ہے..خواہش کی کس پری کو لاؤں..کونسا جادوئی قلعہ دکھلاؤں اور کس شیش محل میں لے جاؤں..

ولیم ڈل رمپل میرا چہیتا سفرنامہ نگار ہے اور میں نے اس کے پہلے سفرنامے ''زے ناڈو کی تلاش'' سے لے کر ''وہائٹ مغل'' تک کو پڑھا ہے اور اُس کی تخلیقی نثر تاریخی شعور اور خاص طور پر مشرق کو مغرب کے تعصب سے یکسر آزاد ہو کر سمجھنے اور ہمدرد ہونے کی خصلت کا معترف ہوں..دلّی کے بارے میں اُس کی کمال کی جو کتاب ہے اُس کا نام ہے''جنوں کا شہر''..یہ ونود بھی غالباً اُنہی جنوں میں سے ایک تھا اگرچہ قدرے مختصر قد کا جن تھا..

بے شک وہ مجھ سے نہایت عاجزی اور برخورداری سے ملا تھا لیکن بعد میں کُھلا.. اور اُس نے اپنے آپ کو نہیں کھولا میں نے تردد کر کے اُسے کھولا تو معلوم ہوا اُس کا ایک ذاتی پروڈکشن ہاؤس ہے دلّی کے اُس علاقے میں جہاں پراپرٹی کی قیمت نیویارک کے مین ہٹن سے بھی بلند ہے..اور وہ پورے ہندوستان میں ایک جانا مانا ٹیلی ویژن میزبان ہے..لیکن یہ سب دھیرے دھیرے آشکار ہوا جب بار میں داخل ہونے والا ہر شخص اُسے پہچان لیتا اور بازاروں میں خواتین اُس کے گلے لگ جاتیں..میں خاصے حسد میں مبتلا ہوا اس لیے نہیں کہ ہر شخص اُسے پہچان لیتا تھا بلکہ اس لیے کہ خواتین گلے لگ جاتی تھیں.. پاکستان میں مجھے دیکھ کر خواتین کھسر پھسر کرتی تھیں کہ ''ہائے تارڑ جا رہا ہے'' یا کبھی مسکرا دیتی تھیں لیکن اس سے آگے کچھ نہیں۔ اگر یہ رواج گلے لگنے کا پاکستان میں بھی چل نکلے تو میرا کتنا بھلا ہو جائے..عمر کے اس آخری حصے میں..لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت..ونود حال ہی میں پاکستان سے لوٹا تھا جہاں وہ صحافیوں اور میڈیا کے لوگوں کے ہمراہ ایک وفد کے ساتھ گیا تھا..بقول اُس کے اُس نے صدر پرویز مشرف کی دعوت کے دوران خیر سگالی کے جذبے کے تحت اُن کے گلے میں ایک سہ رنگا مفلر ڈال دیا تھا اور وہ تین رنگ ہندوستانی ترنگے کے تھے اور پھر کہا تھا کہ جنرل صاحب یہ رنگ آپ کو سُوٹ کرتے ہیں..جنرل صاحب یقیناً مخمصے میں پڑ گئے

ہوں گے کہ اس ترنگے مفلر کو اُتارتا ہوں تو ہندوستان کے ساتھ یکدم دوستی کے دعووں پر زد پڑتی ہے اور اگر نہیں اُتارتا تو ایک روایتی دشمن ملک کا پرچم گلے لگائے ہوئے ہوں جس کے ایک وزیراعظم کی پاکستان آمد پر میں نے اُسے سلیوٹ کرنے سے انکار کر دیا تھا..

ونود بھی ہر دوسرے دِلّی وال کی مانند لاہور کا دیوانہ تھا.. لیکن اُس کی دیوانگی کے سبب صرف انارکلی' مال روڈ اور فوڈ سٹریٹ ہی نہ تھے ہیرامنڈی سے بھی منسلک تھے.. کیا خوش بخت شخص تھا جو آیا بھی دلّی سے 'ذات کا بھی کھتری اور باقاعدہ پان کھا کر' عطر لگوا کے' گلے میں گیندے کے ہال ڈال کر بقول اُس کے برصغیر کا سب سے ہیجان خیز مجرا دیکھتا ہے' بابر کی مانند عیش کر جاتا ہے اور ایک ہم تھے' لاہور کے باسی.. اتنے قدیمی کہ باسی ہو چکے باسی اور اس کے باوجود آج تک یہ سعادت حاصل نہ کر سکے.. حالانکہ اہل ہنود میں سے نہ تھے وہاں کی شرمیلی خواتین کے ہم عقیدہ تھے.. اسے کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا..

ویسے یہ کھتری بھی نام کا کھتری اور نام ہی کا ہندو تھا.. ذوق جمال اُس کا سراسر 'شُدھ مسلمان' اردو اور پنجابی تھا.. موقع محل کی نسبت سے غالب اور میر کے حوالے دیتا اور اکثر بلھے شاہ کی کافیاں الاپتا.. موسیقی اُس کے رگ و پے میں رچی ہوئی تھی' وہ نہ صرف اپنی دُکھ بھری مناسب آواز میں مہدی حسن کی غزلیں گا سکتا تھا بلکہ ایک بار جب وہ پورے جوش وخروش سے ''ساتھیو' مجاہدو جاگ اُٹھا ہے سارا وطن'' گانے لگا تو میں قدرے شرمندہ ہوا اور کہا کہ ونود بھیا یہ تو 1965ء کی ہند و پاک جنگ کے دوران کا مقبول گیت ہے اور آپ لوگوں کے کچھ کچھ خلاف جاتا ہے تو آپ اسے کیوں اتنے جوش اور جذبے سے الاپ رہے ہیں تو اس نے ''آج ظالم مظلوم سے ٹکرا جائیں گے'' کے درمیان وقفہ کیا اور کہنے لگا ''تارڑ صاحب اس کی دھن بڑی زبردست ہے.. میں رہ نہیں سکتا.. اور ابھی یہ فیصلہ کہاں ہوا ہے کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم..''

یعنی ونود.. دیوانہ بہ کارِ خویش ہوشیار است.. کی ایک مثال تھا..

وہ پاکستان سے لوٹا تو اُس کے سامان میں پورے سترہ کلو وزن جو تھا وہ پاکستانی موسیقی کی کیسٹوں کا تھا.. میں اُس کے اس بیان کو شاید شک کی نظر سے دیکھتا لیکن جب اُس

نے بتایا کہ ان میں نصرت فتح علی خان اور عابدہ پروین کی کیسٹیں بھی شامل تھیں تو مجھے یقین آ گیا کہ یہ وزن دار گلوکار تھے..

مجھے کبھی کبھی یہ بھی گمان گزرتا کہ وہ انڈین ''را'' کا ایجنٹ ہے۔ اس شبہے کو تقویت اس وقت ملی جب آخری روز دلّی کی ایک شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے اُس نے ایک ایسی عمارت کی جانب اشارہ کیا تھا جس کی پور پور میں سے ایریلز اور اینٹنے بلند ہو رہے تھے اور کہا ''تارڑ صاحب.. یہ ''را'' کا مرکزی دفتر ہے۔''

ویسے یہ بھی میرے لیے فخر کا ایک مقام تھا کہ ہر کس و ناکس کے لیے تو ''را'' کسی ایجنٹ کو متعین کرتی ہے اور میرا پیچھا کرنے کے لیے اُس نے ایک جن بھرتی کر لیا تھا..

"صدّام حسین اور مہاتما گاندھی کے پوتے راموگاندھی سے ملاقات"

ہم ڈھلتی دوپہر میں انڈیا انٹرنیشنل کے خانہ خراب میں آئے تھے اور وہاں بیٹھے بیٹھے رات ہوگئی اور جُوس روپوش ہو کر..وغیرہ..میں بدل گیا۔

کیا دیکھتے ہیں کہ پہلے سے بھری ہوئی بار میں.. پیک شدہ مے خانے اور ریستوران میں ایک دراز قد بھاری تن و توش کے مالک حضرت ملتانی کُرتے اور پاجامے میں ملبوس داخل ہوتے ہیں..اپنی دراز قامتی کے باعث ذرا جھولتے ہوئے اور وِنود کو دیکھ کر مزید جھولتے ہوئے ہماری جانب آتے ہیں..

میں نے اُنہیں دیکھا تو ٹھٹک گیا..کہ یہ تو امریکیوں کی قید میں تھے..آزاد ہو کر یہاں کیسے آگئے..

وِنود نے میری حیرت اور بے یقینی کو بھانپ لیا اور ایک کنجوس مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہ ذات کا بنیا تھا' بولا "تارڑ جی..یہ میرے یار ہیں..جھنگ کے رہنے والے ہیں ملک صاحب۔"

میں نے دراز قامت ملک صاحب کے ساتھ ہاتھ ملایا..اور اُن کا ہاتھ ایک بڑا ہاتھ تھا..

"صنعت کار ہیں۔ان کے بہت سے بیوپار ہیں' فارم ہاؤس ہیں اور بہت سے گھر ہیں۔"

"جی.."

وِنود نے نہایت مبالغہ آمیز میرا ایک تعارف کروایا لیکن ملک صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"آپ نے نوٹ کیا کہ یہ صدام حسین کے ہو بہو ہیں؟"

میں اسی لیے تو ٹھٹکا تھا..حیرت زدہ اور بے یقین ہوا تھا کہ موصوف ملک صاحب بن کر میری آنکھوں میں دُھول جھونک رہے تھے اور دراصل صدام حسین تھے۔ "جی..ہو بہو۔"

"ہم نے منصوبہ تو یہی بنایا تھا کہ انہیں امریکیوں کے حوالے کر کے پچیس ملین ڈالر کا انعام حاصل کیا جائے..بعد میں جب اصل صدام پکڑا جائے گا تو امریکی انہیں چھوڑ دیں گے اور ہم دونوں یہ رقم آپس میں بانٹ لیں گے لیکن اصل صدام نے ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا' اس سے پیشتر کہ ہم انہیں پیش کرتے وہ پیش ہو گیا۔"

ملک صاحب نے ایک صدامی مسکراہٹ لبوں پر بکھیری جیسے وہ یہ منصوبہ وِنود سے اکثر سُنا کرتے ہوں.. گھنی بھنویں' وہی قد کاٹھ' گھنگھریالے بال' پُروجاہت اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والا بے شک اُس کی سلطنت غصب کر لی جائے' بیٹے بیدردی سے ہلاک کر دیے جائیں پھر بھی کسی ایرے غیرے کو خاطر میں نہ لانے والا چہرہ..ہو بہو وہی تھا..

بقیہ شام کے دوران بھی مجھے شک ہی رہا کہ ان امریکیوں نے کسی جعلی صدام کو گرفتار کیا ہے جب کہ اصل صدام میرے سامنے بیٹھا برف کی کیوبز میں لگے زیتون کھا رہا ہے اور اپنے جام جمشید کو کبھی خالی نہیں ہونے دیتا..

میں نے ایک بار جان کی امان پا کر عرض کیا کہ ملک صاحب اس ملتانی کُرتے کے ساتھ پاجامے کی بجائے آپ اگر جھنگ کی شلوار زیب تن کرتے تو آپ کی شخصیت کو چار چاند لگتے..اس میں آپ کچھ کچھ لکھنوی لگ رہے ہیں..اُنہوں نے میرے مشورے پر کچھ دھیان نہ دیا اور وِنود کے ساتھ ابھی دو تین ماہ کی دُوری پر واقع نیو ایئر نائٹ منانے کی منصوبہ بندی کرتے رہے کہ اس بار راجھستان کے صحرا میں جا کر موج میلہ کریں گے یا گوا کے ساحل

پر جا کر جشن منایا جائے..

میں بار بار وقت کا دھیان کرتا تھا کہ اجیت کور نے کانفرنس کے اختتام پر حکم جاری کیا تھا کہ آج تمام مندوبین کو "چور بازار" لے جایا جائے گا جہاں رات کا کھانا ہوگا' خبردار اگر کوئی بھی اس الوداعی دعوت سے غیر حاضر ہوا تو.. میں نے ہر شام اپنی مرضی سے گزاری تھی اور مندوبین سے ایک محفوظ فاصلے پر گزاری تھی لیکن آج شام میں بہر طور "چور بازار" میں گزارنا چاہتا تھا..

بار سے باہر کھلی فضا میں.. ایک ادبی محفل سجی تھی۔ گوپی چند نارنگ.. انور سجاد' کشور ناہید' ثروت محی الدین' جاوید شاہین اور فراز حیات کا سفر طے کر رہے تھے اور بار بار مجھے دیکھتے تھے کہ یہ شخص کن غیر ادبی لوگوں میں جا بیٹھا ہے' ہمارے پاس کیوں نہیں آ رہا.. وہ نہیں جانتے تھے کہ میں ایک جن کے قبضۂ قدرت میں تھا..

ملک صاحب کے لیے آئس کیوبز میں لگے زیتون آتے رہے اور وہ انہیں بڑی رغبت سے نوش کرتے.. یہ زیتون بیر کے سائز کے تھے حالانکہ ملک صاحب کے تن و توش کے مطابق اُنہیں کم از کم آلو بخاروں جتنے ہونا چاہیے تھا.. البتہ مجھ سے ایک عُقدہ وا نہ ہوتا تھا کہ ہر بار دو درجن کے قریب آئس کیوبز میں صرف ایک زیتون کا دانہ ہوتا ملک صاحب وہ دانہ اُٹھا کر منہ میں رکھتے تو.. ویٹر فوراً پیالہ اٹھاتا اور اُس کی جگہ پہلے سے تیار ایک اور پیالہ پیش کر دیتا..

"ملک صاحب اِتنی ڈھیر ساری برف میں صرف ایک زیتون کیوں ٹھنڈا ہو رہا ہوتا ہے؟"

"یہ میرا اسٹائل ہے.." اُنہوں نے یہ کہہ کر مجھے ڈسمس کر دیا..

اور جامِ ملک بھی کبھی خالی نہ ہوا..

اس دوران اس بھرے پُرے مسرت سے اُبلتے سگرٹوں کے دھوئیں سے بھرے میخانے کا دروازہ وا ہوا اور ایک دراز قامت' سر جھکائے' بدن جھکائے.. گلے میں مفلر کھدر کا کرتا پاجامہ' تقریباً ستر برس کے لگ بھگ' اپنے آپ میں مست الست' درویش صفت بوڑھا

آس پاس سے بے خبر اور لاپروا اندر آیا اور خاموشی سے کھڑکی کے برابر ایک کونے میں بیٹھ گیا.. ویٹر نے اس سے پوچھا نہیں کہ آپ کیا پسند کریں گے.. چپکے سے اُس کے سامنے زرد مشروب کا ایک گلاس رکھا اور پیچھے ہو گیا..

اُس نے اپنے مشروب میں سے فوراً گھونٹ نہیں بھرا بلکہ بہت دیر تک اُسے غور سے تکتا رہا جیسے اُس سے باتیں کر رہا ہو..

بار میں صرف وہ شخص تھا جو تنہا بیٹھا تھا..

ونود میرے قریب ہوا.. "تارڑ صاحب.. اس بوڑھے کو ذرا غور سے دیکھئے.."

"دیکھ رہا ہوں.."

"یہ مہاتما گاندھی کا پوتا راموگاندھی ہے.. ہندوستان کے چوٹی کے دانشوروں میں شمار ہوتا ہے.. یہاں سے کچھ دور ایک سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہے.. روزانہ شام کو عین اسی وقت یہاں آتا ہے.. اپنی مخصوص میز پر بیٹھ جاتا ہے.. کسی سے ملنا یا بات کرنا پسند نہیں کرتا.. اپنی پسند کے مشروب کے دو گلاس ہولے ہولے پیتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے.."

ونود تو مجھے اپنے تئیں ایک تاریخی شخصیت کے بارے میں ذاتی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا لیکن سچی بات ہے جب اُس نے یہ کہا کہ یہ مہاتما گاندھی کا پوتا راموگاندھی ہے تو میں ایسے سناٹے میں آیا کہ اور کچھ سنائی ہی نہ دیا اور یونہی سر ہلاتا رہا جیسے سب کچھ سُن رہا ہوں.. آپ ذرا دھیان میں لائیے کہ ہم قائداعظم کی بیٹی کو کتنے احترام اور پیار سے دیکھتے ہیں بے شک وہ ہمیں نہ دیکھے.. اپنے باپ کے قائم کردہ وطن میں رہنا پسند نہ کرے.. اُن کے نواسے سے کتنی عقیدت رکھتے ہیں' بے شک وہ اپنے نانا جان کے ملک میں نہ رہے.. ہندوستانی شہری ہونے پر فخر کرے اور پارسی ہو.. تب بھی ہم کتنی عقیدت رکھتے ہیں اُن کے لیے.. نہ اُس کی قومیت ہماری' نہ زبان اور نہ عقیدہ اور اس کے باوجود.. صرف اس لیے کہ وہ ہمارے بابے جناح کے لگتے لانے ہیں.. اُن کی نسل میں سے ہیں.. اچھے لگتے ہیں.. تو یہ شخص جو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کی بار میں ایک کونے میں تنہا بیٹھا ہے اُس کا دادا پورے ہندوستان کا باپو تھا.. اور وہ اپنے دادا جان کو کیسے بھول سکتا تھا کہ ہندوستان کی وسعتوں میں

جزائر انڈیمان میں' بنگال یا گوا کے ساحلوں پر' ہمالیہ کی گود میں یا صحرائی شہروں میں.. کسی بھی لاکھوں میں سے ایک دور دراز گاؤں میں جاتا ہو گا تو وہاں اُسے اپنے دادا کی تصویر یا مجسمہ نظر آتا ہو گا تو وہ اُسے کیسے بھول سکتا تھا..

گاندھی کے لیے.. اگر میں اپنے تاریخی تعصب سے ذرا بھی بلند ہوتا ہوں تو اُن کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ تخلیق ہوتا ہے.. چالیس برس پیشتر میں جب اُن کی سادھی پر گیا تھا تو میں نے اِس نرم گوشے کا تفصیل سے تذکرہ کر دیا تھا.. کیا یہ کافی نہیں کہ اُنہیں مسلمان دوستی کی پاداش میں قتل کیا گیا.. چالیس برس پہلے اُس کی سادھی پر میں اُس شخص کو یاد کرتا تھا جسے چرچل ایسے متکبر اور ایشیائی لوگوں کو نفرت سے دیکھنے والے موٹے نے حقارت سے ''نیکڈ انڈین فقیر'' کہا تھا.. میں چرچل کا ہم نوا تو نہیں ہو سکتا.. اُسی انڈین فقیر کا پوتا اُسی بار میں ایک کونے میں بیٹھا تھا جہاں میں مسلسل اورنج جوس پیے جا رہا تھا کہ ابھی ''وغیرہ'' کا وقت نہ ہوا تھا..

میں نے سوچا یہ کیسا بدقسمت شخص ہے.. بلکہ بے وقوف کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ باپو کا پوتا ہونے کے باوجود ایک سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہے.. ہمارے ہاں کے لیڈران کرام کی آل اولاد کو تو چھوڑیئے' جن متحرک اور مخلص کارکنان تحریک پاکستان نے کبھی کسی جلوس میں یا اپنے تخیل میں بھی پاکستان زندہ باد کا ایک خفیف سا نعرہ بھی لگایا تھا' اس نے نظریہ پاکستان کے نام پر پورے پاکستان کو نہ سہی اُس کے بیشتر حصے کو نوش کر لیا.. پورے کو اس لیے نہیں کہ اور بھی بہت سے تھے جو اپنے حصے کا پاؤنڈ آف فلیش کاٹنا چاہتے تھے.. رامو گاندھی کو تو ایک عالی شان محل میں سکونت پذیر ہونا چاہیے تھا اور بُرے وقتوں کے لیے ٹیکساس میں دو چار رینچ بھی سٹینڈ بائی ہونے چاہیے تھے.. اور یہ وہاں بیٹھ کر دیگر ہندوستانیوں کو اپنے دادا کی کرامات اور خدمات کے قصے سناتا اور اُن کی حب الوطنی پر ماتم کرتا.. دراصل یہاں ایک اور پرابلم بھی ہو گئی تھی کہ یہاں تک افغانستان کے جہاد کے ثمرات نہیں پہنچے تھے ورنہ ان کے جرنیلوں کے بیٹے اور پنڈت بھی سکھ کی زندگی گزارتے' راموگاندھی کی مانند ایک سرونٹ کوارٹر میں نہ رہتے.. تو یہ کیسا احمق شخص تھا..

ونود کہنے لگا ''رامو رفاقت کو پسند نہیں کرتے.. اس لیے آپ نے دیکھا کہ یہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی بھی اُٹھ کر اُن کے پاس نہیں گیا... وہ بار بار اپنے دادا کا حوالہ بھی پسند نہیں کرتے.. ذرا سڑیل مزاج ہیں.. بس اپنی دو ڈرنکس گھونٹ گھونٹ گلے میں اُتارتے ہیں اور خاموشی سے چلے جاتے ہیں..''

ملک صاحب کے لیے آئس کیوبز میں ٹھنڈے ہوتے اکلوتے زیتون آتے چلے جاتے تھے..

میرے چھوٹے بیٹے سُمیر نے پاکستان سے چلتے ہوئے میرے سامان میں اپنی آٹوگراف کتاب رکھ دی تھی کہ ابا ہندوستان میں اگر کوئی کام کا آدمی ملا تو اُس کے آٹوگراف حاصل کر لینا.. یونہی بیکار قسم کے شاعروں اور ادیبوں سے میری کتاب کو نہ بھر لانا.. تو میں نے سوچا کہ مہاتما گاندھی کا پوتا تو کام کا آدمی ہونا چاہیے.. میں نے ونود سے مشورہ کیا تو اُس نے بھی یقین دلایا کہ بے شک راموگاندھی ایک کام کے آدمی کی فہرست میں جگہ پاتے ہیں.. چنانچہ میں فوری طور پر اُٹھا اور اپنے کمرے میں سے سُمیر کی آٹوگراف بک اُٹھا لایا..

''چلیں؟'' میں نے ونود سے کہا..

''ذرا سوچ کے چلیں گے.. بیزار سا بندہ ہے.. ویسے ایک بار الیکشن کے دوران اس کے ہمراہ سفر تو کیا تھا شاید پہچان لے.. ٹھیک ہے چلیں..''

ہم دونوں اُٹھ کر وہاں چلے گئے..

ونود نے اپنا تعارف کرایا جسے اُس نے نظریں اُٹھا کر نہایت غیر جانبدار چہرے کے ساتھ سُنا.. پھر ونود نے مناسب الفاظ میں سارک ادیبوں کی کانفرنس اور میرے پاکستانی ہونے کے بارے میں عرض کیا.. یاد رہے کہ اس دوران ہم راموجی کی میز پر بیٹھے نہیں اُن کے سامنے جھکے جھکے مؤدب کھڑے رہے.. پاکستان کے حوالے سے وہ بُت کافر.. وہ پتھر ذرا موم ہوا اور مسکرایا اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا.. وہ ہاتھ جو وہ اپنی گود میں سمیٹے ہوئے تھے.. لیکن جونہی میں نے آٹوگراف بک پیش کرتے ہوئے دستخط کرنے کی درخواست کی تو وہ پھر سے پتھر ہو گئے.. ''میں آٹوگراف نہیں دیا کرتا.''

مجھے اس انکار سے کچھ دُکھ نہ ہوا.. کہ مجھ ایسے وقتی شہرت رکھنے والے بھی کبھی آٹوگراف دیتے دیتے عاجز آ جاتے ہیں اور انکار کر دیتے ہیں..تو گاندھی جی کا پوتا اگر انکار کر دے تو اُس کا حق بنتا ہے..

"ٹھیک ہے سَر..لیکن یقین کیجیے کہ یہ مختصر سی ملاقات میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا دلّی آنا رائیگاں نہیں گیا۔" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "اور جہاں تک آٹوگراف کا تعلق ہے' میں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں..آپ ہر کسی کو آٹوگراف دینے لگیں تو زندگی میں اور کوئی کام نہ کر سکیں..میں اپنے بیٹے کو سمجھا دوں گا کہ جونیئر گاندھی جی نے انکار کر دیا تھا۔"

جونیئر گاندھی جی جو پل میں پتھر اور پل میں موم ہو جاتے تھے' پھر سے موم ہو گئے

"آپ میرے آٹوگراف اپنے بیٹے کے لیے لینا چاہتے ہیں؟"

"جی۔"

"بیٹوں کے لیے تو آٹوگراف دیئے جا سکتے ہیں۔" جونیئر گاندھی جی نے بہت عرصے کے بعد ایک گھونٹ بھرا اور آٹوگراف بک تھام لی "اُس کا نام کیا ہے؟"

"سُمیر.."

"سُمیر؟..اس کے کیا معانی ہیں؟"

"ایک ایسا شخص جو کہانیاں سناتا ہو..ایک داستان گو.."

"اور آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں کہانیاں لکھتا ہوں.."

راموگاندھی پہلے تو صرف موم ہوئے تھے' اب باقاعدہ پگھل گئے..اپنی نشست سے ذرا اُٹھے اور میرا ہاتھ تھام کر بولے "واہ...یہ تو بڑا زبردست کمبی نیشن ہے' باپ کہانیاں لکھتا ہے اور بیٹا کہانیاں سناتا ہے۔"

میں ایک شاطر شخص تھا..میں نے الفاظ کے ہیر پھیر سے گاندھی جی کے پوتے راموکو رام کر لیا تھا..اُنہیں بقول ہندوستانی محاورے کے پٹا لیا تھا..

اُنہوں نے آٹوگراف بُک پر کچھ لکھا اور وہ کچھ ہندی میں تھا..اس پر میں نے گزارش کی کہ باباجی ہم اس بھاشا کو نہیں جانتے' کچھ ایسا لکھیں جو ہم پڑھ بھی سکیں تو اُنہوں نے "ٹو سُمیر وِدلو..راموگاندھی" انگریزی میں لکھ دیا اور بہت دھیرے دھیرے جیسے لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں لکھا اور آٹوگراف بُک مجھے تھما دی..فوراً ہی جونیئر گاندھی جی پھر سے پتھر ہو گئے اور ہم دونوں واپس اپنی میز پر آ بیٹھے جہاں مقامی صدام حسین اس دوران متعدد جام اپنے وسیع تن و توش میں اُنڈیل چکے تھے مگر مجال ہے ان پر کچھ اثر ہوا ہو..وہ بامیان کے کبھی جو تھے عظیم بدھ مجسموں کی مانند اپنی نشست پر ایستادہ اور قائم تھے..اگرچہ خوش باش تھے یہاں تک کہ مجھ سے بھی قدرے فری ہو گئے..

"سر آج شام آپ کیا کر رہے ہیں؟" ونود نے پوچھا..

"وُہی جو کر رہا ہوں"

"میرا مطلب ہے رات کے کھانے کا کیا پروگرام ہے؟"

"وہ تو کھائیں گے۔"

"کہاں؟"

"سارک کے تمام ادیبوں کو "چور بازار" میں لے جایا جا رہا ہے رات کے کھانے کے لیے..سنا ہے دلچسپ جگہ ہے..جہاں چور بھی ہوں' بازار بھی ہو اور پھر ادیب بھی شامل ہو جائیں تو اُس سے دلچسپ جگہ اور کونسی ہو سکتی ہے..میں اُن کے ہمراہ جا رہا ہوں.."

"یہ "چور بازار" اس لائق نہیں کہ آپ دلّی کی ایک شام اُس میں ضائع کریں۔"

"تو دلّی کی یہ شام کہاں ضائع نہیں ہو سکتی؟"

"جہاں میں آپ کو لے جانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں ونود..یقین کیجیے اس پوری کانفرنس کے دوران جتنی شامیں تھیں وہ میں نے اِدھر اُدھر کیں اور میں چاہتا ہوں کہ بنگلہ دیش اور نیپال سے آئے ہوئے چند ادیبوں سے باقاعدہ ملاقات کروں اور آج کی شام ایسا ہو سکتا ہے..سَوری۔"

اتنی دیر میں کانفرنس کی ایک منتظم خاتون جو بہت ہی باریک تھیں اور اُن کی آواز

اتنی ہی موٹی تھی ریستوران میں داخل ہوئی اور بولیں ''چور بازار..چور بازار'' جیسے ویگن کے لیے سواریاں تلاش کر رہی ہوں ''کوچ چلنے والی ہے'' سارک کانفرنس کے تمام مندوبین فوری طور پر باہر آ جائیں..جلدی جلدی..''

اُنہوں نے چند ادیب سمیٹے اور اُنہیں ہانک کر باہر لے گئیں پھر فوراً ہی واپس آئیں اور ایک طائرانہ نظر ڈال کر مجھے سپاٹ کر لیا ''آیئے..اُٹھیے..سب لوگ بیٹھ چکے ہیں۔''

''میں بس ابھی آتا ہوں ان دوستوں سے اجازت لے کر..''

''نہیں ابھی نہیں..اسی وقت آیئے نہیں تو ہم آپ کے بغیر چلے جائیں گے.. سب لوگ..''

مجھے اُن کا انداز کچھ بھایا نہیں ''آپ چلے جایئے میرے بغیر..''

''آپ کتنی دیر میں یہاں سے اُٹھیں گے'' اُنہوں نے گھڑی پر نظر ڈال کر اُسی انداز میں پوچھا..

''میں یہاں سے اُٹھوں گا ہی نہیں..آپ جایئے چور بازار..خدا حافظ۔''

تھوڑی دیر بعد ملک صاحب یکدم کھڑے ہو گئے..کھڑے ہو کر اُنہوں نے ہر جانب ہاتھ ہلا کر ایک عوامی لیڈر کی طرح ''خدا حافظ'' کہا اور چلے گئے..

''میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں..'' ونود نے بھی گھڑی پر نگاہ کی۔

''جی ارشاد..''

''خاصے طویل عرصے سے..تقریباً بیس بائیس برس سے میری ایک بیوی ہے.. مدراسن ہے..نام تو اُس کا کچھ اور ہے لیکن اُس کا ترجمہ اگر پنجابی میں کیا جائے تو ''نکّی'' بنتا ہے یعنی چھوٹی..تو یہ نکّی ڈاکٹر ہے..اور اُسے اس لمحے اپنی مدراسی ساڑھی میں لپٹے میرا انتظار کرتے ایک گھنٹے سے زائد ہو چکا ہے..اور میں یہاں آپ کے پاس بیٹھا ہوں..''

''آئی ایم سوری..'' مجھے یکدم بے حد افسوس ہوا کہ میں نے اس جن کی اطاعت کا ناجائز فائدہ اُٹھایا تھا اور اُسے اُس کی نکّی سے ملنے سے روکے رکھا تھا ''رئیلی ویری

سوری..ونود آپ جایئے اپنی نکّی کے پاس..اگر کل آپ فارغ ہوئے تو پھر ملاقات ہو گی انشاءاللہ..''

''نہیں نہیں ایسا نہیں..عرض میں یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج نکّی کے ایک کولیگ کی شادی کی بیسویں سالگرہ ہے اور وہ جوڑا جشن منا رہا ہے..جس میں مولانا ابوالکلام آزاد میڈیکل کالج سے پڑھے ہوئے اُن کے تمام ڈاکٹر دوست شرکت کر رہے ہیں..اور نکّی اپنی مدراسی ساڑھی پہنے میرا انتظار اس لیے کر رہی ہے کہ ہم دونوں اُس پارٹی میں شامل ہو سکیں..''

''ونود..مجھے شرم آ رہی ہے کہ میری وجہ سے آپ رُکے رہے..سوری''

''میں اس وجہ سے رُکا رہا کہ میں آپ کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں..یعنی ہم دونوں نہیں..ہم تینوں..''

''شکریہ..لیکن..''

''چور بازار آپ جا نہیں رہے تو اب کیا کریں گے..؟''

''میں..میں ملک صاحب کے بہت سارے زیتون کھا چکا ہوں..اس لیے ڈنر کی حاجت نہیں..کمرے میں جا کر آرام کروں گا۔''

''نہیں تارڑ صاحب..اگرچہ میری اور آپ کی دوستی چند گھنٹے پرانی ہے لیکن دوستی تو ہے ناں..چلیے۔''

میرا دل تو چاہ رہا تھا جانے کو..لیکن میں جن کی محبت کو ایکسپلائٹ نہیں کرنا چاہتا تھا ''عجیب سا لگے گا..ایک بِن بلایا مہمان..''

''ایک تو آپ میرے بلائے ہوئے مہمان ہوں گے اور پھر مجھے وہاں پہنچ کر صرف اتنا کہنا پڑے گا کہ یہ مہمان لاہور سے آیا ہے تو آپ دیکھیے گا کہ وہ کیسے آپ کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں..پلیز..''

ویسے ونود کو اتنی لجاجت آمیز درخواست کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ میں ایک پنجابی محاورے کے مطابق ادیبوں اور دانشوروں سے ناک تک عاجز آ چکا

تھا اور انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے باہر دلّی کے جو لوگ تھے اُن سے بھی میل ملاقات کا متمنی تھا.. میں بے ایمان ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے سے ہی مان جانے والی عورت کی مانند یونہی بے دلی سے ''نہ نہ'' کی اور پھر دل و جان سے ''ہاں'' کر دی..

''دلّی کا سنہری اُلّو اور اُس کی کھنڈر قیام گاہ''

ونود کی گاڑی شوفر ڈرون تھی..

ہم اُس کے فلیٹ کی جانب رواں تھے..

جو لوگ ٹیلی ویژن پر میزبان ہوتے ہیں' وہ عام طور پر بہت باتونی ہوتے ہیں..

میں بھی تھا..اور ونود بھی تھا..

ونود کے کہنے پر اُس کے ڈرائیور نے عالی شان عمارتوں کے پہلو میں پوشیدہ ایک مختصر سے کھنڈر کے برابر میں کار روک دی..قدیم اور بوسیدہ.. بارشوں سے سیلن زدہ..اینٹیں اُکھڑی ہوئیں..شاید کوئی مندر تھا یا کسی مغل عہد کی مسجد کا کچھ حصہ تھا..جو بھی تھا ایک اُجڑی ہوئی قدامت رکھتا تھا ''تارڑ صاحب..اس کھنڈر میں دلّی کا سنہری اُلّو رہتا ہے۔''

میں نے سوچا ونود کھتری ملک صاحب کی مانند اپنے مشروب کو سنبھال نہیں سکا اس لیے اُسے ہر سُو اُلّو دکھائی دے رہے ہیں اور وہ بھی سنہری اُلّو..تو میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا..

اس پر ونود نے میری بے یقینی بھانپ لی ''یہیں رہتا ہے دلّی کا سنہری اُلّو''

''ونود..اُلّو میری معلومات کے مطابق..عام طور پر سیاہ ہوتے ہیں' سلیٹی رنگ کے بھی ہوتے ہیں اور جو بہت خوبصورت ہوں وہ برف کی مانند سفید بھی ہوتے ہیں۔لیکن..سنہری نہیں ہوتے..''

''تارڑ صاحب..میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دلّی کا یہ اُلّو سنہری ہے۔''

''کیا آپ نے اُسے کبھی دیکھا ہے؟''

''ہاں.. بہت بار.. اور وہ سنہری ہے.. بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ دلّی کے اس عالی شان علاقے میں ایک مختصر سے کھنڈر میں ایک سنہری اُلو رہتا ہے۔ آپ دیکھنا چاہتے ہیں؟''

میں اُس لمحے ایک اُلو بخار میں مبتلا ہو گیا.. یہ شریف ترین پرندہ.. شریف ترین اس لیے کہ آج تک کوئی تصویر کوئی ڈاکومنٹری ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے وہی ''حرکات'' کرتا ہے جو دیگر چرند پرند کھلے عام کرتے ہیں.. وہ اتنا شریف اور شرمیلا ہے.. اور میرا اتنا پسندیدہ ہے کہ میں نے اپنے کالموں کے ایک انتخاب کا عنوان بھی ''اُلو ہمارے بھائی ہیں'' رکھ دیا تھا.. تو میں یہ گمان بھی نہ کر سکتا تھا کہ ہمارے یہ بھائی سنہری بھی ہو سکتے یں.. یعنی گولڈن آؤل ہو سکتے ہیں۔

''میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ابھی تو نہیں.. ابھی تو رات ہے.. اور آپ جانتے ہیں کہ اُلو راتوں کو باہر رہتے ہیں.. عین ممکن ہے کہ یہ سنہری اُلو اس لمحے کسی اُلنی کے ساتھ دلّی کی رات کو سرخ رنگ کا پوچا پھیر رہا ہو.. عیش کر رہا ہو.. کبھی دن کے وقت ادھر سے گزریں گے تو دکھا دوں گا..''

''اِک شامِ سحر انگیز میں ہندو دیوتا اور بلّھے شاہ''

ونود کی بیوی جسے اُس نے پوری شام ایک مرتبہ بھی دھرم پتنی نہ کہا' ایک دل نشیں شباہت کی سیاہ بالوں والی مدراسن تھی اور اُس میں نمکین حُسن کی وافر مقدار تھی.. ونود اُس پر بچھا جاتا تھا.. یہ نلّی تھی' ڈاکٹر نلّی..

ہندوستان میں نہ صرف مختلف قومیتوں بلکہ مختلف مذہبوں کے درمیان شادیاں عام ہیں۔ ہم چونکہ ایک مختلف ذات میں بھی شادی کا تصور نہیں کر سکتے اس لیے ہمارے لیے ایسی شادیاں اچنبھے کا باعث بنتی ہیں۔ ہم کہتے تو یہی ہیں کہ مسلمان ہونے کے ناطے ہم ذات پات پر یقین نہیں رکھتے اور یہ ہندو ہیں جو اس سے چمٹے ہوئے ہیں لیکن یہاں معاملہ سراسر اُلٹ نظر آتا ہے.. میں نے نلّی سے دریافت کیا کہ آپ ایک سراسر جدا تہذیب اور زبان کی پروردہ مدراسن ہیں اور ونود ٹھیٹھ پنجابی ہے تو کیا ذہنی مطابقت میں دشواری پیدا نہیں ہوئی.. نلّی کہنے لگی کہ میری تمام تر تعلیم دلّی میں ہوئی اور یہ شہر ایسا ہے کہ اس میں سب کچھ گھل مل جاتا ہے اور ایک مشترکہ ثقافت جنم لیتی ہے.. ہم انسان رہ جاتے ہیں اور اپنی زبانیں بھول جاتے ہیں۔ یوں بھی رابطے کی زبان ہندی نہیں رہی' انگریزی ہو گئی ہے.. ونود نے مجھے پنجابی بھی سکھا دی ہے اور میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ سوہنیو کی حال اے..

شادی کی بیسویں سالگرہ منانے والے ڈاکٹر جوڑے کے فلیٹ کو درجنوں فلیٹس میں سے سپاٹ کر لینا چنداں دشوار نہ تھا کہ اُس فلیٹ کی روشنیاں ٹمٹماتے دیئے اور رونقیں اُس میں سے پھوٹ کر پورے علاقے پر چھما چھم برستی تھیں.. جن سیڑھیوں پر قدم دھرتے

ہم اوپر جاتے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک سیڑھی ایک دُلہن کی مانند سجی ہوئی تھی.. گیندے کے ہار پاؤں سے اُلجھتے تھے.. بے شمار دیئے راہ دکھاتے تھے' کچھ کھلونے دیوتا عجیب سی شکلوں والے استقبال کر رہے تھے اور روایتی رنگ بچھے تھے.. یعنی اس گھر کے راستے میں پھولوں' دیوتاؤں' رنگوں اور چراغوں کی کہکشاں تھی جس پر ہم احتیاط سے قدم رکھتے اوپر گئے..

میرے لیے یہ کسی بھی باقاعدہ ہندو گھرانے میں داخل ہونے کا پہلا تجربہ تھا..

اور مجھے اس پر کسی عجائب گھر کا گمان ہوتا تھا..

عجائب گھر اس لیے کہ آپ یا کوئی بھی شخص اپنے وطن کی کسی بھی گھر میں جن اشیاء کی عام طور پر سجاوٹ ہوتی ہے اُن کا عادی ہوتا ہے.. ہمارے ہاں دیواروں پر خطاطی یا خانہ کعبہ کی تصویر سجی نظر آئے گی' اگر کوئی بہت بے مُہار شخص ہو تو اُس کے گھر میں تصویریں بھی ہو سکتی ہیں اور کوئی بہت امیر ہوگا تو ایک انتہائی گراں فانوس اُس کی متموّل انا کے سہارے چھت سے لٹک رہا ہوگا.. تو جب آپ ان سجاوٹوں سے یکسر الگ انوکھی اور اجنبی اشیاء والے گھر میں داخل ہوں گے تو وہ آپ کے لیے ایک عجائب گھر ہوگا.. یعنی دیواروں پر مذہبی نوعیت کے طرح طرح کے دیوتاؤں کی تصویریں ہیں اور اُن کے گلے میں ہار پڑے ہیں.. کارنس پر اور میزوں پر بھی کچھ خونخوار کچھ نہایت پیارے.. کچھ کالے کچھ گورے گورے دیوتا سجے ہیں... اگر بتیاں جل رہی ہیں اور کوئی ایک الگ سی مہک ہے۔ ناگوار بھی نہیں خوشگوار بھی نہیں جو ہمارے گھروں میں نہیں ہوتی۔ چراغوں کا دھواں بھی کچھ اور سا تھا.. لیکن اُس میرے لیے ایک عجائب گھر میں جو لوگ تھے' وہ عجیب نہ تھے' مجھ ایسے ہی تھے.. وہ کسی بھی پاکستانی گھر میں ہو سکتے تھے.. البتہ اتنے پُر مسرت اور شاداں نہ ہو سکتے تھے کہ کوکا کولا یا چائے کے گھونٹ بھرنے سے انسان کتنا شاداں ہو سکتا ہے.. ان میں البتہ ایک سردار جی تھے جو الگ نظر آتے تھے اور اُنہوں نے خنکی کے باوجود ململ کا ایک کُرتا اور چست پاجامہ زیب تن کر رکھا تھا.. وہ کسی بھی سکھ کی ایک خصوصی تصویر یعنی بے مُہار.. بلند آہنگ اور دبنگ ہونے کی تصویر سے مختلف تھے.. وہ ایک دھیمے اور نرم لہجے میں بات کرنے والے سردار تھے اور لگتا نہیں تھا کہ اُنہوں نے کبھی کسی کرپان کو چھو کر بھی دیکھا ہو.. اور وہ بھی ڈاکٹر تھے..

ہماری آمد پر جو ہنگامہ برپا تھا وہ موقوف ہوا' ونود اور نکی کا استقبال مناسب نعروں' بغل گیریوں اور اکا دکا بوسوں سے ہوا.. میں ان دونوں کے پیچھے دبّی میں ایک مسکین اور جھینپا ہوا اجنبی کھڑا تھا.. ونود نے مجھے باقاعدہ دھکیل کر آگے کیا اور واقعی میرا لاہوری ہونا میرے لیے تعظیم اور محبت کا باعث بن گیا.. اسی سلسلے میں ایک آدھ بغلگیری بھی ہو گئی.. یہ سارے کا سارا ڈاکٹر کراؤڈ تھا اور ظاہر ہے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ اگرچہ کھاتے کم تھے اور پیتے زیادہ تھے..

شادی کے بیس برس بعد بھی یہ میزبان ڈاکٹر جوڑا یعنی گریش راہیجا اور ساوینا نہایت پُرکشش اور پُر مسرت تھا.. شاید یہ بیس برسوں کی محبت تھی جو اُنہیں خوبصورت رکھے ہوئے تھی..

ڈاکٹر گریش ذرا طویل قامت تھے اور ذرا لہکتے اور مسلسل مسکراتے پھرتے تھے' مہمانوں کے گلاسوں کا خاص دھیان رکھتے تھے اُنہیں خالی دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے تھے اور فوراً لبریز کر دیتے تھے.. خوراک کی ترسیل کا بھی دھیان رکھتے تھے اور اُس موسیقی کا بھی جو جانے کہاں سے اور کدھر سے آ رہی تھی.. اور سب سے زیادہ اپنی بیگم ساوینا کا دھیان رکھتے تھے.. آتے جاتے اتفاقاً اُنہیں چھو لیتے تھے.. اُن کے بالوں کی تعریف کرتے تھے.. کبھی اُنہیں دیکھ کر ہنستے چلے جاتے تھے۔ غرض یہ کہ اُن پر اُنڈتے ہوئے نچھاور ہوتے چلے جاتے تھے... اور وہ واقعی اس لائق تھیں کہ اُن پر نچھاور ہوا جا سکے.. بیس برس کی عائلی زندگی نے اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا بلکہ سنوارا تھا.. جانتی تھیں کہ میں اس شخص کو.. اپنے شوہر کو ایک نظر دیکھوں گی تو یہ ''تھاں مر جائے گا'' اور وہ غریب اُن کی نظر کا شکار واقعی اُن کے دیکھنے سے تھاں مر جاتا تھا.. بعد میں جب اُنہوں نے رقص کیا تو اُن کی خوش بدن نشیلی اور پختہ کار نزاکت نے سب کے دل موہ لیے.. اس کراؤڈ میں ڈاکٹر ریش گلاٹی اور ان کی بیگم رینو اور ڈاکٹر نالی تاج اور ان کی بیگم سنگیتا بھی شامل تھے.. ہمیں وصول کر کے وہ سب پھر سے اپنے ہلّے گلّے میں مشغول ہو گئے..

میں ایک آرام دہ نشست پر براجمان یہ سوچ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں.. یہ پری

چہرہ لوگ کون ہیں.. ابھی مقامی صدام حسین کے ہمراہ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کی بار میں اُن کے برف زدہ زیتون کھا رہا تھا تو اب کہاں ہوں.. میں جہاں بھی تھا اپنے آپ پر رشک کر رہا تھا کہ میں یہاں ہوں.. میں یہاں نہیں بھی ہو سکتا تھا..

ایک اروندتی رائے ایسی شکل کی ملازمہ.. کٹے ہوئے بال اور معصوم چہرے والی ایک طشتری میں سجی ہوئی خوراکیں پیش کر رہی تھی.. اور میں نے جو بھی اس طشتری میں سے چکھا.. انوکھا اور اجنبی چکھا.. کہ یہ جو کچھ بھی تھا میں اس کے ذائقے سے ناآشنا تھا.. اگرچہ سبزیوں اور دالوں کے ذائقے میری مسلمانی کے ترازو پر کچھ زیادہ ہی جھکتے تھے لیکن گوشت خوروں کے مسوڑھے گرم رکھنے کا بھی مناسب بندوبست تھا..

اپنے شہر کراچی کے بارے میں شنید بھی ہے اور کسی حد تک دید بھی کہ وہاں مہاجر بھائی اپنے اپنے شہروں میں تو کیا ابھی تک اپنے آبائی محلوں میں بٹے ہوئے بیتے دن اور بزرگوں کی روایات یاد کرتے ہیں.. امروہہ والے اپنے آپ پر نازاں الگ محفلیں سجاتے ہیں اور لکھنؤ کے فلاں محلے والے اگر مشاعرہ برپا کرتے ہیں تو لکھنؤ کے ہی کسی اور محلے کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتے اور حیدرآبادی اپنے تئیں آداب اور طعام میں اپنے آپ کو ذرا بلند درجے پر فائز کر کے دیگر حضرات کی خوراک کو حقیر جانتے ہیں.. تو ہمیں لاہور میں بیٹھے ہوئے ذرا حیرت ہی ہوتی تھی کہ ہائیں ابھی تک.. لیکن دلّی میں.. اُس شام.. اُس محفل میں کھلا کہ یہ ہمارے ہاں سے اُدھر جانے والے شرنارتھی تو اس معاملے میں کراچی والوں سے کہیں آگے ہیں.. اس دعوت میں اگرچہ بیشتر ڈاکٹر حضرات کا تعلق ہمارے پنجاب سے تھا اور سرائیکی سپیکنگ علاقے سے تھا لیکن اس کے باوجود کوئی صاحب اندر آتے تو نعرے لگتے لو جی ڈیرہ اسماعیل خان والے آ گئے ہیں' دریائے سندھ میں سے مُردہ مچھلیاں پکڑنے والے.. وہ صاحب جواب میں ملتان والوں کو رگیدتے اور پھر سب مل کر ڈیرہ غازی خان کے کسی صاحب پر پھبتیاں کسنے لگتے.. اور ہر علاقے والوں نے اپنی زبان اور ٹھیٹھ محاورے کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور نہایت فخر سے اپنے لہجے میں گفتگو کرتے تھے.. یعنی یہ لوگ بھی ابھی تک اپنے اپنے آبائی شہروں اور ماضی میں سانس لیتے تھے..

فلیٹ کی مختصر بالکونی سرسبز پودوں' گل بوٹوں اور بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی جہاں اپنی بیویوں سے اُکتائے ہوئے اور کھانے سے زیادہ پینے کے شوقین چند حضرات کھلی فضا میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے.. فلیٹ کے اندر چونکہ بہت ہجوم ہو چلا تھا اور کھوے سے کھوا چھل رہا تھا تو میں نے سوچا کہ کہیں میرا کھوا کسی نسوانی کھوے سے نہ چھل جائے اس لیے میں بھی باہر بالکونی پر آ گیا.. باہر بیٹھے حضرات سے کچھ رسمی سلام دعا کی.. اُنہوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ تو نہیں لیا کہ اُن کے ہاتھوں میں گلاس تھے جو چھلک سکتے تھے.. وہ اپنے تازہ ترین آپریشن اور مریض ڈسکس کر رہے تھے۔ میری آمد پر لاہور اور پاکستان موضوع بن گئے.. میری طرح اُنہیں بھی کچھ حیرت ہوئی' یہ حیرت اس لیے بھی ہوئی کہ اُن میں سے بیشتر کے ذہن میں ایک پاکستانی نہایت متعصب' ہندو سے شدید نفرت کرنے والا اور ہندوستان کا قلع قمع کرنے کا ارادہ رکھنے والا شخص ہوتا ہے.. ونود نے جب اقرار کیا کہ ہمارے ہاں پاکستان کے بارے میں یہی تاثر تعمیر کیا جاتا ہے کہ سب پاکستانی ہندوستان کو نابود کرنے کے درپے ہیں اور ہم سے شدید نفرت کرتے ہیں تو میں نے بھی اقرار کر لیا کہ ہم بھی ایک زمانے میں ''کرش انڈیا'' کے سٹکر لگائے گھومتے تھے لیکن وہ زمانے جنگ اور خوف کے تھے.. ہم ہندوستان سے کوئی بغض نہیں رکھتے صرف تب رکھتے ہیں جب پاکستان کی سلامتی پر آنچ آنے کا خدشہ ہوتا ہے.. ہمیں بس زندہ رہنے دیں.. دل سے بے شک' ہمیں نہ مانیں کہ آپ کی مذہبی اور تاریخی مجبوریاں آڑے آتی ہیں جیسا کہ واجپائی صاحب نے بھی مان لیا تھا..

یہاں پر میں ایک حقیقت اگرچہ تلخ کا اظہار کرنا چاہتا ہوں..

پاکستان کے دیگر صوبوں میں ہندوستان کے حوالے سے اتنے شدید جذبات نہیں ہیں جو ہمارے پنجاب میں ہیں.. اسی طور وہاں جو پنجابی ہندو ہیں' وہ پاکستان کے وجود کو برداشت نہیں کرتے..

ایسا شاید اس لیے ہے کہ پنجابیوں نے تقسیم کے دوران جتنا کھویا.. جو کچھ گنوایا وہ

دیگر صوبوں کی نسبت بہت کچھ تھا۔۔ قافلوں کو قتل کیا۔۔ ایک دوسرے کو چن چن کر مارا۔۔ پوری ریل گاڑیاں۔۔ ابھی سانس لیتے لوگ تھے ابھی لاشیں تھیں۔۔ بچوں' عورتوں اور بوڑھوں کی لاشیں۔۔ تو وہ بھول نہیں سکتے۔۔

غیر انسانی مظالم دونوں جانب سے ہوئے۔ اگرچہ میں کتنا بھی غیر جانبدار ہو جاؤں میری ناقص رائے یہ ہے کہ ہم پر یہ مظالم کچھ سوا ہوئے' ہمارے بہت سے بزرگ جو اب کم ہوتے جا رہے ہیں۔۔ رخصت ہوتے جاتے ہیں مشرقی پنجاب کے خون آلود دن نہیں بھول سکتے۔۔ میری بیگم کے ماموں عبدالعزیز' اُنہیں باؤلے ماموں کہا جاتا تھا' کے تمام بچے اور ان کی بیوی سکھوں کی کرپانوں سے ٹکڑوں میں کٹے۔۔ تو وہ کیسے بھول سکتے تھے۔۔ وہ تو بڑے دل اور بڑے جگرے والے لوگ تھے جو پھر بھی مسکرا سکتے تھے۔۔ اگر میرے ساتھ خدانخواستہ کوئی ایسا سانحہ ہوتا تو میں عمر بھر مسکرا نہ سکتا اور نہ معاف کر سکتا۔۔

ویسے یہ بھی ایک عجیب تاریخی مذاق ہے کہ ہم نے دھیرے دھیرے سکھوں کو تو معاف کر دیا لیکن ہندو کو معاف نہ کیا جو اُن کی نسبت اس خون آشامی میں کم شریک تھا۔۔

میرے ناول ''راکھ'' کے بارے میں کچھ نقادوں نے اعتراض کیا کہ تارڑ نے لاہور کے شاہ عالمی کے ہندو علاقے کو جلائے جانے کے نتیجے میں اٹھنے والی راکھ کا تذکرہ تو کیا اور کاموئنکے سٹیشن پر ہندوؤں اور سکھوں سے بھری پری ٹرین کو قتل کرنے کی تفصیل تو بیان کر دی لیکن جو کچھ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے ساتھ ہوا اُس کی داستان کیوں نہیں سنائی۔۔ اُن کا اعتراض کسی حد تک درست ہے۔۔ لیکن میرا نکتہ نظر یہ ہے کہ جو کچھ میرے ذاتی مشاہدے میں آیا۔۔ لاہور یا کاموئنکی میں آیا وہ میں نے صدق دل سے دکھ کے ساتھ بیان کر دیا۔۔ اور جو کچھ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے ساتھ بیتا اُسے بیان کرنے کی ذمہ داری وہاں کے سکھ یا ہندو ادیب پر ہے۔۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ذمہ داری نبھائی گئی یا نہیں۔۔ جو کچھ اُنہوں نے دیکھا۔ مسلمانوں کے قافلوں۔۔ نہتے اور بے سہارا بچوں اور عورتوں پر جو منظم۔۔ کرپانیں لشکاتے۔۔ وحشی حملے ہوئے۔ عزت نفس کے ساتھ جو کچھ آبرو لٹی۔۔ اگر اُنہوں نے ابھی تک بیان نہیں کیا تو کیسا ایک اور ظلم کیا۔۔

اکثر ادیبوں نے ان خون آشام دنوں کو موضوع بنایا لیکن ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھنے کی کوشش میں انصاف نہ کیا۔ کہ ظلم تو دونوں جانب سے ہو رہا تھا۔۔ دونوں برابر کے مجرم ہیں۔۔

ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔

میں نے اپنا جرم قبول کر لیا۔۔

جن کے جرم قدرے بڑے تھے وہ قبول کیوں نہیں کرتے۔۔

میرے اکلوتے اور سگے ماموں جان ایک بار دلی گئے تو بہت تلاش کے بعد ایک ایسے سکھ سے ملاقات کی جو ہمارے آبائی گاؤں جوکالیاں ضلع گجرات کنار چناب سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس سردار نے اُن کی بہت تعظیم کی۔۔ بہت تواضع کی لیکن رخصتی پر کہا کہ چیمہ صاحب معاف کیجیے گا آپ دوبارہ نہ آئیے گا کہ جوکالیاں نے جو کچھ میرے ساتھ کیا میں بھول نہیں سکتا۔۔

اور جوکالیاں نے ان کے ساتھ کیا کیا۔۔ مجھے کچھ اندازہ ہے۔۔

سکھ بنیادی طور پر کاشتکار تھے۔۔ کسان تھے اور ذات کے جاٹ تھے یوں وہ ہماری برادری میں تھے۔۔ میرے ابا جی بتاتے ہیں کہ ہم جاٹ ہونے کے ناطے سے مشترک قدریں رکھتے تھے اور ایک دوسرے کی شادی اور غمی میں شریک ہوتے تھے۔ شادی کے مواقع پر اُنہیں ''سُوکھا راشن'' دیا جاتا تھا اور وہ اپنی خوراک الگ سے پکواتے تھے لیکن نیوندرے اور دیگر رسموں میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔۔

1947ء میں بدامنی اور فسادات کی آگ پھیلی تو دھیرے دھیرے ہمارے گاؤں جوکالیاں تک آ گئی۔۔ جتنے سکھ سردار تھے اپنے بال بچوں سمیت مقامی گوردوارے کی دو منزلہ عمارت میں محصور ہو گئے۔۔ چونکہ جوکالیاں دوسرے دیہات کی نسبت جاٹ برادری کی وجہ سے زیادہ محفوظ تھا اس لیے آس پاس کے جتنے گاؤں تھے وہاں سے بھی سکھ خاندان اس گوردوارے میں پناہ گزیں ہوئے۔۔ مقامی لوگ جن میں مسلمان جاٹوں کی اکثریت تھی ان سکھ خاندانوں کی ڈھارس بندھاتے رہے کہ تم ہماری برادری کے ہو۔۔ تم اگر چیمے' چٹھے

باجوے ہو تو ہماری بھی یہی ذات ہے' ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی ہاتھ بھی نہ لگا سکے گا.. تمہاری بہو بیٹیاں ہماری اپنی ہیں.. وہ اُنہیں خوراک پہنچاتے رہے اور اُنہیں وہاں سے نکال کر بہ حفاظت ہندوستان پہنچانے کی سعی کرتے رہے.. لیکن اس دوران مشرقی پنجاب سے لُٹ کر اور اپنی بہو بیٹیوں کو کھو کر آنے والے آ گئے اور اُن کی آنکھوں میں اُن کی عصمتیں اور خون تھا.. اور اُنہوں نے جوکالیاں کے لوگوں کو بے بس کر دیا.. بے شک کچھ گاؤں والے بھی اُن کے ساتھ دولت کی حرص میں شامل ہو گئے.. سکھوں نے مقابلہ تو کیا مگر کہاں تک.. گورودوارے کو آگ لگا دی گئی اور سینکڑوں افراد.. بوڑھے اور بچے' عورتیں جل کر راکھ ہوئے.. درجنوں سکھ چوہدرانیاں گورودوارے کے صحن میں واقع کنوئیں میں کود گئیں.. گاؤں کے سب سے معتبر اور عالم فاضل مولوی نور دین نے اپنے گھر میں ایک سکھ خاندان کو پناہ دے رکھی تھی.. یلغار ہوئی تو وہ اپنے خاندان سمیت گھر کے باہر کھڑے ہو گئے کہ پہلے تم ہمیں قتل کرو گے پھر میرے مہمانوں تک پہنچو گے.. اُن کے نورانی چہرے اور سفید ریش کو مقابل پا کر انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے لوگ.. اُنہیں برا بھلا کہتے لوٹ گئے.. مولوی نور دین کی پناہ میں آیا ہوا یہ واحد سکھ خاندان تھا جو باقی بچا.. بہت عرصہ پہلے جب مجھ اپنے آبائی گاؤں جانے کا اتفاق ہوا تو میں اُس گورودوارے میں گیا.. اب یہ ایک "ڈنج گھر" کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے مہاجرین کی ملکیت میں تھا.. دیواروں کے کچھ نقش و نگار ابھی باقی تھے' اگرچہ اُس آگ کی سیاہی اُنہیں دھندلاتی تھی جس نے برسوں پیشتر اُسے چاٹ لیا تھا.. صحن میں وہ کنواں ابھی تک موجود تھا اگرچہ وہ ملبے سے بھر چکا تھا.. مجھے بتایا گیا کہ ایک عرصے تک لوگ اس میں اُتر کر سکھ سردارنیوں کے پہنے ہوئے زیور تلاش کرتے تھے.. اور اُنہیں ہڈیوں کے ڈھانچے بھی ملتے تھے..

تو جن کی ماؤں اور بہنوں کی وہ ہڈیاں تھیں وہ کیسے بھول سکتے تھے.. کیونکر بھول سکتے تھے..

لیکن وہ نسل جس نے یہ صدمے اور خون سہے بوڑھی ہو چکی.. خال خال باقی ہے.. رخصت ہو چکی یا ہو رہی ہے.. اور نئی نسل کے لیے یہ محض کہانیاں ہیں' جانے کس زمانے

کی کہانیاں ہیں اور وہ اپنے زمانے میں جیتے ہیں اس لیے اُن میں وہ تلخیاں نہیں ہیں..

وہی الگ سے نظر آتے سردار جی.. نزاکت سے باتیں کرتے اور ان کا نام ڈاکٹر جے۔ایس۔رانا تھا مجھے تنہا پا کر مجھ سے باتیں کرنے لگے.. اور باتوں باتوں میں پاکستان ٹیلیویژن کے پرانے ڈراموں کی تعریف کرنے لگے.. پھر اُن میں سے چند ڈراموں کے ڈائیلاگ دوہرانے لگے جو اُنہیں فرفر یاد تھے..

ان میں سے کچھ ڈائیلاگ مجھے یاد آنے لگے کہ میرے لکھے ہوئے تھے.. اور وہ ایک ڈائیلاگ دوہرا کر کہتے.. "سونہہ رب دی.. ان کا لکھاری میرے سامنے ہوتا تو میں اُس کا منہ چوم لیتا.. واہ.."

میں نے کچھ دیر تو ضبط کیا کہ میں ایک ریش زدہ سردار سے چوما نہیں جانا چاہتا تھا اور جب یارا نہ رہا اور میری خودنمائی عود کر آئی تو میں نے اقرار کر لیا کہ ان کا لکھاری میں ہوں..

""""ہزاروں راستے" اور "سورج کے ساتھ ساتھ" کے لکھاری آپ ہو؟"

میں نے اگرچہ بہت گھٹیا محسوس کیا لیکن نہایت فخریہ گھٹیا محسوس کرتے ہوئے کہا

"ہاں جی.."

اس پر وہ الگ سے دکھتے سردار جی میرے برابر سے اُٹھے اور میرے سامنے ننگے فرش پر براجمان ہو کر ہاتھ جوڑ لیے' واہگرو نے کیسے ملایا ہے.. ویسے آپ کا نام کیا ہے؟"

میرا نام تو شُدھ مسلمانوں کو بھی نہیں آیا تو ایک سردار جی کی سمجھ میں کیسے آتا..

"سردار جی آپ میرے کام کو جانتے ہیں' میرے لیے یہی بہت ہے.. نام کا کیا ہے.." اُن کے نہایت پسندیدہ دو کردار تھے.. ایک تو "ہزاروں راستے" کے عرفان کھوسٹ جو کچھوے کو "کاشوکوما" کہتے تھے اور سردار جی بار بار اس کی ادائیگی کرتے مجھے بتاتے تھے کہ ایسا کہتے تھے اور دوسرے "سورج کے ساتھ ساتھ" میں خیام سرحدی جو ایک موچی کے رُوپ میں "گل ای کوئی نئیں" ہر طربیہ یا المیہ صورت حال میں ادا کرتے تھے.. میں نے سردار جی کی بہت منت سماجت کی کہ پلیز آپ فرش سے اُٹھ کر ادھر میرے برابر میں صوفے

پر تشریف رکھیں لیکن وہ نہ مانے اور جب میں نے بہت اصرار کیا تو پھر ہاتھ جوڑ کر بولے ''مہاراج آپ نہ ہوتے تو ہم کنوارے ہی مرجاتے..تو مجھے یہیں بیٹھا رہنے دیں اپنے چرنوں میں...''

کیسے کنوارے مرجاتے' سردار جی نے ایک عجیب وغریب قصّہ سنایا جس کی تصدیق بعد میں ونود نے بھی کی..اُن کا کہنا تھا کہ جب اُن کی بیوی ہرشی سے اُن کی پہلی ملاقات ہوئی تو وہ دونوں دیر تک چپ بیٹھے رہے کہ کیا بات کریں..تب ہرشی نے ہمت کر کے کہا''کوئی گل کرو'' تو سردار جی نے جواب میں کہا''گل ای کوئی نئیں'' تو ہرشی نے خوش ہو کر کہا''اچھا تو آپ بھی ان دنوں پاکستانی ڈرامہ سیریل''سورج کے ساتھ ساتھ'' دیکھ رہے ہیں وہ تو مجھے بھی بہت پسند ہے۔اس کے بعد ڈرامے کے رومانوی ڈائیلاگ دہرائے جانے لگے اور یوں اُن کی گل چل نکلی اور بالآخر شادی ہو گئی..

مجھے یہ قصّہ سن کر ازحد مسرت ہوئی کہ یہ سیریل لکھنے کا ایک فائدہ تو ہوا کہ ایک سردار جی کنوارے نہیں مرے۔

ونود..میرا احفاظتی فرشتہ جو پارٹی میں بہت دل پسند تھا اور مجھے بھول کر مشغول ہو چکا تھا تانک جھانک کرتا باہر بالکونی کے باغیچے میں آیا اور مجھے وہاں پا کر اور ایک سردار جی کو میرے قدموں میں بیٹھے پا کر کہنے لگا''تارڑ صاحب آپ یہاں بیٹھے ہیں..کیوں بیٹھے ہیں..اندر آئیں ناں سرکار''

اس پر سردار جی نے کہا''کاشو کوما..''

ونود نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا''آیئے اندر چلیں''

اس پر سردار جی نے میرا بازو تھام کر کہا''گل ای کوئی نئیں..''

میں اُس کے ہمراہ اندر چلا گیا..

اندر جتنا بھی شور شرابا ہو رہا تھا اور شراب کی وجہ سے ہو رہا تھا وہ یکدم تھم گیا.. جتنا بھی ہلا گلا ہو رہا تھا وہ یکدم موقوف ہو گیا..حاضرین نہایت سوبر ہو گئے..اطمینان سے

بیٹھ گئے اور موسیقی کا دور شروع ہو گیا..طبلے پر تھاپ پڑی..اور اپنے دونوں بازوؤں میں طبلے کی جوڑی سمیٹے دلّی کے ایک مانے جانے اور نہایت سنجیدہ شخصیت کے مالک ڈاکٹر صاحب تھے..اُن کے ہمراہ ایک اور ڈاکٹر ہارمونیم پر سنگت کرتے گیت گانے لگے..وہ ڈاکٹر صاحب شکل کے بھی اچھے تھے اور سنگیت کے بھی..اور اُنہوں نے جتنے بھی گانے گائے اُن میں سے بیشتر محمد رفیع کے تھے کہ رفیع کی گائیکی ایک ایسا چیلنج ہے جسے قبول کرنے کا حوصلہ کم لوگوں میں ہوتا ہے..

اس کے بعد ہر کوئی گانے لگا..

پھر جس کا جو جی چاہا اُس نے گایا اور کیا اچھا گایا..

اس دوران یہ مسرتی ہجوم''ونود۔ونود'' کے نعرے لگاتا رہا اور اُس سے گانے کی فرمائش کرتا رہا..لیکن وہ شانت مسکراتا رہا..اس پر نکّی نے ہارمونیم سنبھال لیا..اُس کے سُروں کو پسند کے مطابق ترتیب دیا اور گانے لگی..اب میں تو توقع کر رہا تھا کہ وہ اپنی مدراسی بھاشا میں کوئی گیت الاپے گی لیکن وہ لہک لہک کر ٹھیٹھ پنجابی ٹپے گانے لگی اور اُس کی پنجابی کا شین قاف حیرت انگیز طور پر درست تھا۔گویا اہلِ زبان تھی۔''نکّا موٹا باجرا تیرا کون چُنیسی ڈھولا....''

میں نے حیرت سے ونود کی جانب نگاہ کی تو وہ میری پریشانی بھانپ کر مسکرانے لگا

''تارڑ صاحب میں نے اس مدراسن کو شُدھ پنجابی کر لیا ہے..''

پبلک نے جب بہت ہی اصرار کیا' شور مچایا تو ونود ہارمونیم کے سامنے آ بیٹھا..

کچھ دیر سُر ملاتا رہا اور پھر ایک نہایت پُرسوز آواز میں بلّھے شاہ کا کلام گانے لگا..آواز اچھی تھی اور اہم بات یہ کہ وہ کلام سمجھ کر گاتا تھا..

ونود نے بلّھے شاہ کے بارے میں مجھے ایک بہت اَن سُنی اور ناقابلِ یقین بات بتائی..اُس کا کہنا تھا کہ ایک مرتبہ وہ مسوری میں واقع اپنے پہاڑی گھر کی جانب سفر کر رہا تھا کہ اُسے ہارلو گنج نامی قصبے کے قریب ایک گنبد دکھائی دیا اور ایک چھوٹا سا بورڈ آویزاں دکھائی

دیا جس پر جلی حروف میں "مزار بلھے شاہ" لکھا تھا۔ جتنی دیر میں وہ یہ سمجھ سکا کہ اس بورڈ پر جو لکھا تھا کیا لکھا تھا' اتنی دیر میں وہ آگے نکل چکا تھا۔ مسوری میں قیام کے دوران اُسے یہی خیال ستاتا رہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بلھے شاہ کا مزار ان علاقوں میں ہو۔۔ کیا یہ وہی بلھے شاہ ہیں یا کوئی اور اُسی نام کے بزرگ ہیں جو وہاں دفن ہیں۔ چنانچہ جس روز دلّی واپسی ہوئی وہ اُسی راستے سے واپس ہوا اور اُس مزار پر جا رُکا۔ گنبد تلے واقعی ایک قبر تھی اور ایک باباجی اس کے نگہبان تھے۔ ونود ظاہر ہے اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ بابا بلھے شاہ قصور میں دفن ہیں تو اُس نے پوچھا۔ "بابا یہاں کون دفن ہیں؟"

جواب ملا "بلھے شاہ"

"کون سے بلھے شاہ؟" اس نے دریافت کیا۔۔

"عنایت صاحب والے بلھے شاہ۔۔" اُس شخص نے بتایا۔۔

جب شاہ عنایت کا حوالہ آ جائے تو پھر آپ کیسے دوبارہ پوچھ سکتے ہیں کہ کونسے بلھے شاہ۔۔ بلھے نوں سمجھاون آئیاں بہناں تے بھرجائیاں۔۔ چھڈ دے پلّا رائیاں۔۔

"لیکن وہ تو پاکستان کے شہر قصور میں رہتے تھے۔۔ یہاں کیسے آ گئے؟"

اس پر اُس درویش شخص نے ایک کہانی بیان کی "ہوا یوں کہ ایک مرتبہ افغانستان کا ایک بادشاہ یہاں آیا اور شدید بیمار ہو گیا۔ جب اُس کے بچنے کی کوئی اُمید نہ رہی تو اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ بلھے شاہ میرے مُرشد ہیں۔۔ کسی نہ کسی طرح اُنہیں بلا لو۔۔ وہ میری صحت یابی کے لیے دعا کریں گے تو میں تندرست ہو جاؤں گا۔ چنانچہ بلھے شاہ یہاں آ گئے۔۔ بادشاہ کے لیے دُعا کی اور وہ بھلا چنگا ہو گیا۔ پھر بلھے شاہ واپس نہیں گئے۔۔ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔۔ یہیں فوت ہوئے اور یہاں دفن ہوئے۔۔ ہر برس اکتوبر کی پہلی جمعرات کو اُن کا عُرس منایا جاتا ہے اور اُنہیں ماننے والے دور دور سے آتے ہیں۔"

کیا ہم میں سے کسی کو بھی یہ علم تھا کہ بابا بلھے شاہ ہندوستان کے پہاڑی علاقے مسوری کے آس پاس بارلو گنج میں بھی دفن بتائے جاتے ہیں۔۔ یقیناً یہ ایک داستانوی خیال ہے۔ اس کی توجیہہ تو پنجابی سکالر ہی کر سکتے ہیں کہ ایسی داستان نے کیسے جنم لیا۔ لیکن میں

اگر قیاس لگاؤں تو میری سمجھ یہ کہتی ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ بلھے شاہ کی الوہی شاعری صرف پنجاب کی حدود میں ہی قید ہو کر رہ جائے۔۔ وہ ہر انسانی سرحد پار کر جانے پر قادر ہے۔۔ بے شک ایسے خطوں میں چلی جائے جن کی ثقافت اور زبان سراسر مختلف ہو لیکن اُس کے اندر جو آسمان سے اُترنے والے صحیفوں ایسا سحر ہوتا ہے وہ بے زبانوں کو بھی اپنی زبان عطا کر دیتا ہے۔۔ ہم یہاں کبیر کی مثال بھی دے سکتے ہیں جس کا کلام پنجاب میں درویش گاتے پھرتے ہیں اور لوگ سمجھ سکتے ہیں۔۔ تو اس کی توجیہہ یہی ممکن ہے کہ ایسا ہوا کہ بلھے شاہ کا کلام پنجاب کے میدانوں سے کہیں بلند پہاڑوں کے راستے تک وہاں جا پہنچا۔۔ اُن خطوں کے مکینوں کو اسیر کیا اور اُنہوں نے وہاں اُن کی یادگار تعمیر کر لی۔۔ اُس کی پرستش کی خاطر ایک مزار بنا لیا جیسا کہ حضرت سخی سرور کے ساتھ ہوا کہ پنجاب بھر میں اُن کے مزار اور یادگاریں ہیں۔۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ بلھے شاہ یا سخی سرور دراصل کہاں دفن ہیں اُن کی ہڈیاں کس مٹی میں ہیں کہ اُن کی رُوح لوگوں کے دلوں میں تیرتی ہے۔۔

"بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں۔ گور پیا کوئی ہور"

تو مسوری کے قریب اُس گور میں بلھے شاہ ہیں یا کوئی اور ہے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔

ونود جو ابھی صوفیانہ کلام میں غرق تھا ابھی مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "ویسے تارڑ صاحب۔۔ سیاست کی بات نہیں کرتے لیکن جناب آپ نے 1965ء کی جنگ کے دوران جو ملّی نغمے تخلیق کیے اُن کے سُروں کی کیا بات ہے۔۔ اُنہوں نے ہمیں مات کر دیا۔"

مجھے یکدم جھٹکا سا لگا کہ ونود بے شک کچھ زیادہ ہندو نہیں ہے' پھر بھی تھوڑا بہت تو ہے اور یہ ہندو بچہ اپنے خلاف لکھے جانے والے نغموں کی توصیف کر رہا ہے۔۔

"میں بھی سیاست کی بات نہیں کر رہا ونود۔۔ کہ کون جیتا کون ہارا لیکن ہمیں بھی پہلی بار۔۔ اور شاید آخری بار اپنی مٹی کی قدر ہوئی اور ہم نے اس کے گیت گائے۔۔ اگر تم نے انہیں پسند کیا تو یقیناً اپنی مٹی کے حوالے سے محسوس کرتے ہوئے پسند کیا۔"

”تو ایک پاکستانی ملّی نغمہ پیش کرتا ہوں خواتین و حضرات..“ ونود نے کھنکار کر اعلان کیا اور پھر نہایت خشوع و خضوع سے ”جاگ اٹھا ہے سارا وطن ساتھیو مجاہدو“ الاپنے لگا.. جہاں ہارمونیم ساتھ نہ دیتا یا بول یاد نہ آتے وہاں وہ ”ڈڈم..ڈم..ڈی ڈی..ڈڈم“ کر کے ردھم کو مکمل کر لیتا..

میں نے ایک بار.. مسکراتے مسکراتے بے حال ہو کر کہا ”ونود بھیا آپ اپنے خلاف ہی گیت گاتے چلے جا رہے ہو..“

تو وہ کہنے لگا ”تارڑ صاحب.. میں اپنے حق میں گا رہا ہوں کہ میں اپنے وطن کے ساتھیوں اور مجاہدوں کو ذہن میں لا رہا ہوں.. اور خلاف بھی ہو تو کچھ پروا نہیں.. دُھن کیسی ظالم ہے۔“

جب وہ بلند آہنگ ”ساتھیو مجاہدو“ گا گا کر نڈھال ہو گیا تو میں نے اُسے اپنے سب سے پسندیدہ صوفی تبسم کے تحریر کردہ اور نور جہاں کے ڈوب کے گائے ہوئے گیت ”ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے“ کے بارے میں بتایا اور وہ یہ شاعری سن کر آبدیدہ ہو گیا کہ بیٹے چاہے کسی مذہب و ملت کے ہوں دکانوں پر فروخت نہیں ہوتے.... میں نے اُسے اسی بے مثل شاعر اور مغنیہ کے گیت ”میرا سوہنا شہر قصور نئیں“ کے بارے میں بھی بتایا کہ جب آپ کے طیاروں نے قصور شہر کے اُس محلے کو ملیامیٹ کیا جہاں نور جہاں نے جنم لیا تھا تو کیسے اُس کے دل سے ہُوک اُٹھی تھی کہ ”میرا سوہنا شہر قصور نئیں..“

رات کے بارہ بجے تو روشنیاں جو پہلے بھی کچھ ایسی روشن نہ تھیں مزید مدھم ہو گئیں.. صرف وہ چراغ لَو دیتے تھے جو لوگوں کے چہروں پر جلتے بجھتے تھے اور ایسے جلتے بجھتے وقتوں کے استقبال کے لیے میزبان ڈاکٹر گریش نے گلابی رنگت کی شیمپین کی ایک بوتل سنبھال رکھی تھی جس کا انہوں نے نہایت اہتمام سے کارک اُڑایا' اُس میں سے اُبلتی جھاگ سے اپنا اور بیس برس سے مسلسل محبت کرنے والی بیگم کا چہرہ بھگویا اور پھر مہمانوں کی خدمت میں اس نایاب شراب کو پیش کر دیا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ اس میں سے صرف

ایک ایک گھونٹ بھرا جائے..

اور ہاں جب رات کے بارہ بجے تو میں نے اپنے مداح سردار جی سے کہا کہ بھائی جی آپ کے بھی بارہ بج گئے ہیں. تو اُنہوں نے حیرت سے کہا ”آہو جی.. اگر سب کے بج گئے ہیں تو ہمارے بھی بج گئے ہیں.. کیوں ہمارے نہیں بجنے تھے..“ وہ ایک ماڈرن ڈاکٹر سردار جی تھے اور نہیں جانتے تھے کہ اُن کے بزرگوں کے بارہ بجے کسی اور طرح سے بجا کرتے تھے..

میں اس ڈاکٹر جوڑے کی مسرت میں پوری طرح شامل تھا.. وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہوئے جیتے تھے' اُن کی عشق آتش بیس برسوں میں بھی کم نہ ہوئی تھی.. کیا ایسا ممکن ہے؟.. ایک عشق خاص بیس برس کی رفاقت کے بعد بھی.. دنیا کے جھمیلوں.. معاشی اور معاشرتی مجبوریوں کے باوجود بھی.. اتنے برس مسلسل ایک دوسرے کے ساتھ سونے.. بچوں کے باوجود.. خراٹے لینے.. منہ کھول کر.. رالیں بہنے اور بدنی بوؤں کے خارج ہونے اور بیماریوں کے باوجود بھی.. یہ عشق قائم رہے.. یہ ممکن تو نہیں لگتا سوائے اس کے کہ فریقین عشق سے روندے جائیں' نابینا ہو جائیں.. ایسے روندے گئے نابینا لوگوں کو.. کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں.. گلابی.. بلبلے اُڑاتی شیمپین کے صرف ایک ایک گھونٹ نے ایسا اثر کیا جو معزز مہمانوں کی شب بھر کی مے خواری نے بھی نہ کیا تھا.. اور وہ سب ایک گونا بے خودی میں مسرت میں غرق موسیقی کی تال پر ناچنے لگے.. وہ سب اتنے خوش تھے کہ مجھے اُن کی خوشی سے حسد ہونے لگا..

ایک صوفے پر براجمان میں فردِ واحد تھا جو اس خوشی میں شریک نہ تھا.. اگرچہ کچھ لوگوں نے اصرار بھی کیا لیکن میں مسکرا کر معذرت کر لیتا کہ نہ مجھے چاؤ تھا' نہ عمر تھی اور نہ ہی اتنی سکت کہ ان نوخیز بدنوں کا ساتھ دے سکتا..

ہمارے ہاں خوشی پر مکمل پابندی ہے.. خوشی کو خاصا مضرِ صحت سمجھا جاتا ہے.. خاص طور پر ہمارے علماء مسرت کے کسی بھی اظہار کو برداشت نہیں کر سکتے.. نئے سال کی رات ہو' بسنت ہو یا موسیقی کی کوئی محفل ڈنڈہ بردار فورس کا خدشہ موجود رہتا ہے.. برس ہا برس کی نا ردا

اور مذہب کے نام پر نافذ کی گئی پابندیوں نے ہم سب کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے.. بے شک مداخلت کا کوئی امکان نہ ہو لیکن ہمیں مداخلت کا ڈر رہتا ہے.. ہم نفسیاتی طور پر زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت کھو چکے ہیں.. خوش ہوتے ہیں تو ساتھ میں مجرم بھی محسوس کرنے لگتے ہیں.. ہم وہ پرندے ہیں جنہیں آزاد کر بھی دیا جائے تو وہ آزاد فضا میں چند لمحے پھڑ پھڑا کر خود اپنی من مرضی سے پھر سے پنجرے میں چلے جاتے ہیں.. شاید اسی لیے مجھے ان لوگوں کی خوشی سے حسد ہونے لگا تھا..

ایک دراز قامت تیکھے نقوش والی خاتون.. ساڑھی میں لپٹی ہوئی بار بار مجھ پر ترس کھاتی تھیں اور ہاتھ بڑھا کر مجھے رقص میں شامل ہونے کو کہتی تھیں.. وہ اکثر اپنے شریک رقص کو چھوڑ کر سُر کے ساتھ سر ہلاتی مسکراتی میری جانب ہاتھ بڑھاتیں اور میں اُن سے ہاتھ ملا تو لیتا لیکن اُٹھتا نہیں تھا' مسکرا مسکرا کر معذرت کرتا چلا جاتا تھا.. بے شک مجھ میں اس مسرت میں شریک ہونے کی ہوس تو تھی کہ بقول وارث شاہ... طبع ہالی دی حرص تھیں نہ باز آئی.. لیکن میں جانتا تھا کہ میں مجرم محسوس کروں گا.. میرے اندر ایک بڑا ڈر ہو گا کہ ابھی کوئی ٹولہ ڈنڈے لہراتا فلیٹ میں داخل ہو گا کہ سنا ہے یہاں فحاشی پھیلائی جا رہی ہے اور پھر وہ ان لوگوں کو تو کچھ نہ کہیں گے البتہ مجھے زد و کوب کرتے لے جائیں گے کہ میں مسلمان ہوں.. اس ڈر اور احساس جرم کے سوا میں یہ بھی جانتا تھا کہ میرے قدم بے ربط ہوں گے' میرا بدن ساتھ نہ دے گا اور وہ جو ایک زمانے میں ہم نے وِکٹر سلوسٹر سکول آف ڈانسنگ انگلینڈ سے 'والز' فوکس ٹراٹ' رمبا اور مشکل ترین رقص ٹینگو میں مہارت کا جو سرٹیفکیٹ حاصل کیا تھا وہ کچھ کام نہ آئے گا کہ ڈر کے ساتھ عناصر میں اعتدال بھی نہ تھا.. بعد میں مجھے بہت افسوس ہوا کہ وہ خاتون میری غریب الوطنی پر ترس کھاتی مجھے مدعو کرتی تھیں تو مجھے اُن کی دعوت قبول کر لینی چاہیے تھی چاہے رقص کے نتیجے میں اگلی سویر میری ریڑھ کی ہڈی کے مُہرے شطرنج کی چالیں چل رہے ہوتے..

سنہری اُلو کے شہر میں ونود کیسا مہربان جن تھا جو مجھے اس شام سحر انگیز میں لے آیا تھا..

''گوری سوئے سیج پر اور مُکھ پہ ڈارے کیس''

سویرا ابھی کچھ دور تھی..

البتہ رات بہت گزر چکی تھی.. تین بجے کا وقت ہو گا جب ایک کار نئی دلّی کی سنسان سڑکوں پر رواں تھی' مجھے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر چھوڑنے جا رہی تھی..

اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر میں ونود تھا اور پچھلی نشست پر میں گزر چکی شام سحر طراز کے خمار میں گم تھا اور نکی جانے کس زبان میں اپنے پیارے ونود سے سرگوشیاں کرتی تھی..

تب ونود نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا ''تارڑ صاحب.. آپ نے سلطان جی کے ہاں تو حاضری دی ہو گی..''

''کون سے سلطان جی؟'' میں نے چونک کر پوچھا..

''اپنے سلطان جی..''

''آپ کے سلطان جی..''

''ہم سب کے سلطان جی.. حضرت نظام الدین اولیاء۔ سلطان ء المشائخ.. محبوبِ الٰہی سلطان جی..''

میں تو دنگ رہ گیا کہ یہ ہندو بچہ کیسے فر فر یہ القاب الاپ رہا ہے..

''نہیں.. ابھی تو اتفاق نہیں ہوا.. البتہ ارادہ تو ہے..''

ونود نے اپنی عینک درست کی اور میں نے پہلی بار اُس کے چہرے پر ناراضی کے

کچھ آثار ہویدا دیکھے ''تارڑ صاحب آپ نے ابھی تک میرے مُرشد کے مزار پر حاضری نہیں دی..''

یہ ایک اور حیرت تھی ''آپ کے مُرشد؟''

''جی.. وہ میرے مُرشد ہیں.. مجھے زندگی میں جو کچھ ملا اُن کی بدولت ملا اور حضرت سلیم چشتی کی نظرِ عنایت سے ملا..''

ظاہر ہے میرے لیے اس بیان میں اچنبھے اور استعجاب کے بہت سے پہلو تھے.. کہ ایک کھتری ان ہر دو فقراء کے لیے کیسے عقیدت سے شرابور جذبات رکھتا تھا.. ایسے جذبات جنہیں میں محسوس کرنے کے قابل نہ تھا.. میں ان دونوں بزرگوں کے مقام سے کسی حد تک آگاہ ضرور تھا لیکن ان کی قربت کی خواہش مجھ میں نہ تھی..

''میں تو ان دونوں کا بندہ ہوں.. مُرید ہوں.. سلطان جی کے ہاں تو آتے جاتے حاضری دیتا رہتا ہوں.. متھا ٹیکتا رہتا ہوں.. اور سال میں ایک بار فتح پور سیکری کی بلند دروازے والی مسجد کے صحن میں جو حضرت سلیم چشتی کا مزار ہے وہاں قوالی کا اہتمام کرتا ہوں..''

ونود کیا عجیب و غریب تواہم پرست جن تھا..

''انشاء اللہ کل حاضری دوں گا..'' اگرچہ کل میں تاج محل کی زیارت کے لیے آگرہ جا رہا تھا لیکن میں نے ونود کا دل رکھنے کی خاطر کہہ دیا..

''ابھی کیوں نہیں؟''

''ابھی؟''

''ہاں..''

''رات کے تین بج رہے ہیں..''

''یہی تو وقت ہے..''

رات کے اُس پہر.. جب ہر سُو سناٹے تھے.. تاریک خاموشی در و بام پر اُترتی تھی

ہم جن گلی کوچوں میں داخل ہوئے اُنہیں نئی دلّی کی کشادگی امارت اور نفاست سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا.. یہ کوئی اور شہر تھا' کوئی اور بستی تھی.. بوسیدہ' مسمار ہوتی ہوئی' اداس اور قدیم.. غربت سے نچڑتی تاریک اور بے سہارا.. عُسرت زدہ.. ہر مکان کی اینٹیں آخری دموں پر.. کھسکتی ہوئی.. بند دوکانوں کے تھڑوں پر اور ساکت ٹھیلوں پر بے سُدھ پڑے ناتواں لوگ.. ہماری کار بمشکل اس خوابیدہ غربت میں سے راستہ بناتی تھی.. نالیاں ان ڈھکی اور ایک عجیب بُو جو رات کے اس سمے مزید گھنی ہوتی تھی بے ترتیبی اور کھنڈر پن.. ڈرائیور نے بمشکل کار پارک کرنے کے لیے ایک برگد کے قریب جگہ تلاش کی.. نکی بیٹھی رہی اور میں اور ونود ایک سوئے ہوئے کوچے میں داخل ہوئے جو کوچہ دُلدار تو نہ لگتا تھا لیکن ایک بلند دروازہ اُس کی بوسیدگی میں سے نمودار ہوا جو گواہی دیتا تھا کہ اُس کے اندر کچھ تو ہے.. کچھ تو ہے جس کی پردہ داری یہ در کر رہا ہے..

دو ناتواں' کھڑی ٹوپیوں والے.. نچّی داڑھیوں والے حضرات آنکھیں ملتے جانے کہاں سے نمودار ہو گئے اور مُنکر نکیر ہو گئے.. جو راستہ ہمیں دکھائی دے رہا تھا ہاتھ بڑھا بڑھا کر.. ''حضرت ادھر آئیے' ادھر چلیے.. ادھر تشریف لائیے'' کہتے' کورنش بجا لاتے' ہمارے شانوں پر سے جھانکتے ہمیں وہ راستہ دکھانے لگے.. وہ خوابیدہ تھے اس پہر اور اُن کی ناکوں نے عقیدت کی بُو سونگھ لی تھی اور وہ ٹوپیاں درست کرتے اپنا خراج وصول کرتے تھے..

اس بلند دروازے میں ایک مختصر بغلی پھاٹک تھا جسے دھکیلنے کے لیے میں نے ہاتھ بڑھایا تو ایک منکر نے یا نکیر نے فوراً اپنا ہاتھ آگے کر دیا ''حضرت میں کھولتا ہوں''

میرا گمان تھا کہ پھاٹک میں سے داخل ہوتے ہی نظام الدین کا مرقد نظر کے سامنے آ جائے گا.. پر نہیں.. آگے تو بل کھاتی سُرنگ نما بھول بھلیاں تھیں جن میں ہم چلتے گئے.. چلتے' نہیں' پھلانگتے اور ٹاپتے گئے کہ ان راہداریوں میں لاتعداد زائرین اور زیادہ تر فقیر.. ننگے فرش پر بے سُدھ پڑے تھے.. سُکڑے ہوتے ہوئے.. سمٹے ہوئے.. جیسے ماں کی کوکھ میں بچہ ہوتا ہے.. ٹانگیں پھیلائے.. مُردوں کی مانند پڑے تھے جیسے میدان جنگ میں

لاشے پڑے ہوتے ہیں ان میں ناتواں بچے بھی تھے اور چیتھڑوں میں لپٹی عورتیں بھی.. ہم ان سانس لیتی لاشوں میں سے راستہ بناتے.. اور اُن کے بدنوں سے اُٹھتی بُو کو برداشت کرتے چلے گئے..

ان پُر پیچ راہداریوں میں سے نکلے تو کھلی فضا میں نکلے اور ایک مختصر احاطہ نظر میں آیا جس کے بیچ میں سلطان جی کا مزار نظر میں آیا۔ آس پاس وہی فرقت زدہ مکان جھانکتے تھے اور کچھ کمر خمیدہ شجر تھے.. اور رات میں تھے..

ولو نے تو بلند دروازے کے بغلی پھاٹک میں داخل ہوتے ہی اپنے سر کو ایک رومال سے ڈھانپ لیا تھا اور وہ جھکا جھکا چلا آتا تھا.. البتہ میں ننگے سر تھا اور سر اُٹھائے آس پاس کے مشاہدے میں مگن تھا.. ولو مزار کے قریب ہوا.. جالیوں کو انگلیوں سے مَس کیا اور پھر ذرا پیچھے ہو کر سجدہ ریز ہو گیا یعنی اُس نے ماتھا ٹیک دیا لیکن کسی ایک مقام پر تادیر نہ رہا.. تھوڑی دیر کے بعد اٹھتا اور ذرا آگے ہو کر پھر سے فرش پر ماتھا رکھ دیتا..

یہ مقبرہ ایسا نہ تھا کہ دل پہ وارد ہو جائے اور اُس پر ایسا اثر کرے کہ انسان نہ بھی جانتا ہو تو جان جائے کہ اس کے اندر ایک صوفی سلطان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا.. سلطان جی کے فنا شدہ جسد خاکی پر جو عمارت کھڑی تھی' نہایت معمولی اور بے کشش تھی.. یہ نہیں کہ اُن کی بڑائی کو ایک تاج محل درکار تھا.. نہیں.. لیکن اُن کے رُتبے کے مطابق چاہے صرف ایک قبر نمایاں ہوتی مگر اُس میں کچھ تو ذوق جمال ہوتا.. وہ دلّی کے پیٹرن سینٹ تھے اور اُن کے مزار پر حاضری دینے والے کیا ہندو کیا مسلمان یہاں لاکھوں نچھاور کر کے خوش خوش جاتے تھے.. جانے اُن لاکھوں کو کہاں خرچ کیا جاتا ہے اور کس کی تجوری میں چلے جاتے ہیں.. اگر علی ہجویری کے مزار کو وسیع اور پُرشکوہ کیا جا سکتا ہے تو سلطان العارفین کی جانب بھی کوئی توجہ کرے.. بہاؤالدین زکریا' شاہ رکن عالم جہانیاں جہاں گشت' شہباز قلندر.. یہاں تک کہ وارث شاہ اور بلھے شاہ کے مرقد اُن کی درویشی اور عظمت کی زبان بولتے ہیں.. بہاؤالدین زکریا کے گنبدوں تلے قدیم ہوائیں اور موسم جون کے لوں محسوس ہوتے ہیں اور آپ کا سر خود سے جھکتا چلا جاتا ہے.. وہ موسم دل میں اُتر کر آپ کو کسی اور جہان میں لے جاتے ہیں..

باہر کا جہان باہر رہ جاتا ہے اور اندر کا جہان آباد ہو جاتا ہے..

رات کے اس پہر میں نے صرف ایک سیاہ ریش شخص کو دیکھا جو مزار کے ایک ستون سے ٹیک لگائے اپنے آپ میں گم عبادت میں مگن تھا اور ہماری موجودگی سے بے خبر تھا..

بائیں جانب پیپل کا ایک بہت قدیم دکھتا پیڑ تھا جس کے تلے کچھ کوٹھڑیاں تھیں.. چھتوں پر کچھ ملنگ سو رہے تھے..

مجھے کچھ قلق ہوا کہ میں کیسا بودہ بندہ ہوں کہ در و بام کی آرائش اور عظمت کو ترستا ہوں اور اُس کے لیے نہیں ترسا جو اُن کے تلے خوابیدہ ہیں..

وہ کون تھا جو اس معمولی عمارت میں دفن تھا؟

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی.. سلطان جی.. تقریباً بانوے برس جیئے اور اس جینے میں متعدد سلاطین دلّی کے ادوار دیکھے اور پرکھے.. اُن میں سے کچھ اُنہیں چاہنے اور ماننے والے تھے اور کچھ نہ چاہتے تھے نہ مانتے تھے بلکہ بیر رکھتے تھے کہ ان کے گرد خلق ہجوم کرتی تھی اُن کی پرستش کرتی تھی اور یوں وہ اُنہیں اپنے تاج و تخت کے لیے خطرہ سمجھتے تھے..

اور جو سلاطین اُنہیں مانتے اور چاہتے تھے سلطان اُن کو بھی کہاں قریب آنے دیتے تھے "فقیر کے مکان کے دو دروازے ہیں.. سلطان اگر ایک دروازے میں سے داخل ہوگا تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا"

سلطان غیاث الدین تغلق جس کے لیے ابن بطوطہ نہایت نرم گوشہ رکھتا ہے' لکھتا ہے کہ وہ نہایت منصف مزاج اور عالم فاضل شخص تھا.. لیکن وہ بھی ان سلطان سے خائف تھا.. بنگال کی ایک مُہم سے فارغ ہو کر اُس نے وہیں سے نظام الدین کو پیغام بھیجا کہ تم میرے پہنچنے سے پیشتر دلّی چھوڑ جاؤ.. اس پر سلطان جی نے اُسی پیغام کی پیشانی پر "ہنوز دلّی دُور است" رقم کر کے واپس بھیج دیا.. اور کہا تو یہی جاتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق ابھی

راستے میں ہی تھا اور دلّی ابھی دور تھی جب ایک محل جس میں وہ شب گزارتا تھا اُس کی چھت گرنے سے وہ ہلاک ہوگیا.. اسی نوعیت کے اور کئی معجزے اُن سے موسوم ہیں..

سب تو نہیں بیشتر معجزے اور کرامات مریدین کی بے غرض محبت اور نابینا چاہت کی پرواز ہوتے ہیں.. ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ دراصل پیر نہیں اُڑتا مُرید اُسے اُڑاتے ہیں.. لاہور میں سینکڑوں پیر فقیر ایسے ہیں جن کے بارے میں ہزاروں کراماتیں مشہور ہیں اور اگر آپ کو اپنی جان عزیز ہے تو آپ کم از کم اُن کے مزار کے آس پاس تو کسی شبے کا اظہار نہیں کر سکتے..

گوالمنڈی لاہور میں ہماری ایک چھوٹی سی جائیداد چیمبرلین روڈ پر واقع ہے.. اس کے عقب میں پرانی سبزی منڈی ہوا کرتی تھی.. اس جائیداد کے پچھواڑے میں ایک نامعلوم قبر تھی جو ہمارے حصے میں واقع تھی.. میرے والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ پاکستان بننے سے پیشتر سینکڑوں کشمیری ہاتو محنت مزدوری کرنے کی خاطر سبزی منڈی میں آیا کرتے تھے اور ان میں سے ایک نامعلوم ہاتو فوت ہوگیا.. اُس کا کوئی وارث نہ تھا.. چنانچہ اُسے یہاں دفنا دیا گیا.. پھر یہ آنکھوں دیکھا قصہ ہے کہ علاقے کے معززین ہمارے پاس آئے کہ آپ کی جائیداد میں جو ایک قبر شامل ہے وہ تو ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہیں اور ہم اُن کا عرس منا رہے ہیں اور ہم نے آپ کی دستار بندی کرنی ہے.. ہم بھلا کیسے انکار کرتے، چپکے سے دستار بندی کروالی اور ڈھول کی تھاپ پر سر ہلانے لگے.. والد صاحب کی وفات کے بعد میں ایک روز اُس کھنڈر نما جائیداد کا جائزہ لینے کے لیے گوالمنڈی گیا اور پچھواڑے میں گیا تو وہاں ایک نہایت طویل ناموں والے.. بخاری.. السیدی.. پیران پیر.. حضرت فلاں کی تختی آویزاں تھی اور متعدد ملنگ حضرات چرس کے نشے میں دُھت دھمال ڈال رہے تھے.. مُریدین پھول چڑھا رہے تھے.. اور ان مُریدوں نے مجھے ان "شاہ صاحب" کے معجزوں اور برکات کی ایک طویل فہرست سنائی اور جھومنے لگے..

میں "ہنوز دلّی دور است" کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کر رہا..

اگر میں اپنی نظروں کے سامنے اپنی ملکیت میں دفن ایک کشمیری ہاتو کی کرامات سے

انکار نہ کر سکا تو سلطان جی تو واقعی صاحب کرامات تھے.. لیکن مجھے زیب داستان کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے..

غیاث الدین تغلق کی وفات کے چند روز بعد آپ کا بھی انتقال ہوگیا.. البتہ یہ ہے کہ اُس کے جانشین بیٹے محمد تغلق نے اپنے باپ کے دلّی سے دور رہ جانے پر کچھ ملال نہ کیا اور سلطان العارفین کے جنازے کو کاندھا دینے کے لیے حاضر ہوگیا..

بعد میں اکبر اعظم نے اُن کا مزار تعمیر کروایا.. اور پھر انوکھے لاڈلے اور رنگ رنگیلے محمد شاہ نے اس کی تزئین اور آرائش کی.. ظاہر ہے موجودہ مزار وہ نہیں ہے جسے اکبر نے بنوایا تھا کہ وہ بیٹے سلیم کے علاوہ ذوق سلیم بھی رکھتا تھا جو اُس کے اپنے ڈیزائن کردہ ذاتی مقبرے میں کیا پُر پیچ اور کشیدہ کاری ایسی نفاست میں نظر نواز ہوتا ہے.. اور اگر محمد شاہ رنگیلا اُن کے مزار کی آرائش کرتا ہے تو اپنے ذوق کے مطابق۔ اُس نے اسے سنوارا ہوگا.. اکبر اعظم اور محمد شاہ رنگیلا کا تعمیر کردہ اور تزئین شدہ یہ مزار تو نہیں.. جانے اسے کس نے بنوایا تھا..

ہمارے علامہ اقبال نے بھی اُنہیں.. سلطان جی کو.. لینن اور بابا گورو نانک کی طرح کیسے شاندار شعروں میں یاد کیا ہے..

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

میں چونکہ اقبال نہ تھا اس لیے اُس لحد کی زیارت زندگی دل کی نہ ہوئی اور مسیح و خضر میرے لیے نظام الدین اولیاء سے اونچے مقام پر ہی رہے.. شاعری اور شاعروں سے مجھے یہی گلا رہا ہے کہ وہ آتش جذبات میں بھڑکتے اپنے حسن کرشمہ ساز سے جو چاہیں کرتے ہیں بھلے حضرت عیسیٰ اور حضرت خضر اس آتش میں بھسم ہو جائیں اور دلّی کا ایک صوفی اُن سے بلند مرتبے پر فائز کر دیا جائے.. نثر میں البتہ یہ گنجائش نہیں ہوتی ایسی جذباتی آتش کی گنجائش نہیں ہوتی.. حقیقت اور سچائی کے کھرے پن کو بیان کرنا مجبوری ہوتی ہے..

اگر اس نوعیت کے جذبات نثر میں آ جائیں تو قابل گردن زدنی ٹھہریں..

ویسے یہ بھی کیا ابوالعجبی ہے کہ ایک ہندو کھتری سلطان جی کے مقام سے آگاہ تھا اور میں ایک جانب بے اثر اور لاتعلق کھڑا تھا..

شاید پچھلے برس جب میں اپنے بابا محمدؐ کی جالیوں کے سامنے آیا تو مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اُس کے بعد کسی اور مقام کا اثر نہ ہوا..

البتہ مجھ پر کچھ اثر ہوا تو مُرشد کا نہ ہوا.. اُس کے مرید کا ہوا.. امیر خسرو کا ہوا جو اپنے محبوب کی قربت میں سوتے تھے.. وہ ایک عرصے سے میرے دل میں رہتے تھے.. شاعری، موسیقی، خوبصورتی اور دل نوازی کے باعث.. کہتے ہیں کہ وہ ہندو مسلم ملاپ کی تصویر دل پذیر تھے.. نظام الدین کے اتنے چہیتے تھے کہ اُنہوں نے ایک بار کہا "جب حشر کا میدان گرم ہوگا اور جب انسان اپنے اپنے نامۂ اعمال لے کر مالک کے سامنے حاضر ہوں گے اور میرا مالک میرا اعمال نامہ دیکھنے کے بعد مجھ سے دریافت کرے گا کہ اے نظام تو دنیا سے میرے لیے کیا لایا ہے تو میں عرض کروں گا.. خسرو کے دل کا سوز!"

خسرو نے یہ سنا تو اُن پر وجد طاری ہوگیا

من تو شُدم تو من شُدی من تن شدم تُو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اپنے مُرشد کے عشق میں غرقابی کو بیان کیا تو کہا.. چھاپ تلک سب چھین لی مو سے نیناں ملائے کے..

خسرو دلّی سے دور تھے جب نظام الدین کا انتقال ہوگیا.. وفات کے بعد وہ دلّی پہنچے اور ان کی قبر کے سرہانے بیٹھ گئے..

گوری سوئے سیج پر اور مُکھ پہ ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چو دیس

روایت ہے کہ یہ شعر پڑھا اور وہیں دم توڑ دیا.. کچھ بیان ہیں کہ چھ ماہ بعد انتقال ہوا..

خسرو کے مزار پر.. ایک سیاہ رات میں.. میں کچھ لمحوں کے لیے یکسر تنہا تھا کہ درویش شخص سلطان جی میں کھویا ہوا تھا اور ونو وہاں سجدہ ریز تھا اور وہ باریش منکر نکیر اُس کے آس پاس منڈلاتے تھے کہ اُنہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بس اس تل میں تیل ہے..

اور اُس دشت تنہائی میں.. کیسے کیسے پُرسحر راگ جنم لیتے تھے.. پہیلیاں کہتے تھے کہہ مکرنیاں سناتے تھے.. خسرو کی پوروں سے جنم لینے والی ستار نے دنیا بھر کے انسانوں کے رگ و پے میں کیسے کیسے سُر سرایت کیے.. قوالی کے موجد بھی وہ کہلاتے تھے.. میری مختصر سمجھ بوجھ سے تو باہر ہے کہ ایک ہی شخص کی سمجھ میں سے معجزوں کے اتنے سارے جھرنے کیسے پھوٹے.. بڑی شاعری اور بڑی موسیقی سے بڑھ کر اور کیا معجزے ہو سکتے ہیں..

چل خسرو گھر اپنے..

"آئیں تارڑ جی گھر چلتے ہیں۔" ونو نے کھڑی ٹوپیوں والے پیرانِ تسمہ پا کی نذر بہت کچھ کیا اور ہم مزار سے باہر آ گئے.. اُس نے ابھی تک اپنے سر کو ڈھانک رکھا تھا اور ایک ایسا بحری قذاق لگ رہا تھا جس نے لوٹ مار میں ہاتھ آ جانے والی عینک شغل کے طور پر پہن رکھی تھی کہ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے..

"ونو آپ نے تو اپنے مُرشد کے در پر حاضری دے لی.. اس دلّی میں یہیں نظام الدین کے آس پاس میرا مُرشد بھی دفن ہے.. رشتے میں میرا چچا لگتا ہے.. وہ کیا کہے گا کہ بھتیجا دلّی تو آیا اور ایک درویش کے مرقد پر حاضری دے کر چلا گیا اور برابر میں مقیم مجھ رِند کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔"

ہم پھر سے اُنہی گلیوں میں.. رات میں.. تاریکی اور بوسیدگی میں سنبھل سنبھل کر چلنے لگے کہ کہیں کسی خوابیدہ بدن پر پاؤں نہ آ جائے.. کچھ دیر بعد منظر کچھ کھلا.. نظر کے سامنے ایک.. مکانوں میں گھرا احاطہ کھلا.. احاطے کے درمیان میں ایک قبر پر سایہ کرتی ایک مختصر عمارت تھی لیکن اُس کی قربت کا کچھ امکان نہ تھا کہ چار دیواری میں نصب آہنی گیٹ مقفل تھا..

ہم اُس قبر کے قریب نہ جا سکتے تھے..

لیکن اس سے کچھ فرق نہ پڑتا تھا..

جیسے بلھے شاہ کہاں دفن ہیں اس سے کچھ فرق نہ پڑتا تھا..

وہ جو غرقِ دریا نہ ہوا.. وہ خود میرے لاہور میں میرے قریب رہتا تھا.. زندگی بھر میرے زخموں پر پھاہے رکھتا رہا تھا' میرے چوٹوں کو ٹکور کرتا رہا تھا.. جب میرا عشق میرے سامنے ہوتا تھا تو میں چپ رہتا تھا اور وہ بولتا تھا کہ لگائے نہ لگے.. وہ کون سے دُکھ اور سُکھ ہیں جن میں وہ میرا شریک نہ ہوا.. جو بھی دل کی اور رُوح کی بیماریاں تھیں اُن کا مسیحا وہ تھا.. گویا ابنِ مریم تھا.. ایک بادہ خوار ہونے کے باوجود میرے لیے ایک ولی تھا.. بلکہ اُن سے افضل تھا کہ ولی تو خلقِ خدا میں نہیں اپنے آپ میں گم رہتے ہیں اور وہ میرے لیے اپنے آپ کو فنا کرتا تھا..

خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے بھی وہ میرے ہمراہ تھا۔ بلھے شاہ کے ساتھ اور کہتا تھا کہ کعبہ کس منہ سے آگئے ہو.. آخری وقت میں تم کیا خاک مسلماں ہو گے.. یہاں تک کہ غارِ حرا کی رات کی تنہائی میں بھی وہ سرگوشی کرتا تھا کہ غور کرو ابر کیا چیز ہے' ہوا کیا ہے.. گر تجھ بن کوئی نہیں موجود.. یہ ماجرا کیا ہے.. پتہ کرو کہ ماجرا کیا ہے.. اور ہے تمنا کا دوسرا قدم کہاں یا رب.. آئینہ داری' ایک دیدۂ حیراں مجھ سے.. نقش فریادی ہے..

اُسے حاجت ہی نہ تھی کسی ذی شان آسمان تک جاتے گنبد والے مرقد کی.. کہ اُس کا کلام آسمان تو کیا کائناتوں سے کلام کرتا تھا.. اور عرش پر دستک دیتا تھا.. میں نے اُس کے لیے فاتحہ نہیں پڑھی.. زیرِ لب اُس کا کلام پڑھا..

سویرا ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی..

کار بہت آہستگی سے رواں تھی' دِلّی شہر کی سنسان شاہراہوں پر..

تب ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے ہوئے ونود نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور ہاتھ بلند کر کے اور سر ہلاتے ہوئے ایک سُر اٹھایا.. دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے.. اور میرے پہلو میں براجمان چپ اور میرا خیال تھا کہ اب تک نڈھال ہو چکی تھکی ہوئی تلی یکدم تروتازہ ہو گئی اور

اُس نے جیسے دوستوں سے بات کرتے ہیں اگلا مصرعہ اُٹھایا.. آخر اس درد کی دوا کیا ہے..

یوں ایک مصرعہ ونود کے لبوں سے ادا ہوتا اور دوسرا بھرجائی تلی اُٹھا لیتی..

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے

خلقِ خدا جہاں کہیں بھی بسیرا کرتی ہے اُن شہروں میں کونسا ایسا شہر ہوگا جس کی رات میں غالب کی چوکھٹ پر حاضری دینے کے بعد رات کے اس پہر ایسی تنہائی میں دو مترنم آوازیں اُبھرتی ہوں.. دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے.. اور میں ایک ایسی رات میں تھا..

اُسی دِلّی کی رات میں جس کے ایک کھنڈر میں ایک سنہری اُلو قیام پذیر تھا.. شاید اُس کے کھنڈر میں بس ایک صدا پہنچی ہو کہ.... ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے..

''اِک رنگین اُڑن کھٹولا عشق کا''

ایک چھریرے خوش بدن عقاب کی جسامت کا ایک پُر تکبر پرواز کرنے والا بڑے پروں والا پرندہ.. جس کے رنگ کسی زمانے میں فیئری میڈو میں پائے جانے والے مُرغ زرّیں کے بھڑکیلے دمکتے رنگوں ایسے تھے' یہاں سے نظر نہ آتے دریائے جمنا کی سطح پر سے اُٹھا.. اونچا ہوا.. وہ گرمی میں دہکتے نیلے آسمان کے پس منظر میں رنگوں کا ایک اُڑن کھٹولا تھا.. اونچا ہوا.. پھر پَر سمیٹ کر ذرا نیچے ہوا.. آسمان کے نیلگوں پس منظر میں سے نکل کر تاج کی دودھ سفید عمارت کے پس منظر میں آ گیا.. آیا تو ایک لمحے وہ رنگین تھا اور دوسرے لمحے سفید ہو گیا.. تاج کی دودھ سفید عمارت میں دودھ رنگ ہو کر مدغم ہو گیا.. ابھی وہ صد رنگ تھا اور ابھی تاج کے سامنے آیا ہے تو وہ سب رنگ کھو بیٹھا اتنا سفید ہو گیا ہے کہ نظر ہی نہیں آ رہا.. بہت غور سے دیکھتا ہوں' آنکھیں میچ کر اُسے تلاش کرنے کی سعی کرتا ہوں کہ ابھی وہ میرے سامنے آسمان کی نیلاہٹ میں اپنے رنگ بکھیرتا تاج محل کے سامنے آیا تو تھا اور اب دکھائی کیوں نہیں دے رہا.. وہ وہاں تھا تو سہی' آہستگی سے تاج کی عمارت کے آگے اُڑتا کہیں تھا تو سہی.. لیکن اُس کی سفیدی کی تاب نہ لا کر سفید ہو گیا تھا اپنے رنگ کھو بیٹھا تھا..

جس سفیدی کے انبار کے سامنے سے وہ گزر رہا تھا... جو محض سفیدی نہ تھی حقیقت اور گمان کی دُھند میں سے نمودار ہوتی تھی' اُس سفیدی نے پرندے کے بھڑکیلے رنگ بجھا کر اُسے چٹّا سفید کر دیا تھا' اس لیے وہ نظر نہیں آ رہا تھا.. وہ تھا تو سہی..

پر کہاں تھا..

تاج کے کونسے مینار' کونسے گنبد اور کس محراب کے سامنے سے گزر رہا تھا..

پھر میں نے دیکھا کہ تاج کے مرکزی گنبد کے تلے جو کچھ آسمان نظر آ رہا تھا وہ یکدم وہاں جا نمودار ہوا.. آسمانی نیلاہٹ کے پس منظر میں نمودار ہوا اور پھر سے ایک رنگین اُڑن کھٹولا ہو گیا.. مرغ زریں کی مانند اپنے رنگوں میں رنگین ہو گیا..

یہ کیسا سحرِ سفید تھا جو رنگ بدل دینے پر قادر تھا' جُون تبدیل کر دیتا تھا.. یہ کیسی الوہی سفیدی تھی جو کوہ طور کے نور کے مقابل ہوتی تو اُسے بھی سفید کر دیتی..

آتش نمرود کے سامنے ہوتی تو اُسے اپنی سفید ٹھنڈک سے سرد کر دیتی..

دنیا بھر میں شاید صرف ایک شاہ گوری تھی جس کے مقابل تاج کی سفیدی آتی تو جھجک جاتی کہ اسے اپنے رنگوں میں کیسے رنگوں کہ یہ تو پہلے سے ہی رنگی ہوئی ہے.. شاہ گوری کے گورے پنڈے کے سوا اُس کے مقابل اور کوئی نہ آ سکتا تھا.. البتہ تاج کی سفیدی کو تھوڑی سی تسکین یوں ہو جاتی کہ شاہ گوری کی سفید برفوں پر کہیں کہیں بوسوں کے نیل تھے اور وہ بے داغ تھی.. یہ بھی ممکن ہے کہ تاج کی سفیدی انہیں دیکھ کر کچھ حسد میں مبتلا ہو جاتی کہ ایسے بوسوں کے نیل مجھ پر نمایاں کیوں نہ ہوئے.. اگر ایسا ہوتا تو بے شک میں بے داغ نہ رہتی لیکن عشق سے آشنا تو ہو جاتی' یہ تو محسوس کر لیتی کہ جب ایک گورے بدن پر بوسوں کے نیل پڑتے ہیں تو وہ کیسے کائناتوں کے حسن سے بھی ایک آگے کی دنیا میں جا بسیرا کرتا ہے..

وہ پرندہ.. اتنے فاصلے سے میں اُس کے رنگ تو محسوس کر سکتا تھا لیکن نسل نہیں جان سکتا تو صرف ایک پرندہ.. جب تاج کی سفیدی کے ہالے میں داخل ہو کر سفیدی میں سفید ہو کر کھو گیا تو مجھے حافظ برخوردار کا وہ لازوال مصرعہ یاد آ گیا:

رات چنّے دی چاننی تے پُونی ورگا کاں

رات چاند کی چاندنی ایسی تھی کہ اس میں پرواز کرتا کوّا روئی کے گالے کی مانند سفید ہو گیا..

تاج کی اس بھری دوپہر میں بھی چاندنی ایسی تھی کہ اس کی سفیدی میں بھی اگر ایک کوّا اُڑان کرتا تو روئی کا گالا ہو جاتا..

"چودھری صاحب..آپ تاج محل کے بارے میں لکھو گے تو سہی..تو کیا لکھو گے..اس کے بارے میں سب کچھ تو لکھا جا چکا ہے' اب کیا لکھو گے؟"

"نہیں شاہ جی..سب کچھ نہیں لکھا جا چکا..اگر سب کچھ لکھا جا چکا ہوتا تو یہ تاج محل نہ ہوتا..میں صرف اس بڑے پرندے کی اُڑان بیان کروں گا جو میری اور تمہاری نظروں کے سامنے ابھی ابھی تاج محل کی سفیدی میں داخل ہو کر اپنے رنگ کھو بیٹھا تھا اور سفید ہو گیا تھا۔"

"مَتھرا کے پانڈے اور جمنا کی سوہنیاں"

لیکن ابھی نہیں...

ابھی تو وہ پرندہ..وہ مُرغِ زرّیں جمنا کے پار کسی شجر پر منتظر بیٹھا تھا کہ میں آؤں تو وہ وہاں سے اُڈاری مارے اور تاج کے آگے سے گزرے اور میں اُس کی چند ساعتوں کی اُس حیات کو بیان کروں جن میں اُس نے اپنے رنگ کھوئے' سفید ہوا اور پھر رنگین ہو گیا..

ابھی تو ہم دلّی سے نکلے تھے..

دلّی کے جن ونود کی مہیا کردہ شوفر ڈرِون کار میں سوار نکلے تھے..

پچھلی شب اُس نے حتمی طور پر فیصلہ دے دیا تھا کہ تارڑ صاحب آپ کسی بس یا ٹیکسی کے ذریعے آگرہ نہیں جائیں گے کل سویرے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کی پارکنگ میں آپ کے لیے ایک کار موجود ہو گی آپ اُس میں جائیں گے..بھلا آپ ایک جن سے کیسے جیت سکتے ہیں..

میں نے سوچا یوں تنہا جانے میں کچھ لطف نہیں' چنانچہ میں نے اصغر ندیم سید کو قائل کر لیا کہ وہ میرے ساتھ چلے..اور اُسے قائل کرنے کے لیے مجھے کچھ زیادہ تردّد نہ کرنا پڑا کہ وہ ہمہ وقت ایک قائل شدہ شخص ہے..

دلّی کے نواح بھی ہر بڑے شہر کی مانند شیطان کی آنت کی مانند تھے' ختم ہونے میں ہی نہیں آتے تھے..جانے اس بیہودہ محاورے کا پس منظر کیا ہے کہ شیطان کی آنت کو

آج تک کس نے ناپا ہے.. میں نے بھی یونہی محاورتاً اسے استعمال کر لیا ہے..

دلّی سے جان چھوٹی تو ہم ایک مُرید کے ٹائپ کے قصبے میں حلق تر کرنے کے لیے رُکے کہ دُھوپ کڑی تھی اور اکتوبر کے اوائل کے باوجود بدن کو خشک کرتی تھی..

"میاں یہ کونسا قصبہ ہے؟" میں نے ڈرائیور سے دریافت کیا..

یہ ڈرائیور مسلمان تھا اور کہیں سُورت وغیرہ سے آیا تھا اور ونود نے خاص طور پر اُسے اپنے دوسرے راجپوت ہندو ڈرائیور پر ترجیح دی تھی تاکہ ہم اُس کی رفاقت میں عقیدے کی گرمی محسوس کرتے ہوئے سفر کریں.. وہ حسب توقع کچھ کھویا ہوا اور ڈھیلا سا بندہ تھا جسے نہ ہم میں کچھ دلچسپی تھی اور نہ اپنے آپ میں.. نہ بلاؤ تو نہیں بولتا تھا' بلاؤ تو بھی اکثر نہیں بولتا تھا..

"متھرا..." اُس نے بس اتنا کہا اور ہماری مہیا کردہ کولڈ ڈرنک سُڑکنے لگا..

"متھرا؟" میں نے نہایت بچگانہ اشتیاق کا مظاہرہ کیا "پیڑوں اور پانڈوں والا متھرا؟" میں نے اونگھتے ہوئے شاہ جی کی کمر پر ایک دھپ رسید کی "شاہ جی متھرا آ گیا ہے۔"

"تو میں کیا کروں' اگر متھرا آ گیا ہے۔" شاہ جی اپنی نئی نویلی دلہن کو نوید دینا چاہتے تھے کہ وہ اُس کی یاد میں آہیں بھرتے محبت کے لازوال شہکار تاج محل کو دیکھنے جا رہے ہیں اور اُنہیں یہ نوید دینے کے لیے آس پاس کہیں بھی کسی پی سی او میں غیر ملکی کال کی سہولت میسر نہ ہوئی تھی' اس لیے وہ اتنے بیزار تھے..

"شاہ جی کیا آپ جانتے ہیں کہ متھرا میں پانڈے پائے جاتے ہیں؟"

شاہ جی بیزار تو بیگم سے رابطہ نہ ہونے پر تھے لیکن اونگھ اس لیے رہے تھے کہ پچھلی شب بھی اُنہوں نے حسب دستور عذر مستی کو روا رکھا تھا.. ذرا بیدار ہوئے اور میری جانب یوں دیکھا جیسے میں بھی حسب دستور حواس باختہ تھا.. اگر میں تھا تو اس لیے تھا کہ نیند کی کمی مجھ پر بھی اثر کرتی تھی' سویرے چار بجے اپنے بستر کے پاس پہنچا تھا اور ساتھ میں غالب بھی چلے آئے اور اُنہوں نے سونے نہ دیا لیکن متھرا کے حوالے نے مجھے طالع

بیدار کی مانند بیدار کر دیا تھا..

"چودھری صاحب.. چونکہ آپ میرے سینئر ہیں جیسے بھی ہیں' اس لیے میں آپ کی تھوڑی تعظیم کرتا ہوں.. کچھ لحاظ کرتا ہوں.. لیکن یہ جو پانڈے ہوتے ہیں ناں یہ چین میں ہوتے ہیں۔"

"یہاں بھی ہوتے ہیں.. اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر یہ واقعی متھرا ہے تو وہ یہیں کہیں ہیں.. موٹے اور توندیلے سینکڑوں کی تعداد میں متھرا کے مشہور زمانہ پیڑے ہڑپ کرتے.. یہیں کہیں ہیں۔"

"چودھری صاحب.." شاہ جی کی بیزاری عروج پر تھی "ٹھیک ہے آپ نے چین پر بھی کتاب لکھی ہے لیکن چین میں بھی گیا ہوں.. اور میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ جو پانڈے ہوتے ہیں یہ پیڑے نہیں کھاتے.. بانس کی کچی کونپلیں کھاتے ہیں۔"

"اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ متھرا کے پانڈے کونپلیں نہیں پیڑے کھاتے ہیں۔"

پالا بہت پڑتا تھا. گھاس کُہرے سے سفید ہو جاتی تھی.. سردیوں کی راتوں میں..

لاہور کی اُن زمانوں کی برفیلی منجمد سردیوں کی راتوں میں.. نہ ابھی سوئی گیس دریافت ہوئی تھی اور نہ ہی بجلی کے ہیٹر رواج میں تھے.. رواج میں ایک انگیٹھی ہوا کرتی تھی جس میں کوئلے دہکتے کم تھے دھواں زیادہ دیتے تھے.. اور ہم سب بچے.. چھ کے چھ.. ایک بڑے نواڑی پلنگ پر ایک مشترکہ رضائی میں ٹھٹھرتے سمٹتے اباجی سے کہانیاں سنا کرتے تھے.. بہت شوق سے سنا کرتے تھے..

اور یہ شوق عمر کے ساتھ ساتھ سرد پڑتا گیا..

تیس چالیس سردیوں کے بعد اباجی کوئی کہانی شروع کرتے اور کچھ دیر تو ہم ادب آداب کے مارے اُن کا دل رکھنے کے مارے سنتے اور پھر بور ہو کر کہتے' اباجی ہمیں ازبر ہو چکا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا.. آپ یہ کہانی بہت بار سُنا چکے ہیں تو وہ روٹھ جاتے.. ناراض ہو جاتے..

اور ان دنوں مجھے اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے.. میرے ساتھ بھی یہی سلوک ہو رہا ہے.. میری کہانیاں کوئی نہیں سنتا.. اسلام آباد کی جانب سفر کرتے ہوئے میں اپنے بچوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ شاہدرہ کو شاہدرہ کیوں کہتے ہیں اور گئے زمانوں میں مسافر دریائے جہلم صبح سویرے پار کرتے تھے اور اس کنارے پر ایک سرائے میں رات کرتے تھے.. یہی سرائے عالمگیر.. تو وہ بھی بدتمیزی پر اُتر آتے ہیں کہ ابا یہ کہانی ہم بہت بار سُن چکے ہیں اور میں اُن سے رُوٹھ جاتا ہوں.. لیکن زیادہ ناراض تب ہوتا ہوں جب شاہدرہ یا سرائے عالمگیر سے گزر ہو رہا ہوتا ہے اور میں دل پہ جبر کیے چپ بیٹھا رہتا ہوں تو اُن میں سے کوئی ایک.. عام طور پر ثُمیر نہایت سنجیدگی سے مجھے کہتا ہے کہ اباجی ذرا یہ تو بتائیں کہ اسے شاہدرہ اور اسے سرائے عالمگیر کیوں کہتے ہیں۔

میں نے جو بویا تھا اُسے کاٹ رہا ہوں تو شکایت کیسی..

انشاءاللہ سلجوق اور ثُمیر پر بھی یہی وقت آئے گا.. جب اُن کے بچے..

لیکن یہ تو اُن زمانوں کا قصہ ہے جب ہم اپنے اباجی کے قصے کہانیاں بار بار فرمائش کر کے نہایت اشتیاق سے مگن ہو کر سُنا کرتے تھے.. آزادی سے پیشتر کاروبار کے سلسلے میں وہ سرینگر سے لے کر مدراس، کلکتہ اور سُندربن تک جایا کرتے تھے.. کبھی وہ ہمیں لکھنؤ کے بانکوں کے قصے سناتے کہ کیسے وہ رات کے کھانے پر ایک لکھنوی دوست کے مہمان ہوئے اور باورچی خانے میں سے گرم گرم اور پتلی پتلی لیلیٰ کی اُنگلیاں ہیں روٹیاں چلی آ رہی تھیں اور جب ترسیل میں تعطل کچھ طویل ہوا اور والد صاحب منتظر رہے تو میزبان نے باورچی کو پکارا کہ اے کمبخت کہاں مر گیا ہے.. گرم روٹی کیوں نہیں لاتا تو اُدھر سے ایک نستعلیق جواب آیا "حضور.. آپ نے مطلع نہیں کیا تھا کہ رات کے کھانے پر جو مہمان آ رہا ہے وہ پنجاب کا ہے.. میں مزید آٹا گوندھ رہا ہوں.."

کبھی وہ کلکتے میں مقیم چنیوٹی شیخوں کے قصے لے بیٹھتے جب وہ اُن زمانوں کی ایک سرائے میں جا ٹھہرے تھے اور ہر شیخ رات کے کھانے کے لیے اپنے حصے کے گوشت کی ایک بوٹی بازار سے خریدتا تھا اور پھر مشترکہ ہانڈی میں ڈالنے سے پیشتر اپنی بوٹی کے گرد

دھاگے سے چند گانٹھیں لگا دیتا تھا تاکہ پکنے کے بعد اُس کی ذاتی بوٹی کسی اور کی تھالی میں نہ چلی جائے اور وہ اُن گانٹھوں سے جان جائے کہ بس یہی تو میری بوٹی ہے..

کبھی وہ سلہٹ کے جنگلوں میں گھرے ہوئے ایک پرانے ریسٹ ہاؤس کی کہانی سناتے جہاں ایک طوفانی رات میں شدید بارش میں چند ہاتھی بانس کی دیواروں سے ماتھے لگائے اس ریسٹ ہاؤس کو ڈھانے کی کوشش کرتے رہے تھے..

ایسے بہت سے قصے تھے..

لیکن ہمارا پسندیدہ ترین اور بار بار سنا ہوا قصہ متھرا کے پانڈوں کا تھا اور وہ کچھ یوں تھا..

دلی کے قریب ہندوؤں کا ایک متبرک قصبہ ہے متھرا نام کا جہاں گھر کم ہیں اور مندر زیادہ.. پختہ عقیدہ رکھنے والے ہندو وہاں اپنے گناہ بخشوانے جاتے ہیں اور وہاں جگہ جگہ پانڈے ملتے ہیں، یہ موٹے موٹے، بڑی بڑی توندوں والے.. اُن کے گنجے سروں سے صرف ایک چٹیا لٹکتی ہے.. ہندو ان پانڈوں کے ساتھ گناہ بخشوانے کے کاروباری معاملات طے کرتے ہیں کہ کتنے پیڑے کھاؤ گے اور کتنے پیسے لو گے کہ اُن کے عقیدے کے مطابق پانڈا جتنے پیڑے کھا جائے گا اُسی حساب سے گناہ کم ہو جائیں گے.. سودا طے ہو جانے پر بے گناہ ہو جانے کا خواہش مند ہندو پیڑوں کا ایک بڑا تھال آلتی پالتی مارے پانڈے کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ایک پیڑا اٹھاتا ہے اور پانڈے کے کھلے منتظر منہ میں رکھ دیتا ہے.. پانڈا، پیڑے ہڑپ کرتا چلا جاتا ہے، پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب پانڈے کی وسیع توند پیڑوں سے لبریز ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اُس کی ناک میں سے بھی پیڑے برآمد ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے.. اُس کے وسیع تن و توش کی سلائیاں اُدھڑنے کو آتی ہیں اور وہ نازک وقت آن پہنچتا ہے جب مزید ایک پیڑے کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی.. اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب پانڈا مزید پیڑے نگلنے سے انکاری ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی وہ طے شدہ پیڑے کھا چکا ہوتا ہے.. اس صورت حال میں ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اگر آپ پانڈے کو

مزید ایک پیڑا کھلا دیں تو ایک نہیں درجنوں پاپ ڈھل جاتے ہیں.. چنانچہ پھر سے مذاکرات شروع ہو جاتے ہیں اور اُسے صرف ایک پیڑا کھانے کے عوض بھاری رقم کی پیشکش کی جاتی ہے.. پانڈا بالآخر مان جاتا ہے اور مُنہ کھول دیتا ہے..وہ کھانے یا مُنہ چلانے کے قابل نہیں ہوتا' اس لیے پیڑے اُس کے منہ میں گھسیڑے جاتے ہیں اور بالآخر جب اُس کی ناک اور کانوں سے پیڑے برآمد ہونے لگتے ہیں تو وہ نڈھال ہو کر دھڑام سے گر جاتا ہے لیکن گرنے سے پیشتر اپنی طے شدہ رقم وصول کرتا ہے اور پھر گرتا ہے..اور پھر کئی روز تک وہیں بے سُدھ پڑا رہتا ہے..

اگر ان زمانوں میں بھی یہی سہولت ہوتی تو میں بھی اپنے گناہ بخشوا لیتا لیکن اتنے پیڑے کہاں سے آتے..

دلّی میں متھرا کے پانڈوں کے بارے میں میں نے کچھ پوچھ گچھ کی تھی..بیشتر لوگ تو اُن کی موجودگی سے ناواقف تھے اور چند ایک جو آگاہ تھے اُن کا کہنا تھا کہ اب ہندو سیانے ہو گئے ہیں' پیڑے پانڈوں کو کھلانے کے بجائے خود کھاتے ہیں..البتہ متھرا میں اب بھی تلاش کرنے پر دو چار عمر رسیدہ پانڈے مل جائیں گے..لیکن ہمارے پاس ان پانڈوں کو تلاش کرنے کے لیے وقت نہ تھا..

یا تو ہم پانڈے تلاش کرتے اور اُنہیں پیڑے کھلاتے اور یا پھر تاج محل دیکھتے..

کل شام ہی اطلاع مل گئی تھی کہ آج دوپہر قرۃ العین حیدر نے کچھ ادیبوں کو دوپہر کے کھانے کے لیے مدعو کیا ہے اور اُنہوں نے ہدایت کی تھی کہ تارڑ کو بھی ساتھ لائیے..لیکن ہم کیا کرتے..دن ایک ہی تھا' یا تو میں عینی آپا کو دیکھ سکتا تھا اور یا تاج محل کو..میں نے سوچا بے شک وہ بھی ادب کا تاج ہیں اُنہیں دیکھا ہوا ہے بلکہ اپنے گھر میں قدم رنجہ فرماتے ہوئے دیکھا ہوا ہے تو جو آج تک نہیں دیکھا' اُسے آج دیکھا جائے..

اگر ہم تاج کے لیے عینی کو ترک کر سکتے تھے تو اُن کے سامنے متھرا کے پانڈوں کی کیا حیثیت تھی' چنانچہ ہم نے اپنی پیاس بجھائی اور متھرا کو چھوڑ دیا..

سفر پھر سے جاری ہو گیا..

کہیں راستے میں بائیں ہاتھ پر ایک نشانِ منزل نصب نظر آیا جو پتہ دیتا تھا کہ اگر آپ ادھر مڑیں بائیں' تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلہ طے کر لیں تو علی گڑھ پہنچ جائیں گے..

لیکن ہم صرف تاج محل کے پہنچے ہوئے تھے' کہیں اور پہنچنے کی تمنا دل میں نہ تھی..

دائیں بائیں ہریاول کے وسیع میدان تھے..کھیت کھلیان تھے اور جانے کیوں ویران تھے..لیکن ہرے بھرے بہت تھے..ان میں دھوپ میں آنکھیں خیرہ کرتے دمکتے دو نئے نویلے نو تعمیر شدہ وسیع گوردوارے نظر میں آئے جو سراسر سنگ مرمر سے تخلیق کیے گئے تھے اور ان کے گنبدوں میں کچھ تاج کی شباہتیں تھیں..وہ نہایت ہی ستھرے اور کشادہ تھے..
شاید یہ تاج کی قربت کا اثر تھا جو اُن کی سفیدی اور بناوٹ ایسی لگتی تھی اور شاید یہ علامت تھی کہ وہ معجزۂ سنگ قریب آ رہا ہے..

بائیں جانب چند شاندار موٹل نظر آئے جن کا طرزِ تعمیر نہایت دلکش اور ہندوستانی تھا یعنی مغل تھا.. بعد میں معلوم ہوا کہ تاج کو دیکھنے کے بھی کچھ آداب ہیں..اُسے یونہی ہماری طرح دلّی سے بھاگ دوڑ کر کے بھری دوپہر میں سر پر سورج لیے نہیں دیکھتے اور پھر چند لمحے دیکھ کر بگٹٹ واپس نہیں آ جاتے..بلکہ رات اس کی قربت میں واقع موٹلوں اور ہوٹلوں میں کی جاتی ہے اور پھر صبح سویرے سورج کی پہلی کرنوں میں اُس کی زیارت کی جاتی ہے جب اُس کے رنگ سنہرے ہوتے ہیں اور دوپہر کو آرام کر کے سرِ شام اُس کی زیارت کو نکلتے ہیں جب وہ شفق کے رنگوں میں نہایا ایک گلاب سا ہوتا ہے..پر ہم تو اناڑی عاشق تھے' نہیں جانتے تھے کہ محبوب کن ساعتوں میں سنہری ہوتا ہے' گلاب ہوتا ہے..ہمارے لیے یہی کافی تھا کہ اُس کا دیدار ہو جائے بھلے بھری دوپہر میں ہو جائے..

ہمیں دلّی سے چلے تقریباً تین گھنٹے ہونے کو آئے تھے..

اور پھر یہ ہوا کہ نہ طبل بجے نہ نقاروں پر چوٹ پڑی اور نہ ہی با ادب باملاحظہ

ہوشیار کی گونج دار آوازیں آئیں.. بس یونہی ٹریفک کے شور میں.. سفر سے اُکتائے ہوئے.. پہلو بدلتے ہم سکندر یہ میں داخل ہو گئے اور پھر آگرہ ہمارے آس پاس ہو گیا.. ہم بے ترتیب آبادی اور گھنی ٹریفک کا ایک جُز بن گئے..

لیکن ہم اس سے اس بے ترتیب آبادی اور گھنی ٹریفک سے لاتعلق ہو کر ایک مکمل یکسوئی میں چلے گئے.. یعنی نظر کا ارتکاز صرف اس لیے تھا کہ ابھی کچھ سفید گنبد اور مینار اس میں در کریں گے' یہی خیال تھا کہ آگرہ میں داخل ہوتے ہی ہر سُو ڈھنڈیا پٹ جائے گی.. شور مچ جائے گا.. سوائے اُس کے اور کچھ نہ ہو گا.. اُس کی جھلک دکھائی دے گی.. گوری کا مُکھ دکھلائی دے گا چاہے وہ منہ پہ کیس ڈالے ہم سے بے خبر سوتی ہو.. شاہجہاں کے عشق کا ہاتھی ہمیں روند ڈالے گا.. پر ایسا نہ ہوا.. بلکہ کچھ بھی نہ ہوا..

صرف یہ ہوا کہ ایک وسیع پاٹ کا دریا آبادی کے نشیب میں پھیلا نظر آیا جو ہمارے دریائے راوی کی مانند کہیں تھا اور کہیں نہ تھا.. اُس میں روانی کم کم دکھائی دیتی تھی اور ریت اور ٹھہراؤ زیادہ نظر آتا تھا.. ایک اور مشابہت بھی تھی کہ اُس میں راوی کی مانند متعدد بھینسیں لوٹنیاں لگاتیں' پونچھیں جھاڑتیں استراحت فرماتی تھیں اور اس دریا کے آر پار ایک پُل تھا جس پر مزید مویشی اور اُن کے رکھوالے چلتے تھے..

اور یہی تو جمنا تھا..

تو یہ گوریاں اور شاہ گوریاں آج تک ہمیں بے وقوف بناتی آئی ہیں کہ کیسے جاؤں جمنا کے پار.. یہاں سے.. ان موسموں میں تو یہ جمنا ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ گوریاں بے شک اپنی شلواریں یا ساڑھیاں گھٹنوں تک سمیٹ کر.. چھم چھم کرتی.. چھینٹے اُڑاتی.. بے شک اُن کے گھٹنوں پر نیلے نشان ہوتے کہ وہ سیج پر سو کر ادھر آئی تھیں.. بس یہ احتیاط کرتی کہ بھینسوں سے اجتناب کرتی آسانی سے پار چلی جاتیں..

یہ کوئی بپھرا ہوا چناب نہ تھا.. کہ سوہنی ایک کچے گھڑے کے سہارے اس میں اُتر جاتی اور وہ گھل جاتا اور سوہنی ڈوب جاتی..

یہاں سوہنی نہ ڈوبتی.. کچے گھڑے کا سہارا نہ لیتی.. اُسے سر پر رکھ کر ایک سوہنی

کمہارن کے روپ میں آسانی سے پار چلی جاتی.. اپنے مہینوال کے پاس.. لیکن.. چناب کی سوہنی کے لیے صرف چناب تھا جسے اُس نے پار کرنا تھا..

اور جمنا کی سوہنیوں کے لیے صرف جمنا تھا..

سوہنیاں ہمیشہ اپنے اپنے دریاؤں میں تیرتی ہیں اور ڈوبتی ہیں..

آگرہ میں داخل ہو کر ایک بہت بڑی سہولت تھی.. ایک آسائش تھی کہ کسی کو پوچھنے کی حاجت نہ تھی کہ ارے میاں.. یہ تاج داج کدھر ہے.. کہ جدھر کُل خدائی جا رہی ہے اُدھر چلے چلو جدھر ٹورسٹ.. کوچز.. بسیں اور ویگنیں چلی جاتی ہیں سیاحوں سے لدی پھندی بس اُدھر کو چلے چلو..

سوئے تاج.. جدھر گوری سیج پر سوتی تھی اُس راستے کے آس پاس آگرہ کے اُن غریبوں کے بسیرے تھے جن کی محبت کا مذاق اُڑایا گیا تھا۔ اس لیے اُن غریبوں کے جھونپڑوں اور کوٹھوں کو حکومت کے خرچے پر نہایت واہیات قسم کے کلیجی رنگ سے پوچ دیا گیا تھا تا کہ وہ نظر پہ بار نہ ہوں اور تاج کی زیارت کے سحر میں مبتلا سیاح کو وہ غربت نظر نہ آئے جس کا مذاق اُڑایا گیا تھا..

ہم ذرا آگے گئے تو دائیں ہاتھ پر زمین بلند ہونے لگی اور اُس بلندی پر براجمان سنگِ سرخ کی فصیلیں' بارہ دریاں' سفید دودھ سفید قصر اور عجائبات دکھائی دینے لگے.. یہ آگرہ کا قلعہ تھا۔ نہایت غیر متوقع منظر اور اس کی تاریخی پُرعظمت وجاہت.. اسے ہم نے واپسی پر ہر صورت دیکھنا تھا خاص طور پر وہ مقام جہاں شاہجہاں کو اُس کے پارسا اور عبادت گزار بیٹے اورنگزیب نے قید کیا تھا اور وہ جھروکا جس میں سے اُسے تاج محل نظر آتا تھا.. لیکن پہلے ہم اُسے نزدیک سے دیکھیں گے اور پھر دور سے آگرہ قلعہ کے جھروکے میں سے دیکھیں گے..

تاج کی جانب سفر کرتے ہوئے میں نے بائیں ہاتھ پر متعدد بلند چمنیاں دیکھی تھیں جو شاید اینٹوں کے بھٹوں کی تھیں' کارخانوں کی تھیں' وہ حنوط شدہ زرافوں کی گردنوں

کی مانند کھڑی تھیں.. اُن کے منہ سے نہ کوئی دھواں اٹھتا تھا اور نہ کوئی کیمیائی کثافت.. ان کے آلودگی پھیلانے والے گلے تاج محل کو محفوظ رکھنے کی خاطر گھونٹ دیئے گئے تھے اور یہ کمال ایک ہندو وکیل کا تھا جس نے اپنی پوری زندگی صرف تاج محل کے لیے وقف کر دی تھی.. وہ صرف اور صرف تاج محل کا وکیل تھا اور اب بھی ہے.. اگرچہ اس کی پاداش میں وہ تنگدست ہوا۔ سرمایہ داروں اور سیاستدانوں نے ایک عرصے تک اُس پر عرصۂ حیات تنگ کیے رکھا لیکن اُس نے ہتھیار نہ ڈالے اور بالآخر تاج محل کے گرد و نواح میں جتنی بھی انڈسٹریز تھیں' اینٹوں کے بھٹے' اور جتنے بھی کثیف دھویں تھے جو اُس سفید معجزے کو گھن کی مانند چاٹ رہے تھے اُن سب کو عدالتی کارروائیوں کے ذریعے قانونی طور پر تمام کر دیا..

ایک ہندو وکیل ایک مغل عہد کی عمارت کو جو مسلمانوں نے تعمیر کی تھی' اُس کے لیے زندگی وقف کر دیتا ہے' سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے.. کیوں؟

سارک کانفرنس میں ہندوستان بھر سے آئے ہوئے مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں میں سے بیشتر کے مقالوں میں میں نے ماضی کو پرکھنے کے حوالے سے تاریخ کا ازسرنو جائزہ لینے کے حوالے سے میں نے ایک واضح تبدیلی محسوس کی.. وہ ایک پُل پار کر آئے تھے.. پُل کے اُس طرف وہی پرانی مسلم دشمن سوچ اور اکھنڈ بھارت تھا جس میں صرف ہندو مندر تھے.. اُنہی کے قلعے اور محلات تھے' دیوتا اور دیویاں تھیں.. وہاں گنیش' کالی ماتا اور ہنومان کا راج تھا اور اس کے سوا کچھ نہ تھا اگر تھا تو وہ اُن کا نہ تھا اور قابلِ نفرت تھا.. غیر ملکی حملہ آوروں' لٹیروں' بت شکنوں اور غاصبوں کا تھا چاہے کتنا ہی شاندار اور الوہی کیوں نہ تھا' اُن کا نہ تھا.. اور وہ اس پُل کو پار کرتے ہیں تو ادھر کُل ہندوستان ہے.. اس کی قدیم ثقافت اور فنِ تعمیر کی انمول نزاکت تو تھی ہی لیکن اس کے برابر میں مسلمان سلاطین اور شہنشاہوں کے ادوار میں تعمیر کیے گئے عجوبے اور مُعجزے بھی تھے.. لودھی مقبروں اور قطب مینار سے شروع ہو کر تاج محل بھی تھے.. وہ ان کو اپنی وراثت میں شمار کرتے تھے اور اُن پر نازاں تھے کہ یہ مُعجزے اسی سرزمین ہندوستان کے اعجاز ہیں.. اسی دھرتی کے اینٹ روڑوں سے ان کی تعمیر کی گئی ہے تو ہمارے ہیں.. اسی زمین کی نزاکت اور کاریگری اُن میں جھلکتی ہے

تو یہ سب ہمارے ورثہ کا ایک حصہ ہیں..

چنانچہ سب نہیں.. بیشتر ادیب اور دانشور مسلم ثقافت کے مظاہر کو اپنا مانتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے..

کچھ اسی نوعیت کی ماہیت قلب ہسپانیہ میں رونما ہونے والے رویوں میں ہوئی.. جہاں ہسپانویوں نے مُوروں کے سات سو برس کے قیام کو.. اُن کو اُس عہدِ زریں کو جو اُس سرزمین کے نصیب میں پھر کبھی نہ ہوا' اُسے عہدِ تاریک میں شامل کر کے اپنی تاریخ سے نصابوں میں سے یکسر خارج کر دیا.. اُن کی لائبریریاں نذرِ آتش کر دی گئیں' چاہے اُن میں ارسطو اور افلاطون کے وہ عربی ترجمے تھے جو یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا سبب بنے۔ اُن کی تعمیر کردہ عمارتوں کو کھنڈر ہو جانے دیا اور اُنہیں بدعت قرار دیا.. یہاں تک کہ قصر الحمرا جو اُس عہد کا تاج محل تھا' اُسے ملیامیٹ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی.. ہسپانوی زبان میں مستعمل عربی کے الفاظ خارج کر دیئے گئے.. پھر صدیوں کے اس نفرت آفریں رویئے کے بعد ہسپانوی خانہ جنگی کے دوران ترقی پسند دانشوروں اور شاعروں نے ان تنگ نظر رویّوں کے خلاف بغاوت کر دی اور اپنی تحریروں اور شعروں میں ڈراموں میں.. مسلم عرب ثقافت کو ایک تاریخی فخر سے اپنایا کہ یہ ماضی ہمارا ہے.. یہاں صرف گارسیا لورکا کی شاعری کا حوالہ کافی ہے جس کے شعروں میں مورش عہد اور اُس کی عمارتوں کے اُلفت بھرے تذکرے رنگ دکھاتے ہیں.. اُنہوں نے تاریخ اور زمانے کو عقیدے اور تنگ نظری کی تیز دھار تلوار سے کاٹ کر اپنے بدن سے الگ نہ کیا بلکہ اُسے اپنا لیا اپنے بدن کا ایک حصہ بنا لیا.. بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ ہسپانوی ہُنرمند اور ماہرِ تعمیر تھے جنہوں نے مسجد قرطبہ کی تزئین و آرائش ازسرنو کی اور اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں.. اقبال کی ''مسجد قرطبہ'' کبھی نہ لکھی جاتی اگر یہ کیتھولک عیسائی اُس کی دیکھ بھال نہ کرتے اور اُسے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز نہ رکھتے.. یہی صورت قصر الحمرا کی بھی ہے.. چنانچہ آج کا ہسپانوی بنیاد پرست رومن کیتھولک ہونے کے باوجود.. مسجد قرطبہ.. الحمرا.. جیرالڈا اور مدینۃ الزہرہ کو نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ اُس پر فخر کرتا ہے کہ یہ ہسپانیہ کے تابناک ماضی کی گواہیاں ہیں..

میں نے یہی تبدیلی سارک کانفرنس میں پڑھے جانے والے ہندوستانی دانشوروں کے مقالوں میں محسوس کی.. شاید اُن میں سے کچھ عیاری سے کام لیتے ہوں' ہم بھولے بھالے پاکستانی ادیبوں کو رام کرنے کی خاطر. لیکن اُن میں کچھ تو ایسے تھے جو صدق دل سے اپنی مسلم تاریخ اور ثقافت کو اپناتے تھے.. کیا پاکستان میں بھی اسی نوعیت کی ذہنی تبدیلی نمودار ہو سکتی ہے؟ شائد نہیں.. ایسی ذہنی فراخ دلی کے لیے جو ماحول اور سوچ درکار ہے' اُسے یہاں پنپنے نہیں دیا جاتا.. وہ یہاں فی الحال چند افراد میں محدود ہے.. کہتے ہیں کہ ایک بچے نے اپنے والد سے پوچھا کہ ابا کیا محمد بن قاسم کے آنے سے پیشتر یہاں پانی ہی پانی تھا اور کچھ نہ تھا.. کہ اُس بچے کی آنکھوں پر ہم محمد بن قاسم کی پٹی باندھ دیتے ہیں' اُسے نابینا کر دیتے ہیں اور نہ وہ مہر گڑھ' رحمان ڈھیری' ہڑپہ یا موہنجوڈارو دیکھ سکتا ہے.. نہ اُسے اس سرزمین کے چندر گپت موریا' کنشک' چانکیہ' پانینی اور اشوک اعظم دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی وہ اس خطے کی سب سے بڑی اور تخلیقی تہذیب گندھارا کو چھو سکتا ہے۔ وہ بھٹکتا پھرتا ہے اُس حجاج بن یوسف کے بھتیجے محمد بن قاسم کے درمیان.. جس نے سروں کی فصلوں کو کاٹا.. خانہ کعبہ میں گھوڑے دوڑائے اور حضرت ابو بکر صدیق کی بیٹی کے بیٹے زبیر کو پھانسی پر لٹکا کر جب کہ وہ بوڑھی عورت اپنے بیٹے کے بین کر رہی تھی' اس کا ہاتھ دبوچ کر کہا "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں' مجھ سے نکاح پڑھوا لے۔"

اور اُس بین کرتی بوڑھی نے کہا تھا کہ.. "اے حجاج میرے بیٹے کی لاش میرے سامنے ہے جسے تو نے پھانسی پر لٹکایا اور میں ایک بڑھیا ہوں' تو مجھ سے کیسے نکاح کرنے کا پوچھتا ہے۔"

تو حجاج نے کہا تھا "اے بڑھیا میں تو محمدؐ کا ہم زُلف ہونا چاہتا ہوں کہ تو ابوبکر کی بیٹی ہے اور عائشہ کی بہن ہے۔"

اسی نوجوان سپہ سالار کو ہندوستان سے واپس بلا کر ایک قالین میں لپیٹ کر ہلاک کر دیا گیا اور اُس کے قتل کرنے کا حکم دینے والا خلیفہ اُس لمحے شراب کے نشے میں بے سُدھ تھا..

اور وہ بچہ اپنے نصابوں میں محمد بن قاسم اور اورنگزیب کے درمیان بھٹکتا پھرتا ہے.. نابینا پھرتا ہے..

شاید یہ تاثر ابھرے کہ میں ہندوستانی رویّوں کی توصیف کر رہا ہوں اور پاکستانی ذہن کو تنقید کا نشانہ بناتا ہوں.. ایسا نہیں ہے.. میں شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ادیب اور دانشور خواب دیکھنے والے لوگ ہوتے ہیں لیکن اُن کے خوابوں کی تعبیر عوام الناس کے.. جمہوری فیصلوں پر منحصر ہوتی ہے.. اور عوام کو.. دونوں جانب.. جو کچھ پڑھایا جاتا ہے.. لکھایا جاتا ہے وہ اُس کے مطابق چلتے ہیں اور دونوں جانب آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے.. خواب دیکھنے والے صرف خواب دیکھ سکتے ہیں اُنہیں حقیقت میں تبدیل نہیں کر سکتے..

''ایک بگلا بھگت اور موٹا مہنت تاج محل دیکھنے کو جاتے ہیں''

یہ جو میری عمر ہے اس میں انسان کیسے بھٹک بھٹک جاتا ہے..تاج محل صرف ایک دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور وہ ایک بے مقصد اور لایعنی مکالمہ شروع کر دیتا ہے' مجھے معاف کر دیجیے بلکہ شما کر دیجیے گا کہ میں بھٹک گیا تھا۔میں راہ راست پر آتا ہوں..تاج کی راہ پر آتا ہوں..

سو ہم سوئے تاج جاتے تھے..

آگرہ فورٹ سے کچھ آگے گئے ہیں تو ایک بے ترتیب پارکنگ لاٹ میں داخل ہو گئے ہیں جہاں بہت کچھ پارک ہو چکا ہے..یعنی ٹورسٹ بسیں' کوچیں' ویگنیں' چھکڑے' تانگے اور سائیکل رکشا وغیرہ۔سو ہم بھی پارک ہو گئے۔کار سے اُترتے ہی ہم نے نزدیک ترین شخص سے پوچھا ''بھئی یہ تاج محل کہاں ہے؟''

ہم نے بس ایک شخص سے پوچھا تو یلغار ہو گئی..

کسی ایک سے پوچھا تو درجنوں وردی پوش..خاکی پتلونوں اور سفید قمیضوں میں ملبوس نوجوان ہمارے گرد ہو گئے..اُنہوں نے آفیشل گائیڈ..یعنی حکومت سے تسلیم شدہ تاج محل کے رہبر کے بیج قمیضوں پر آویزاں کر رکھے تھے' ہمارے گرد ہو گئے..

''سر مجھے ساتھ لے چلو..میں نے بل کلنٹن کو گائیڈ کیا تھا..میں جاؤں گا میں نے

آپ کو پہلے دیکھا تھا''

''نہیں سر میں نے دیکھا تھا..میں آپ کو تاج کے ایسے راز بتاؤں گا سر جو کوئی اور گائیڈ نہیں جانتا..''

''سر ..میں..میں..''

میں نے تنگ آ کر کہا ''بھائی پہلے یہ تو بتا دو کہ تاج محل ہے کدھر..''

''سر تاج یہاں سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے..''

''تو پھر ہمیں یہاں کیوں اُتار دیا گیا ہے؟''

''سر تاج کے گرد و نواح کے ایک کلومیٹر علاقے میں کسی بھی ڈیزل یا پٹرول سے چلنے والی گاڑی کی اجازت نہیں ہے تاکہ تاج کو آلودگی سے بچایا جائے..''

''تو یہاں سے پیدل جانا پڑے گا''

''نہیں صاحب..'' اُن درجنوں ہمارے گرد بھنبھناتے گائیڈ حضرات نے کورس میں جواب دیا ''تانگے میں بیٹھو..سائیکل رکشا میں جاؤ..بیٹری سے چلنے والی بس میں سوار ہو جاؤ..اور ہم آپ کے ساتھ سوار ہوں گے..تاج کی سیر کرائیں گے' تاریخ بتائیں گے..صرف سو روپے میں..چلئے پچاس روپے دیجیے گا۔'' اور یہ مکالمے اطمینان سے ادا نہیں ہو رہے تھے' دھکم پیل سے ادا ہو رہے تھے..یہ صاحبان ہمارے گلے لگ رہے تھے بلکہ گلے پڑ رہے تھے..میں نے اُن کے سینوں پر آویزاں نام کی تختیوں سے جانا کہ وہ سب کے سب مسلمان تھے..

ہم نے ایک کھڑکھڑاتے بوسیدہ تانگے' اُس کے مریل گھوڑے اور اتنے ہی مریل کوچوان کو تاج تک جانے کے لیے منتخب کر لیا..یہ تانگہ ایسا تھا کہ اگر اگلے وقتوں کے لاہور میں سڑک پر آ جاتا تو عوام الناس ترس کھا کر کوچوان کو نیا تانگہ خرید دیتے..بہرحال یہ بہت سپیر یئر تانگہ اس لیے تھا کہ یہ آپ کو بھاٹی لوہاری نہیں تاج محل لے جاتا تھا..ہم نے اُن اُمڈتے ہوئے گائیڈ حضرات کو بہت پرے پرے کیا' پردہ پرے نہ ہوتے تھے اور منت سماجت کرتے تھے کہ صاحب ہمیں لے چلو..ہم نے اُن سے بہت معذرت کی اور اُنہیں بتایا

کہ ہم تو ادھر اکثر آیا جایا کرتے ہیں' کوئی پہلی بار تھوڑا آئے ہیں جو گائیڈ کی حاجت ہو..اس کے باوجود تانگہ چلا تو ایک گائیڈ پائیدان سے لٹکا ہوا فریاد کرتا جا رہا تھا..مت سہل انہیں جانو.. بڑی مشکل سے اس استقامت پسند حضرت کو رخصت کیا یعنی تھوڑا سا دھکیلا تب رخصت ہوئے..

رب کی کُل مخلوق تاج محل کی جانب چلی جا رہی تھی..کچھ تو پیدل چلی جا رہی تھی اور کچھ ہماری طرح..تانگوں..سائیکل رکشوں اور ریڑھوں پر چلی جا رہی تھی..ہمارے تانگے کی رفتار کچھ ایسی افیونی تھی کہ متعدد پیدل چلنے والے ہمیں اوور ٹیک کر رہے تھے..اگرچہ کوچوان اپنے گھوڑے کو مسلسل اشتعال دلاتا چلا جا رہا تھا..''ابے چل..کام دکھا..ابے چلتا ہے یا نہیں..ایک جھانپڑ دوں گا میاں..ابے او نالائق کیوں بے عزتی کروانے پر تُل گیا ہے..سچ مچ جھانپڑ رسید کروں گا..میاں اب چل بھی دو۔''

ایسی نستعلیق اردو سُن کر قدرے حیرت ہوئی اور پھر خیال آیا کہ ہم تو یُو پی میں ہیں اور یہ اس زبان کا گڑھ ہے..

کُل مخلوق جو تاج کی جانب رواں تھی اُس میں سکول کے بچے تھے..پورے خاندان تھے..ہندوستان بھر سے آئے ہوئے رنگ برنگ لوگ تھے..غیر ملکی سیاح تھے..حالیہ شادی شدہ دِکھتے جوڑے اور کچھ لفنگے سے تھے..اور چند سکھ بھی..

دھوپ تیز تھی..بلکہ کڑی تھی..اور مجھ پر اس کی شدت کا اثر ہو رہا تھا..

بالآخر ایک پرانی فصیل نما دیوار نظر آئی جہاں ایک بلند محرابی دروازے کے باہر اک ہجوم بے کراں تھا کہ تاج محل میں داخل ہونے کا یہی راستہ تھا..شدید گرمی میں جھلتے سینکڑوں لوگ تھے جو اندر داخل ہونے والی قطاروں میں تھے اور یہ قطاریں ایک کوبرا سانپ کی مانند بل کھاتی وہاں تک آتی تھی جہاں ہمارا تانگہ رُکا..لیکن ان قطاروں میں شامل ہونے کے لیے داخلے کا ٹکٹ درکار تھا..

مقامی لوگوں کے لیے بیس روپے اور غیر ملکیوں کے لیے بیس ڈالر..

کیا ہم غیر ملکی تھے..؟

نہ جی کس نے کہا ہے کہ ہم بے چارے غیر ملکی ہیں..کیا ہم شکل سے غیر ملکی لگتے تھے..مثلاً شاہ جی شکل سے بھگت لگتے تھے..اور وہ بھی بگلا بھگت جو ہمہ وقت دیوداسیوں کی گھات میں رہتا ہے..اور میرا ناک نقشہ بھی کسی موٹے ہوس پرست مہنت جیسا تھا.جیسا کہ 1965ء میں اُس راجستھانی ہندو لڑکے نے کہا تھا کہ مہاراج آپ کے پاس اگر آگرہ کا ویزا نہیں ہے تو بھی بے فکر ہو کر چلے جائیے' ہمیں شاید کوئی روک لے' پر آپ تو ایک کوس سے ہندو دکھائی دیتے ہیں..ویسے ہمیں اپنی محب الوطنی اتنی بھی عزیز نہ تھی کہ اُس کے دفاع کے لیے اپنے ڈالر جلا دیتے۔ چنانچہ ہم نے بلا کسی احساس جرم کے اپنے ڈالر بچانے کی غرض سے عارضی طور پر اپنی قومیت بدل لی..

داخلے کی طویل قطار میں سرکتے اپنے سر پر سورج کو پگھلتے محسوس کرتے مجھے احساس ہوا کہ یہ گرمی مجھ پر کچھ اور طرح سے اثر انداز ہو رہی ہے..آخری بار متھرا میں جُوس کا ایک ڈبہ پیا تھا اور اب آس پاس کوئی ریستوران یا کھوکھا وغیرہ بھی نہ تھا جہاں سے پانی دستیاب ہو سکے..ہمیں یہ بھی علم تھا کہ آپ کسی قسم کی خوراک' جوس یا بوتلیں وغیرہ تاج کے اندر نہیں لے جا سکتے...بہرحال میں نے اپنے آپ کو ڈھارس دی کہ تھوڑی سی دھوپ اور تھوڑی سی پیاس کے لیے تو تاج محل سے منہ نہیں موڑا جا سکتا..اسے برداشت کرو..ہر بڑے مقصد کے لیے پیاس کو برداشت کرنا شرط ہے..

قطاروں میں ہندوستان بھر سے آئے ہوئے لوگ تھے..ان کے چہرے' مُہرے' زبانیں' مذہب اور لباس ایک دوسرے سے الگ تھے..مجھے ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی..ایک غریب الوطنی کا احساس ہوا کہ پاکستان میں اللہ کے فضل سے اول تو قطار بنانے کا قبیحہ رواج ہی نہیں اور اگر کہیں اتفاق سے ایسا ہو جائے تو اُس قطار میں کھڑے ہو کر میں اجنبی محسوس نہیں کرتا..سارے چہرے جانے پہچانے اور اپنے ہوتے ہیں' بے شک اُن کے لباس اور زبان مختلف ہوں..بے چینی محسوس نہیں ہوتی..

خدا خدا کر کے ہم سرکتے سرکتے دھوپ پھانکتے ٹکٹ چیکر صاحب کے قریب

ہوئے۔ وہ ایک بوکھلائے ہوئے ٹکٹ چیکر تھے.. ہم اُنہیں کاغذ کا کوئی بھی پرزہ تھما دیتے تو وہ اُسے پھاڑ کر ایک حصہ ہمیں تھما دیتے.. ہم اُن کے شکنجے سے نکل کر ابھی آزاد ہوا چاہتے تھے کہ آگے ایک تھانیدار سا شخص گرمی اور ہجوم سے نڈھال ہر کس و ناکس کے بدن ٹٹول رہا تھا.. تلاشی لے رہا تھا.. جیبوں کو تھپکتا تھا اور بیگ وغیرہ کھلوا کر اُن میں جھانک رہا تھا.. شاہ جی تو مونچھیں پھڑکاتے بڑی آسانی سے گزر گئے کہ وہ خالی ہاتھ تھے.. لیکن میرے کاندھے سے ہمہ وقت لٹکنے والا اکلوتا سیاہ بیگ اب بھی لٹکتا تھا.. جس میں میرے ڈالر تھے.. پاسپورٹ تھا.. ٹشو پیپر اور ٹافیاں تھیں اور سگریٹ وغیرہ تھے میں نے اس بیگ کی تمام ترزپیں کھول کر تھانیدار جی کو اطمینان دلوایا کہ اس میں کوئی قابل اعتراض شے نہیں لیکن اُس نے نہایت بدتمیزی سے اعتراض کر دیا کہ اس میں سگریٹ اور لائٹر ہیں جنہیں تاج کے اندر لے جانے کی اجازت نہیں' واپس باہر جاؤ اور انہیں لگیج روم میں جمع کروا کے آؤ... میں نے اندر آتے ہوئے یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ سیّاحوں کا ایک ہجوم اپنے بیگ' دستی سامان' بچوں کے کھلونے' اشیائے خورد و نوش وغیرہ ٹکٹوں کی کھڑکی کے سامنے واقع لگیج روم میں جمع کروا رہا ہے اور وہاں بھی طویل قطاریں تھیں۔ چنانچہ میں نے نہایت خوشدلی سے تھانیدار جی کو پیشکش کی ''جناب باہر جا کر انہیں جمع کیا کروانا ہے.. انہیں یہیں پھینک دیتا ہوں۔''

اس پر اُس نے.. گرمی کے مارے ہوئے' ہجوم کے ستائے ہوئے تھانیدار نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر باقاعدہ دھکا دیا اور گرج کر بولا ''یہاں پولوشن پھیلانا چاہتے ہو.. چلو باہر جاؤ اور جمع کرواؤ۔''

اس باقاعدہ دھکے سے نہ صرف میں بلکہ میری عزت نفس بھی لڑکھڑا گئی کہ اپنے وطن میں تو ہم معتبر اور باعزت لوگ تھے.. آخری دھکا جو کبھی کھایا تھا تو بچپن میں ٹارزن کی کسی فلم کے پہلے شو کے دیکھنے کے چاؤ میں اور وہ بھی دس آنے کی ٹکٹ خریدنے کے لیے کھایا تھا.. بعدازاں حیات نے چند دھکے ضرور دیئے لیکن صد شکر کہ کسی انسانی ہاتھ نے مجھے کبھی نہیں دھکیلا تھا تو بے عزتی بے حد محسوس کی۔ اس لیے بھی کہ تھانیدار کا دھکا کھا کر گرا ہوں تو پیچھے قطار میں کھڑی کچھ راجستانی یا تامل ناڈو قسم کی نہایت ناتواں سی خواتین پر گرا

ہوں اور وہ جاں بحق ہوتے ہوتے بچیں اور اُنہوں نے اپنی زبان میں جو کوسنے دیئے وہ زبان نہ سمجھ سکنے کے باوجود صاف میری سمجھ میں آتے تھے' بے عزتی اتنی محسوس کی کہ ایک لمحے کے لیے تاج محل کی زیارت یکسر ترک کر دینے کی ٹھان لی کہ.. اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی.. لیکن اس طائرِ لاہوتی نے فوراً اصلاح دی کہ میاں تاج محل دیکھنے کے لیے تھوڑا سا بے عزت ہو جانا جائز ٹھہرتا ہے.. ہو جاؤ.. چنانچہ وہاں سے واپس باہر آیا.. شاہ جی اور ڈرائیور اندر جا چکے تھے اور میں باہر آ چکا تھا..

باہر لگیج روم کے سامنے ایک ہجوم تھا قابل اعتراض اشیاء کے جمع کروانے والوں کا.. ایک طویل قطار تھی..

میں اگر اُس قطار میں لگ جاتا تو اِک عمر لگا رہتا' چنانچہ میں نے نہایت خفیہ انداز میں ایک جھاڑی سے منہ موڑے اپنے سگریٹ اور لائٹر اُس جھاڑی میں گرا دیئے اور پھر سے اندر جانے والی قطار میں جا کھڑا ہوا.. ایک مرتبہ پھر ٹکٹ چیکر آڑے آیا اور اُس نے ٹکٹ کا مطالبہ کیا اور تب یاد آیا کہ ٹکٹ کے نصف حصے تو شاہ جی لے گئے تھے اور اُس لمحے میں نے کمال حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور اپنی ماضی کی اداکاری کو عروج پر لاتے ہوئے نہایت غصے سے کہا ''میاں ابھی تو ٹکٹ دیا ہے.. بھول گئے ہو۔'' اور وہ غریب سیّاحوں کی یلغار سے اتنا بدحواس ہو چکا تھا کہ کہنے لگا ''جاؤ جاؤ''..

اُس سے آگے پھر وہی واہیات اور بدتمیز تھانیدار پسینہ پونچھ رہا تھا..

مجھے اب کیا ڈر تھا.. میں نے نہایت فخریہ انداز میں اپنے سیاہ بیگ کی زپیں کھول کر اُسے اندر جھانکنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا.. ''سر.. میں اپنے سگریٹ اور لائٹر جمع کروا آیا ہوں.. اب اجازت ہے؟''

اس پر اُس نے مزید بدتمیزی سے مجھے کچھ دھکیلا اور کہا ''جاؤ جاؤ۔''

مجھے بے حد دکھ ہوا کہ عجیب بے ڈھب شخص ہے کہ میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی ہے اور پھر بھی بدتمیزی سے بولتا ہے۔ بہرحال میں نے عمدہ اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے ہوئے لجاجت سے کہا ''جناب میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں'' اور آگے بڑھ گیا..

ذرا آگے ہوا تو اُس نے آواز دے کر مجھے کچھ کہا جو میرے پلّے نہ پڑا اور میں پھر واپس چلا گیا ”جی آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے یہ کہا ہے کہ.. تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے.. اور تم جانتے ہو کہ کیوں.. جاؤ“

پہلے سوچا کہ پوچھوں تو سہی کہ کیوں.. میں نہیں جانتا تھا کہ تم جیسے اکھڑ اور بدتمیز بندے کا مجھے کیوں شکر گزار ہونا چاہیے اور پھر فوراً ہی ذہن میں ایک کوندا سا لپکا جس نے سمجھایا کہ کیوں..

اُس نے میرے بیگ کی تلاشی لیتے ہوئے میرا سبز پاسپورٹ دیکھ لیا تھا اور میرے پاکستانی برانڈ کے سگریٹ دیکھ لیے تھے اور وہ جانتا تھا کہ میں ایک موٹا مقامی مہنت نہیں ہوں، پاکستانی ہوں.. ایک غیر ملکی ہوں جسے ڈالروں والا مہنگا ٹکٹ خرید کر اندر جانا چاہیے.. اور پھر اُس نے مجھے مقامی ٹکٹ پر گزر جانے دیا تو مجھے اُس کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا.. کیسا نیک دل شخص تھا..

یہ تماشا یہاں ہوتا رہتا ہے.. تمام پاکستانی قابل فہم طور پر غیر ملکی ہونے سے اجتناب کرتے ہوئے مقامی ٹکٹ خریدتے ہیں.. اُن میں سے بیشتر پل صراط کے پار اُتر جاتے ہیں اور کچھ اپنے مہاندرے یا گفتگو سے روک لیے جاتے ہیں۔ پھر کوئی گائیڈ اپنی خدمات پیش کرتا ہے کہ صاحب غیر ملکی ٹکٹ خریدو گے تو آپ چاروں کے چار ہزار روپے لگیں گے.. دو ہزار مجھے دو میں پار لے جاتا ہوں.. ان دو ہزار میں ظاہر ہے تھانیدار جی کا بھی حصہ ہوتا ہے..

مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ نیپال کے تمام قابل دید مقامات پر بھی مقامی اور غیر ملکیوں کے لیے ٹکٹ کی شرح مختلف ہے لیکن سارک ممالک کے باشندوں کے لیے رعایت ہے.. وہ مقامی ٹکٹ کی قیمت ادا کر کے ان مقامات کو دیکھ سکتے ہیں تو ہندوستان میں اب تک ایسا کیوں نہیں ہوا..

جیسے مقبرہ جہانگیر کے صدر دروازے میں سے داخل ہوتے ہی مقبرے کی عمارت سامنے نہیں آ جاتی آپ ایک بڑے سبزہ زار میں داخل ہوتے ہیں جس کے گرد غالباً اکبری سرائے کی مقفل کوٹھڑیاں قطار اندر قطار ہیں ایسے ہی یہاں سے اندر داخل ہوئے تو ایک وسیع احاطہ نظر آیا.. صد شکر کہ شاہ جی اور ڈرائیور میرے منتظر تھے اور قدرے فکر مند بھی تھے کہ اُنہیں میری زبوں حالی کا کچھ علم نہ تھا کہ مجھ پہ کیا گزر رہی تھی، وہ اندر داخل ہو کر جب ایک بارہ دری نما عمارت کے سائے میں گئے تب انہوں نے دیکھا کہ میں سراسر غائب ہو چکا تھا.. بہر حال اُنہیں اپنی داستانِ الم شتابی سے سنائی اور وہاں سے کھسکنے کو کہا کہ وہ تھانیدار جی اب بھی نظر آ رہے تھے اور اگر اُن کی نظر اتفاقاً ادھر آ گئی تو وہ اپنا ارادہ بدل بھی سکتے تھے مجھے تاج بدر بھی کر سکتے تھے..

اس احاطے میں ایک بہت گھنے اور چھتنار برگد تلے دھوپ سے ستائے ہوئے سیاح آرام کر رہے تھے اور درجنوں فوٹو گرافر ہاتھ میں اُن خوش بختوں کی تصویروں کے البم تھامے جو کبھی تاج آئے تھے۔ اِن سیاحوں کو بے آرام کر رہے تھے کہ صاحب اس زاویے سے تو کوئی مائی کا لال تصویر بنا ہی نہیں سکتا، اس کے لیے پچاس برس کا تجربہ درکار ہے اور وہ جرمن کیمرہ درکار ہے جو اب مینوفیکچر ہونا بند ہو گیا ہے.. کچھ فوٹو گرافر ایسی حسیناؤں کی تصویریں دکھا رہے تھے جنہوں نے اپنے بدن کے زاویے یوں عیاں کر رکھے تھے جیسے تاج محل کو اپنے دام میں پھنسانے کا ارادہ ہو..

اس برگد تلے کھڑے ہو کر میں نے کچھ دیر اپنی گرم ہو چکی کھوپڑی کو ٹھنڈا کیا، سوکھے حلق کو فراموش کرنے کی سعی کی اور پھر دیکھا کہ تقریباً ہر زائر کے ہاتھوں میں منرل واٹر کی بوتل ہے جس میں سے وہ کیسی شانتی سے گھونٹ بھرتے تھے.. معلوم ہوا کہ منرل واٹر کی بوتل اندر لانے کی اجازت تھی پر ہم کہ اجنبی ٹھہرے یہ نہ جانتے تھے اور تاج کے اندر اسے خریدنے کی سہولت حاصل نہ تھی..

اس دوران شاہ جی مجھ سے کہنے لگے.. ”چودھری صاحب تاج محل کے ساتھ تصویر ضرور اُتروانی ہے.. بہت ضروری ہے..“

''چھوڑ دیار.. ایسی سستی حرکتیں تو ہما شما کرتے ہیں' ہم ٹھہرے دانشور لوگ ہم اس سطح سے بہت بلند ہیں۔''

''تو آپ اپنی بلند سطح پر قیام کیجیے' یہ خاکسار تو تصویر ضرور بنوائے گا.. آپ نہیں بنوائیں گے ناں..''

میں اس دھمکی سے فوراً اپنی بلند سطح سے نیچے زمین پر آ گیا کہ میں محض تاج محل سے اپنی کدورت کی وجہ سے نخرے دکھا رہا تھا ورنہ جی تو میرا بھی بہت چاہ رہا تھا.. کدورت کیوں تھی' یہ ابھی عرض کروں گا..

شاہ صاحب متعدد فوٹو گرافر حضرات کے نرغے میں آ گئے اور اُن سے بھاؤ تاؤ کرنے لگے.. وہ دام چکانے اور اُنہیں سستا ترین کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں.. ایک مرتبہ شاپنگ کے حوالے سے گفتگو ہو رہی تھی کہ دکاندار ہمیشہ قیمت زیادہ بتاتے ہیں تو خریداری کرتے وقت اگر وہ سو روپے مانگے تو آپ کی پیشکش کہاں سے شروع ہونی چاہیے۔ کسی نے کہا کہ ستر کی آفر لگاتا ہوں' اسی پر سودا طے ہو جاتا ہے.. میں نے نہایت فخریہ انداز میں کہا کہ میں تو پچاس سے شروع کرتا ہوں اور اکثر ستر میں مطلوبہ شے خرید لیتا ہوں۔ شاہ صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کہاں سے شروع کرتے ہیں تو وہ کہنے لگے.. بھئی میں تو منت سماجت سے شروع کرتا ہوں.. چنانچہ انہوں نے ایک فوٹو گرافر کو اسی تکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت ارزاں قیمت پر راضی کر لیا..

برگد کے سائے میں سے نکلے تو پھر کڑی دھوپ میں آ گئے..

احاطے کے درمیان میں سرخ پتھر سے تعمیر شدہ ایک بلند محرابی دروازہ دھوپ سے مزید سُرخ ہو رہا تھا.. اور ہجوم سارے کا سارا اُس کی جانب بڑھ رہا تھا.. اسے بادشاہی مسجد کے صدر دروازے ایسا سمجھ لیجیے کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے درجنوں سیڑھیاں زینہ بہ زینہ اٹھتی تھیں اور اُن پر وہ ہزاروں قدم اُٹھتے تھے جو تاج کی زیارت کی چاہت میں اُٹھتے تھے.. سیڑھیاں طے کر کے جب بلند سطح پر آئے تو سامنے وہ محرابی دروازہ تھا..

''میری آنکھیں سفید سنگ مرمر کی آنکھیں اور تاج کا منظر کُھلا''

اور اُس کے پار کچھ نہ تھا.. تاج نہ تھا..

...کہ وہ محرابی دروازہ پورے کا پورا سلگتی آنکھوں کو چندھیاتی ایک سفیدی سے بھرا ہوا تھا..

اُس میں نہ کوئی آسمان تھا اور نہ ہی کوئی اور رنگ صرف سفیدی تھی۔ سلگتے حجم کی جس نے اُسے اتنا بھر دیا تھا.. اس دہکتی برف کی دیوار کو دیکھنے سے آنکھیں چندھیاتی تھیں.. اِس کی لشک برداشت نہ ہوتی تھی.. یہ اتنی سفید تھی.. یہ منظر تب سامنے آیا جب ہم سیڑھیاں طے کر کے اوپر ہموار سطح پر پہنچے.. وہاں ٹھہرے تو نہیں ذرا سات آٹھ قدم چلے اور آگے ہوئے تو سفیدی کے کونوں میں سے کچھ آسمان دکھائی دیا۔ سفیدی کے زاویے گولائی اختیار کرنے لگے.. دو چار قدم کے بعد ایک شکل وجود میں آئی اور پھر جیسے افلاک سے اُتر کر ابھی ابھی براجمان ہوتا ہوا پورا تاج محل سامنے آ گیا.. مبالغہ ہرگز نہیں کرتا مجھے یہی محسوس ہوا کہ اُس کی دودھ سفیدی میری آنکھوں میں اُتری ہے اور انہیں لبریز کر کے میرے رخساروں پر سنگ مرمر کے آنسوؤں کی مانند بہنے لگی ہے.. وہ میرے پورے بدن میں بھی سرائیت کر گئی ہے اور اُس بدن کو آنکھوں سمیت سنگ مرمر میں بدلتی ہے..

چند قدم اور.. ہم بلند محرابی دروازے کے سائے میں سے نکل کر آگے ہوتے ہیں

تو منظر کھلا.. تاج کا کل منظر کھلا.. اب میں گویا سنگ مرمر کی سفید آنکھوں سے سنگ مرمر کے اُس معجزے کو دیکھ رہا تھا..

کچھ مبالغہ نہیں کرتا.. اس منظر کو.. پہلی منہ دکھائی کو کچھ بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کر رہا.. کہ اس سفیدی نے مجھ پر وار کر دیا تھا.. مجھے گھائل کر دیا تھا.. مجھے اس جوگا چھوڑا ہی نہ تھا کہ میں مبالغہ کر سکتا.. اُس نے میرے لیے مبالغہ کرنے کو کچھ چھوڑا ہی نہ تھا.. یوں بھی میں ایک نہایت محدود لفاظی رکھتا ہوں' قادر الکلام شخص نہیں ہوں اور اُن محدود لفظوں کے ہیر پھیر سے کام چلا لیتا ہوں اور یہاں اُن سے کام چل ہی نہیں رہا تھا.. اور میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا کہ تاج ہر دیکھنے والے کو اپنی جانب سے ایک نئی لفاظی عطا کرتا ہے کہ مجھے بیان کرنا ہے تو یوں کرو..

تو میں بھی اُسے ویسے ہی بیان کر رہا ہوں جیسے اُس نے اپنے آپ کو بیان کرنے کے لیے مجھے کہا تھا..

اور اب یہ بھی اقرار ہو جائے کہ میں تاج محل سے کدورت کیوں رکھتا تھا..

میں ایک کینہ پرور اور حاسد شخص ہوں.. ہمیشہ اُن تحریروں' عورتوں اور تاریخی عمارتوں سے بُغض رکھتا ہوں جن کے حُسن کی توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے جاتے ہیں' جن کی خوبصورتی کے گیت گائے جاتے ہیں اور میں یہ طے کر لیتا ہوں کہ میں نے اُنہیں بہر طور مطعون کرنا ہے.. خلق خدا جو کچھ کہتی ہے' اُس سے اختلاف کرنا ہے اور ناک بھوں چڑھا کر اُنہیں رد کر دینا ہے.. اور یوں بقیہ خدائی سے اپنے آپ کو برتر محسوس کرنا ہے..

اور بعض اوقات اُس عورت یا عمارت کو دیکھ کر یا اُس تحریر کو پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرا بُغض کچھ ایسا بے جا بھی نہ تھا.. مثلاً جیمز جوائس کا ناول "یولسس" جسے ٹائم میگزین نے پچھلی صدی کا سب سے بڑا ناول قرار دیا.. یا مارلن منرو جو مجھے اگرچہ از حد پسند تھی اُسے اس صدی کی سب سے زیادہ حسین اور جنسی کشش رکھنے والی خاتون کہا گیا.. میں نے اگر اُس سے کہیں حسین اور کہیں ناقابل برداشت جنسی کشش رکھنے والی خواتین کو دیکھا یا پرکھا تھا

تو اس میں میرا کچھ قصور نہ تھا.. اور عمارتیں.. چونکہ ان میں ایک مذہبی نوعیت کی عمارت شامل ہے' اس لیے میں فسادِ خلق کے باعث اُس کی بے رُوح ہونے کے تذکرے سے اجتناب کرتا ہوں..

چنانچہ اس طور تاج محل کے لیے بھی میں نے ایک خصوصی بُغض پال رکھا تھا..

میں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ اسے پہلی نظر میں ہی میں نے ادھیڑ کے رکھ دینا ہے.. اس کا تیا پانچہ کر دینا ہے اور رد کر دینا ہے.. دنیا میں کسی بھی عمارت.. اور اس میں دیوار چین اور اہرام مصر بھی شامل ہیں' کی اتنی توصیف نہیں کی گئی.. اتنی تصاویر شائع نہیں ہوئیں.. اتنی کتابیں نہیں لکھی گئیں.. اُس کے حُسن کے اعتراف میں اتنی شاعری نہیں کی گئی.. یہ دنیا کی سب سے خوبصورت ترین عمارت ہے.. عشق آتش کا ایک بے مثل شاہکار ہے.. اس کا توازن ایسا ہے کہ اسے خداؤں نے اپنے ترازو میں تولا ہے اور پتہ نہیں کیا کیا ہے..

لیکن..

ہوا یہ کہ میں اُسے تو کیا اُدھیڑتا.. خود اُدھڑ گیا..

اُس کی پہلی دکھائی نے مجھے موقع ہی نہ دیا کہ میں اُسے مطعون کر سکوں.. رد کر دوں.. اپنا بُغض بروئے کار لا سکوں..

مجھے اُس نے ایسا منتشر کیا کہ پھر میں زندگی بھر جُڑ نہ سکا..

اُس نے ایسا کیا کہ میرے بدن کی بوسیدہ عمارت کی ہر اینٹ کو ایک ایک کر کے مسمار کیا اور اُسے پھر سے یوں تعمیر کیا کہ اپنے ہی سنگ مرمر سے بنایا..

جو اینٹ لگائی سنگ مرمر کی سفیدی کی لگائی اور یوں میں اور میری آنکھیں سنگ مرمر کی ہوئیں..

تو میں اُسے انہی سنگ مرمر کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا.. اگرچہ ایک ہجوم تھا.. اس کی روشوں پر چلتا.. تالابوں پر اُمڈتا.. اُس تک جانے والے راستوں پر کلبلاتا لیکن وہ اوجھل تھا میری نظروں سے اور اُن سے بلند تاج محل ایسے تھا کہ میرے اور اُس کے درمیان اور کوئی نہ تھا..

بس میں تھا اور وہ تھا..

اُسے دیکھ کر یقین نہ آتا تھا.. کہ یقین اُس شے کا آتا ہے جو اصل ہو.. اور یہ اصل نہ تھا.. کوئی فریب تھا.. نظر کا دھوکا تھا.. تو کیسے یقین آئے..

بس میں تھا اور وہ تھا اور دھوپ تھی..

میرے وجود پر گرمی کی شدت تھوہر کے پیاسے کانٹوں کی فصل اُگاتی تھی.. شریانوں اور رگوں میں ایسے صحرا تھے جن کے حلق خشک ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود میں لاپروا ہو گیا ایک مجنوں کی مانند.. بھول گیا کہ اتنی شدت کی گرمی میں.. ننگے سر چلتے ہوئے شاید میں ہوش میں نہ رہوں.. یہیں مسمار ہو جاؤں.. ڈھیر ہو جاؤں کہ میرے پاؤں بس میں نہ تھے اور مجھے راستے سجھائی نہ دیتے تھے اور آس پاس کہیں پانی کی ایک بوند بھی میسر نہ تھی.. جتنی بوندیں تھیں وہ منرل واٹر کی اُن بوتلوں میں تھیں جنہیں ایسے لوگ اُٹھائے ہوئے تھے جو میرے وطن کے نہ تھے.. ہم زبان نہ تھے.. ہم شکل بھی نہ تھے تو میں اُن سے پانی کی ایک بوند مانگتا تو کیسے اور کس زبان میں مانگتا اور تب میں نے ارادہ کر لیا کہ میں.. تاج کے کسی ایک تالاب میں جو دھوپ میں سلگتا اور آلودہ پانی ہے اُس کے گھونٹ بھر لوں.. اگر گندہ اور کائی زدہ ہے تو کچھ غم نہیں.. میرے چولستان میں بھی تو جو ٹوبے ہوتے ہیں، وہاں سے مویشی، جانور اور انسان پہلو بہ پہلو اپنی پیاس بجھاتے ہیں لیکن اجتناب اس لیے کیا کہ یہ میرا چولستان نہ تھا.. ایک اجنبی دیس تھا.. اپنے دیس میں میں کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن یہاں تو لوگ دیکھیں گے.. جان گئے کہ یہ ایک پاکستانی ہے تو کیا خیال کریں گے صرف اس لیے اجتناب کیا تب میں نے اپنے دل میں تمنا کی.. کہ یا اللہ مجھے یہاں مسمار نہ کرنا.. اس تاج کو ذرا جی بھر کے دیکھ لوں.. پھر بے شک بے ہوش کر دینا.. بے شک اٹھا لینا لیکن ابھی کچھ مہلت دے دو..

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پہ خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

یہی خیالِ تاج کی چادر تھی جو میں اوڑھ کر ڈولتا ہوا اُس کی جانب چلا جاتا تھا اور نہ

جیسی میری حالت اب ہے، کبھی ایسی تو نہ تھی..

''ہاں جی چودھری جی.. کیسا ہے؟'' شاہ جی بھی کھوئے کھوئے سے تھے..

''کون کیسا ہے؟'' میں نے ایک مخمور شرابی کی مانند رخساروں کے اندر تک سفر کرتی مسکراہٹ پھیلا کر کہا کہ میں آگاہ نہ تھا کہ وہ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں کہ کیسا ہے.. ایک مخمور شخص کیا مخمور ہوگا اگر وہ آگاہ بھی ہو..

''تاج محل یار..'' شاہ جی نے جھلا کر کہا۔

''کونسا تاج محل؟'' اب میں نے یونہی بناوٹ بھری چھیڑتی ہوئی لاپروائی سے کہا۔

شاہ جی جو جھلائے تھے اب فکر مند ہو گئے ''چودھری صاحب.. آپ ٹھیک تو ہو ناں.. بلڈ پریشر کی گولی کھائی تھی آپ نے آج صبح؟''

''شاہ جی ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے.. ایک واردات ہو گئی ہے.. یار یہ تو ایک جعلی سی عمارت ہے.. ہمارے سامنے ایک ماڈل ہے.. فلم کا سیٹ.. یہ اصل تو نہیں..''

''ہیں؟ یہ اصل نہیں ہے؟ نہیں آپ نے بلڈ پریشر کی دوائی نہیں کھائی..''

''تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ یہ اصل کیوں نہیں..''

''چلئے یہ اصل کیوں نہیں ہے؟''

''اصل یہ اس لیے نہیں کہ اصل عمارتیں انسانی ہاتھوں کی تعمیر کردہ ہوتی ہیں اور کہیں نہ کہیں انسانی ہاتھ کی لغزش اُس کی تھرتھراہٹ کہ اُس میں زندگی ہوتی ہے، وہ عمارت کے ڈیزائن یا اُس کے توازن میں نمایاں ہو جاتی ہے.. کہیں نہ کہیں کوئی خلل آ جاتا ہے اور یہی لغزش اور خلل گواہی دیتے ہیں کہ ہاں.. یہ عمارت انسانی ہاتھوں کی تعمیر کردہ ہے.. اور اگر اس میں کسی لغزش یا خلل کا شائبہ تک نہیں تو یہ اصل عمارت تو نہ ہوئی ناں.. ماڈل ہے میاں، فلم کا سیٹ ہے.. دھوکا ہے.. مجھے تو شک ہے کہ یہ ابھی ابھی افلاک سے اُتری ہے اور ابھی اپنی ایک جھلک دکھلا کر پھر سے آسمانوں پر اُٹھ جائے گی اور ہمارے سامنے کچھ نہ ہوگا۔''

شاہ جی نے کچھ کہا نہیں.. لیکن اتنے فکر مند ہو گئے کہ مونچھوں کو تاؤ دینا بھی بھول گئے۔

اگر اس عمارت کو انسانی ہاتھوں نے بنایا ہے اور آج تک ان ہاتھوں نے اور کوئی ایسی بے خلل اور بے لغزش تعمیر نہیں کی تو ہم اس تخلیق کو کیا کہیں گے..؟ وہ کون تخلیق کار ہے جو ایسی مکمل بے لغزش تخلیق کرنے پر قادر ہے.. تو اُس کی ہمسری ہوگئی ناں.. انسان اُس کے برابر میں جا براجمان ہوا ناں کہ میں بھی تخلیق پر قادر ہوں اور اگر وہ انسان جنہوں نے تاج محل بنایا ''انا الحق'' کا نعرہ لگا دیتے تو اس میں کیا اُن کا کچھ دوش ہوتا.. کہا جاتا ہے کہ مصوروں اور ادیبوں ایسے سر پھرے لوگ اس چکر میں ہوتے ہیں کہ تخلیق میں اُس کی ہمسری کریں.. قوت محرکہ یہی ہوتی ہے کہ اگر تو تخلیق پہ قادر ہے تو میں بھی کچھ کم نہیں.. سب نیت اور منشا یہی ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طور اُس کے ہم پلہ ہو جاؤں.. مائیکل انجلو اگر اپنے تراشے ہوئے موسیٰ کے گھٹنے پر ضرب لگا کر کہتا ہے کہ بولو.. تم ہی تو مکمل موسیٰ ہو.. تو صرف اس لیے کہ وہ ہمسری کا خواہش مند ہے.. بابل کے معلق باغ تخلیق کرنے والے نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا تھا.. لیکن ہوا یوں کہ کہیں نہ کہیں کوئی کمی رہ گئی.. ایک آنچ کی کسر رہ گئی.... انسانی ہاتھ کی موجودگی کے شائبے نظر آ گئے اور بالآخر تاج تخلیق ہوا تو وہ ہمسر ہو گیا کہ ''انا الحق''..

میں یہ مکالمہ شاہ جی سے نہیں کر رہا تھا کہ وہ کب کے مجھ سے غافل ہو کر چند ناتواں سی راجستانی خواتین کی رنگین پوشاکوں میں کھوئے ہوئے تھے.. بلکہ اپنے آپ سے کرتا چلا جا رہا تھا..

تاج محل کے بارے میں سب سے مشہور تو وہی گلہ ہے کہ اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر.. لیکن اس کے بعد جس فقرے کو دوام حاصل ہوا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ.. تاج محل ابد کے رخسار پر ٹھہرا ہوا ایک آنسو ہے.. یہ خیال شاعرانہ تو ہے لیکن تاج کی تصویر ہرگز نہیں.. کیونکہ اس کی سفیدی اور تاثر میں رنج والم کا ایک ذرہ بھی نہیں.. اس کے در و بام نوحہ کناں نظر نہیں آتے.. گریہ نہیں کرتے اور اس کا حسن غمگین نہیں ہے.. یہ تو زندگی کا ایک جشن ہے.. ابدی مسرت کا ایک سفید سانس ہے.. انسانی وجود کا جواز ہے کہ اگر وہ اسے تخلیق کر سکتا

ہے تو وہ حق رکھتا ہے اس دنیا میں آنے کا.. یہ زندہ رہنے کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے.. یہ شاہ گوری کی ازلی برفوں سے ایسے تراشا گیا ہے کہ اس کے گورے بدن پر ہونٹ رکھ دینے کو جی ترستا ہے..

اور تب.. اُس لمحے..

ایک چھریرے خوش بدن عقاب کی جسامت کا ایک پر تکبر پرواز والا.. بڑے پروں والا پرندہ.. جس کے رنگ کسی زمانے میں فیئری میڈو میں پائے جانے والے مرغ زریں کے بھڑکیلے دہکتے رنگوں ایسے تھے' یہاں سے نظر نہ آتے دریائے جمنا کی سطح پر سے اُٹھا.. اونچا ہوا.. وہ گرمی میں دہکتے نیلے آسمان کے پس منظر میں رنگوں کا ایک اُڑن کھٹولا تھا.. اونچا ہوا.. پھر پَر سمیٹ کر ذرا نیچے ہوا' آسمان کے نیلگوں پس منظر میں سے نکل کر تاج کی دودھ سفید عمارت کے پس منظر میں آ گیا.. آیا تو.. ایک لمحے وہ رنگین تھا اور دوسرے لمحے سفید ہو گیا.. تاج کی سفید عمارت میں مدغم ہو گیا.. ابھی وہ صد رنگ تھا اور ابھی تاج کے سامنے آیا ہے تو سب رنگ کھو بیٹھا' اتنا سفید ہو گیا کہ نظر ہی نہیں آ رہا..

وہ تھا تو سہی.. پر کہاں تھا..

تاج کے کونسے مینار کونسے گنبد اور کس محراب کے سامنے سے گزر رہا تھا..

یہ کیسا سحر سفید تھا جو رنگ بدل دینے پر قادر تھا..

رات چاند کی چاندنی ایسی تھی کہ اس میں پرواز کرتا کوا روئی کے گالے کی مانند سفید ہو گیا..

تاج کی بھی اس بھری دوپہر میں چاندنی ایسی تھی کہ اس کی سفیدی میں بھی اگر ایک کوا اُڑان کرتا تو روئی کا گالا ہو جاتا..

''چودھری صاحب.. آپ تاج محل کے بارے میں لکھو گے تو سہی.. تو کیا لکھو گے.. سب کچھ تو لکھا جا چکا ہے تو کیا لکھو گے..''

''میری اور تمہاری نظروں کے سامنے ابھی ابھی تاج محل کی سفیدی میں داخل ہو کر ایک پرندہ اپنے رنگ کھو کر سفید ہو گیا تھا.. میں اس کے بارے میں لکھوں گا..''

میں نے شاہ جی کو گواہ کر لیا۔۔

اکثر اعتراض ہوتا ہے کہ تارڑ وہاں تتلیاں دیکھتا ہے جہاں ہوتی نہیں۔۔

پرندے دیکھتا ہے جو ہوتے نہیں۔۔

تو ایک گواہ ضروری تھا۔۔کہ پرندہ تھا۔۔میرا تخیل نہ تھا۔۔

”ایک سیاہ تاج محل کے تصوّر میں کیا مضائقہ ہے“

میرے جُثّے میں جو پانی گردش کرتا تھا' وہ خشک ہو رہا تھا اور اُس کی کمی مجھے کسی بھی لمحے ڈھیر کر سکتی تھی۔۔

اور میں نہایت سنجیدگی سے تاج کی جانب بڑھتی روشوں کے درمیان جو تالاب تھے اُن کے آلودہ پانیوں پر ہونٹ رکھ دینے کے بارے میں پھر سے سوچ رہا تھا۔۔جانے یہاں جو لاکھوں لوگ آتے ہیں وہ تاج کو سامنے پا کر کیسی کیسی پاگل حرکتیں کر گزرتے ہیں تو ایک پاگل اور سہی جو لیٹ کر گندے پانی کو شڑپ شڑپ کرتا پی رہا ہے۔۔لیکن میں نے کمال استقامت کا مظاہرہ کیا اور اپنے آپ کو سنبھالا۔۔

یہ جو پہلی نظر تھی۔۔گویا تاج کی مُکھ دکھلائی تھی۔۔اور جس گوری کا یہ مُکھ تھا وہ ابھی دور دور تھی۔۔۔بہت فاصلے پر تھی اور ابھی اس کڑکتی دھوپ اور کربلا کی پیاس میں اُس کے پاس جانا تھا۔۔جیسی میری حالت اب ہے کبھی ایسی تو نہ تھی اور اس کے باوجود اُس کے پاس اُس کی قربت میں جانا تھا۔۔

ویسے نقاہت اور حلق میں اُگی ہوئی تھوہر کے کانٹوں ایسی کھیتی کے باعث میں نے سوچا کہ گوری کو دیکھ تو لیا تو کیا ضروری ہے کہ اُس کے قریب جا کر اُسے چھو کر بھی دیکھا جائے کہ گوری کے رنگ کیسے ہیں۔۔یہیں سے کُوچ کر نقارہ بجا کر پسپا ہو جاتے ہیں۔۔پھر یہ خیال آیا کہ میاں زندگی بھر قلق رہے گا۔۔۔بہت پچھتاوا ہو گا کہ ذرا سی حدّت سے پریشان ہو گئے۔۔گھبرا گئے۔۔گوری سے بے وفا ہو گئے۔۔محض گرمی اور پیاس سے مات کھا گئے تو ہمت کرو۔۔یہی قیاس

کرلو کہ مجبوری ہے، جھیل کرومبر تک پہنچنا ہے.. سنو لیک تک سفر تو کرنا ہے.. چاہے جان چلی جائے.. تو چلے چلو..

مجھے ایک آسرا شاہ جی کا بھی تھا جن پر اس گرمی کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا سوائے اُن کی مونچھوں پر جو حدّت سے قدرے اکڑ جاتی تھیں تو وہ میرے رکھوالے ہیں، مجھے سنبھال لیں گے..

ہم تنہا تاج کی جانب نہ چلتے تھے بلکہ اُس ہجوم میں چلتے تھے جو اس گوری کی قربت کا تمنائی تھا..

چنانچہ اُس ہجوم کے ہمراہ دھوپ بھری روشوں اور گرم ہو چکی سرخ اینٹوں پر ہم بھی چلتے گئے.. اور چلتے ہی گئے کہ فاصلہ بہت تھا.. باقاعدہ ایک مختصر سفر تھا جو اختیار کرنا پڑتا تھا.. بالآخر ہم تاج محل کے بیس کیمپ یعنی بنیاد تک پہنچ گئے تو تاج کی عمارت اوجھل ہو گئی اور ہزاروں جوتوں کے ڈھیر سامنے آ گئے جو اُن زائرین کے تھے جو تاج کے اندر جا چکے تھے.. جیسے کے ٹو کا سب سے شاندار منظر کنکورڈیا کے برف زار سے دکھائی دیتا ہے اور جب آپ اس کے بیس کیمپ تک پہنچتے ہیں تو یہ پہاڑ مکمل طور پر نظر نہیں آتا ایسے ہی تاج کے منظر کی شانداری بھی ایک فاصلے سے ہی نظر آتی ہے اور اس کی بنیاد تک پہنچتے ہیں تو وہ پورے کا پورا دکھائی نہیں دیتا..

جوتے اتارنے ضروری تھے اور میں ہچکچا رہا تھا کہ میں نے ابھی حال ہی میں ہند یاترا کے لیے جو گرگرنما جوتے خریدے تھے وہ اگر ان ڈھیروں میں شامل کر دیتا ہوں تو واپسی پر انہیں تلاش کرنا ممکن نہ ہوگا.. ہو سکتا ہے کہ کسی یاتری کو پسند آ جائیں اور مجھے ننگے پاؤں واپس جانا پڑے..

سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں..

اُنہیں طے کیا تو ہم سنگ مرمر کے اُس وسیع پلیٹ فارم پر آ گئے جس کے درمیان میں تاج محل ایستادہ تھا..

اُس کے رُوبہ رُو ہوئے...

نہیں رُوبہ رُو نہ ہوئے کہ وہ ہم پر اُمڈا ہوا تھا.. اُس کی سفیدی ہم پر گرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی.. ایک پھوار کی مانند لیکن اُس میں نمی نہ تھی، اُس کے ذرّے بھی گرمی سے سلگتے تھے..

میں شاید پانچ برس کا تھا.. ہاں اتنے ہی برس کا تھا جب اباجی میرے لیے اسی آگرہ سے تاج محل کا سنگ مرمر سے تراشا تزئین شدہ چھوٹا سا ماڈل لائے تھے اور اُس کی تراش خراش اور بناوٹ اتنی متناسب تھی کہ اگر اُسے کسی جادوئی ترکیب سے ہزاروں گنا بڑا کر دیا جاتا تو وہ مکمل اور اصل تاج محل بن جاتا.. میں اس ماڈل کو ایک پیڑھی پر رکھ کر پہروں تکتا رہتا.. بچپن کے طلسم کے زور پر خیال کرتا کہ میں ایک بالشت بھر کا نہیں بلکہ ایک پور جتنا بونا ہو گیا ہوں اور اس ماڈل تاج محل میں داخل ہو کر اس کی سیر کرتا پھرتا ہوں.. اس کے چار انچ اونچے مینار مجھ پر سایہ کرتے اور میں منہ اٹھا کر ان کی بلندی کو تکتا.. اس کے نقش ونگار کو حیرت سے دیکھتا.. اس کے مرکزی گنبد کی گولائی پر میری نظریں پھسلتیں.. دیر تک اُس کے آس پاس سیر کرتا.. البتہ میں عمارت کے اندر نہ جا سکتا کہ ماڈل میں دروازہ نہ تھا.. پھر یوں ہوا کہ اُس کا ایک مینار اُکھڑ گیا.. اور میں بہت رویا..

مجھے لگا کہ میں وہی پانچ برس کا بچہ ہوں جو بچپن کے طلسم کے زور پر بونا ہو گیا ہوں اور تاج محل کی سیر کرتا ہوں..

وہ مجھ پر اُمڈا چلا آتا تھا..

البتہ اس تاج محل کے اندر داخل ہونے کے لیے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا..

دروازے میں لوگ ٹھنسے ہوئے تھے.. جو باہر دھوپ میں تھے وہ دھکم پیل کرتے اندر جانا چاہ رہے تھے اور جو اندر تھے وہ کوشاں تھے کہ ہم کسی نہ کسی طرح باہر نکل جائیں.. صرف ایک دربان تھا جس کی کوئی نہیں سنتا تھا بلکہ اُس غریب روح کو سب سے زیادہ دھکے پڑ رہے تھے.. میرے گرمی سے لاغر ہوتے بدن نے پھر صلاح دی کہ اندر جانا کیا ضروری ہے.. اتنے ہجوم میں جو دو چار دم رہ گئے ہیں، وہ بھی نکل جاویں گے.. پر میں نے بدن کی

بات سنی ان سنی کر دی اور یہ نفس نفیس دھکم پیل میں مشغول ہو گیا جیسے بچپن میں کسی ہٹ فلم کے ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے کچھ سینہ زوری کرنی پڑتی تھی.. اگرچہ خواتین بھی یہاں سینہ زوری کرنے پر مجبور تھیں اگرچہ ان ناتواں خواتین کے سینوں میں کچھ زور نہ تھا تو میں کس شمار قطار میں تھا..

بالآخر ایک اور دھکے نے ہمیں تاج محل کے اندر پہنچا دیا..

ہم تاج کے الوہی گنبد تلے آ گئے اور وہاں شور ہی شور تھا..

یہ شور اُس بے مثل گنبد میں بدتمیز ہواؤں کی مانند گونجتا اور کانوں کو دُکھ دیتا تھا..

بچے رو رہے تھے.. اُن کی مائیں انہیں تلاش کر رہی تھیں.. اگر وہ کسی ایک زبان یا لہجے کا شور ہوتا تو شاید اتنا گراں نہ گزرتا.. وہاں ہندوستان کی درجنوں بلکہ سینکڑوں زبانوں میں لوگ جانے بیک وقت کیا کہہ رہے تھے.. باتیں کر رہے تھے یا گالیاں دے رہے تھے' جانے کیا کہہ رہے تھے اور دم گھٹتا تھا اور حبس تھا.. جانے ممتاز محل کہاں تھی.. شاہجہاں کہاں اُس کے پہلو میں خوابیدہ تھا.. بلکہ اتنے شور میں خوابیدہ کہاں ہوگا.. بیٹھا پچھتاتا ہوگا کہ کاہے کو یہ تاج بنوایا.. کسی اجاڑ گورستان میں کسی کچی قبر میں دونوں میاں بیوی جا سوتے تو کم از کم چین سے تو سوتے..

ممتاز محل اور شاہ جہاں کی قبروں کے تعویذوں پر جو خطاطی اور نقاشی ہے ہمیں اس پر اپنی آنکھیں رکھنے کی خواہش تھی پر وہ جانے کہاں تھے..

یہیں کہیں تھے.. اس غل کرتے ہجوم کے شور میں دفن تھے.. اور ان میں سے بیشتر کو کچھ خبر نہ تھی کہ یہ ممتاز محل اور شاہجہاں کون تھے' انہیں صرف تاج محل کی عمارت کی خبر تھی.. وہ اپنے پسینہ زدہ میلے چکیلے ہاتھوں سے جالیوں کو چھوتے تھے.. نقاشی پر گیلی اُنگلیاں پھیرتے تھے.. دیواروں کے ساتھ ٹیک لگائے آپس میں چہلیں کرتے قہقہے لگاتے تھے.. اور یہیں کہیں وہ عجوبہ ایک معجزہ جالی تھی کہ جس کے سامنے ایک شمع روشن کی جائے تو دوسری جانب سے اُس کی لو سنگ مرمر کی شفافی میں سے سفر کرتی جھلملاتی دکھائی دے جاتی تھی.. سوچ کر تو یہی آئے تھے.. خواہش لے کر آئے تھے کہ اندر امن اور سکون ہوگا.. ہم

سانس بھی آہستہ لیں گے کہ نازک ہے بہت کام.. کچھ وقت شاہجہان اور ممتاز محل کی قربت میں گذریں گے اُن کے لیے فاتحہ پڑھیں گے اُن کے تعویذوں کی زیبائش سے اپنی آنکھوں کو آراستہ کریں گے..

اور ان دونوں کا شکریہ ادا کریں گے..

ممتاز محل کا اس لیے کہ وہ بارہویں یا چودھویں مسلسل بچے کی پیدائش کے بعد فوت ہو گئیں کہ شاہجہاں نے اپنی لاڈلی بیگم کو کبھی خالی پیٹ نہ رہنے دیا اور اس محبت کی ماری ہوئی روح نے اپنی حیات میں جتنی بھی سانسیں لیں حاملہ سانسیں لیں.. اور شاہجہاں کے شکریے کا آغاز لاہور کو عطا کیے جانے والے شالیمار باغ' مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ آصف جاہ سے کرنا تھا اور تاج محل کے لیے کرنا تھا.. لیکن کہاں صاحب.. ہر سو بھگدڑ مچی تھی.. میں دھکیلا جا رہا تھا اور میں دھکیل رہا تھا.. اور حبس کے مارے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا.. اور لوگ.. اپنے پسینہ زدہ ہاتھ.. بھدّے اور تاریخ سے اور خوبصورتی سے ناآشنا ہاتھ ایک معجزے کو لگاتے تھے.. اپنے آلودہ سانسوں سے اسے پراگندہ کرتے تھے.. جالیوں کے سوراخوں میں اُنگلیاں ڈال کر انہیں دھکیلتے تھے یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کتنی مضبوط ہیں.. اور جو شور کرتے تھے وہ سنگ مرمر کی پور پور میں سرائت کر کے اس میں زہر بھرتا تھا..

یہ منطق میری سمجھ سے باہر تھی کہ آخر ایسے ہجوم کو تاج محل کی اندرونی پوشیدگی میں جانے کی کیوں اجازت دی جاتی ہے..

اسے ان بدبودار بدنوں اور سانسوں سے.. پراگندہ کرنے کی اجازت کیوں دی گئی ہے..

تاج صرف دیکھنے کی چیز ہے.. اس کے کومل سفید بدن کو پسینے سے آلودہ ہاتھوں سے چھو کر.. بے ہنگم شور کر کے.. اس کے سحر کو برباد کرنے کی چیز تو نہیں ہے.. اسے ایک فاصلے سے نظر میں اتاریئے.. اس کی دل کشی اور بناوٹ کی داد دیجیے.. دیر تک دیکھئے اور چلے جایئے..

شہر فلورنس میں اکیڈمی میں جہاں مائیکل انجلو کا ''ڈیوڈ'' سر بہ فلک ہے.. ایستادہ

ہے وہاں اس کی موجودگی میں لوگ سرگوشیوں میں بھی بات نہیں کرتے.. اور اسے چھو کر دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..

کیا پیرس کے لوور میں آویزاں "مونالیزا" کی مسکراہٹ پر کوئی ہتھیلی رکھ سکتا ہے..

"وینس ڈی میلو" کے تناسب کو کوئی چھو سکتا ہے؟

یا ایمسٹرڈیم میں فان گوگ میوزیم میں اس کے پینٹ کیے ہوئے کسی سورج مکھی کو کوئی ہاتھ لگا کر محسوس کر سکتا ہے..

کہ یہ سب تو گناہ کے زمرے میں آتا ہے..

اگر مائیکل انجلو کے ڈیوڈ ہزار ہو جائیں اور مونالیزا بے شمار ہو جائیں تو بھی وہ تاج محل کی خاک نہیں بن سکتے.. تو پھر اس مُعجزے کی بے حرمتی کیوں کی جا رہی ہے..

تاج کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے..

اسے دور سے دیکھیے اور چلے جائیے..

ان دو روحوں کو اپنے گنبد تلے اطمینان سے سو لینے دیجیے..

اگر ممکن ہو.. اور اس دور میں کیا ممکن نہیں.. تاج محل کے گرد ایک شیشے کی دیوار ہونی چاہیے.. جیسے اس کے ماڈل ایک شیشے کے کیس میں محفوظ ہوتے ہیں.. موسموں کی شدت سے محفوظ.. انسانی ہاتھوں کی پہنچ سے باہر.. کہ یہ مُعجزہ اگر معدوم ہو گیا تو خالق سے ہمسری کا دعویٰ "انا الحق" معدوم ہو جائے گا..

ہجوم کے ریلے میں ہم دونوں.. شاہ جی اور میں.. بے اختیار چلتے گئے.. ممتاز محل اور شاہجہاں کی نمائشی قبروں کے گرد چلتے گئے کہ وہ ان کے نیچے ایک تہہ خانے میں دفن تھے.. سیڑھیاں ان کے زیرِ زمین مدفن کو جاتی تھیں اور ہم نیچے نہیں جا سکتے تھے کہ جالی دار دروازہ مقفل تھا البتہ ہم جھانک سکتے تھے.. جھانکتے تھے تو دو قبریں دکھائی دیتی تھیں لیکن ہم سیڑھیوں سے اتر کر ان کے سرہانے تک نہ جا سکتے تھے..

تو یوں دھکم پیل اور شور میں فاتحہ پڑھنے کا بھی موقع نہ ملا.. بلکہ جی نہ چاہا..

البتہ تاج کی کاملیت اور تناسب میں جو واحد خامی ہے.. وہ سامنے آ گئی.. اس

شاہکار کی سفیدی میں اور اس کی بناوٹ میں جو واحد دراڑ ہے اس کا احساس ہو گیا..

تاج.. صرف ممتاز محل کی قبر کو مرکز میں رکھ کر اس کے اوپر بلند کیا گیا.. وہ گنبد، وہ مینار اور جالیاں اور جھروکے جھانکتے تھے صرف ممتاز محل کی قبر کی خاطر اسے نگاہ میں رکھتے ہوئے.. اور جب ممتاز محل کے بائیں پہلو میں شاہ جہاں کو دفن کیا گیا تو پوری عمارت کے تناسب میں خلل آ گیا.. کہ اس کے لیے وہاں کوئی جگہ نہ تھی..

تو اُس الوہی عمارت میں بس یہی خامی تھی..

انسان خدا بنتے بنتے رہ گیا تھا.. اسے مات ہو گئی تھی..

اور مات بھی ایک انسان نے ہی دی.. اورنگ زیب نے.. اس نے یہی سوچا کہ والد صاحب کو الگ سے دفنانے اور ان پر ایک مقبرہ تعمیر کرنے سے اسراف ہو گا جو شرعی طور پر جائز نہیں.. تو کیوں نہ انہیں اماں جان کے برابر میں دفن کر دیا جائے بھلے اس سے تاج محل کے تناسب میں خلل آ جائے.. اماں جان اتنے وسیع و عریض اور شاندار مقبرے میں تنہا پڑی یوں بھی بور ہوتی ہوں گی.. چنانچہ احمد خان لاہوری کے تعمیر کردہ تاج میں بیٹا جان نے ابا جان کو بھی فارغ کر دیا کہ خوش رہو ابا جان ہم تو ٹوپیاں سیتے ہیں اور گذر اوقات کرتے ہیں.. اور ہم نے ساری عمر بقول ابن انشاء نہ کوئی نماز چھوڑی اور نہ کوئی بھائی.. یہاں تک کہ دارا شکوہ ایسا پرشکوہ بھائی بھی نہ چھوڑا.. اور کیوں چھوڑتے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کرتا تھا اور صوفیوں کی درگاہوں پر بیٹھا رہتا تھا.. لاہور کے میاں میر صاحب کے در سے تو اٹھتا ہی نہ تھا.. لاہور کا نگہبان مقرر ہوا تو اپنے گھر سے میاں میر صاحب کے مزار تک سنگ سرخ سے ایک فرش بچھانے کا قصد کیا تا کہ نماز فجر کے بعد ان کے ہاں روزانہ حاضر ہو.. صد شکر کہ اس منصوبے کے مکمل ہونے سے پیشتر ہم شہنشاہ ہو گئے اور اس سرخ پتھر سے بادشاہی مسجد تعمیر کروا دی.. یادگار کے طور پر البتہ میاں میر کی درگاہ پر اس سرخ پتھر کی ایک سل آویزاں کر دی گئی تا کہ میاں میر صاحب بالکل ہی خفا نہ ہو جائیں..

تاج کی یہ خامی بری طرح کھٹکتی ہے..

شاہ جہاں کی قبر کھٹکتی ہے...

اس حبس زدہ عمارت کے اندر مزید ٹھہرنا محال ہو رہا تھا تو اسی طور دھکم پیل کرتے ہوئے باہر آ گئے.. چند گہرے گہرے سانس بھر کر اپنے آپ کو بحال کیا اور پھر سائے کی تلاش میں تاج کے گرد چلتے دریائے جمنا کے رُخ پر آ گئے اور وہاں تاج کا سایہ تھا.. اس کے مرکزی گنبد کی چھاؤں تھی جہاں بے شمار لوگ سستا رہے تھے..

جمنا ایک تھکا ہوا پژمردہ سا دریا تھا جو ٹھہرا ہوا لگتا تھا.. پانی گدلے اور بے رُوح تھے.. سورج کی تپش سے نڈھال تھے.. دائیں جانب تاج کی فصیل کے آخر میں ایک دھوبی گھاٹ کے آثار تھے.. جمنا کے پار.. تاج کے عین سامنے کچھ کھنڈر نما آثار دکھائی دیتے تھے.. کسی عمارت کی نامکمل بنیادیں تھیں اور انہی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں سفید تاج کے سامنے اپنے جسد خاکی کے لیے سنگ سیاہ سے ہو بہو ایک اور تاج تعمیر کرنا چاہتا تھا لیکن زندگی نے یا شاید اورنگزیب نے مہلت نہ دی.. میں ایک اور نقطۂ نظر سے بھی آگاہ ہوا جس کے مطابق جمنا کے پار ایک سیاہ تاج محل کی تعمیر دراصل ایک رومانوی کہانی ہے.. ایک دیومالائی داستان ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں اور وہاں جو کھنڈر یا بنیادیں ہیں ان کا تناسب ایسا نہیں کہ ان پر تاج محل کے حجم کی ایک اور عمارت تعمیر کی جاسکتی.. یہ کسی سرائے یا مدرسے کے آثار ہیں.. حقیقت کچھ بھی ہو لیکن جمنا کے پار تاج کے بالمقابل ایک سیاہ تاج کیسا خوابناک تصور ہے کہ دل کو ایک عجیب کیف سے دوچار کرتا ہے تو ہم کیوں نون میخ نکالیں اسے کیوں نہ قبول کر لیں.. کہتے ہیں فکشن میں جو بیان ہوتا ہے وہ سب حقیقت پر مبنی ہوتا ہے سوائے ناموں کے اور مقامات کے اور تاریخ میں صرف نام اور مقام حقیقت ہوتے ہیں اور بیان جھوٹ ہوتا ہے.. تو بقیہ تاریخ کے ہمراہ ایک اور جھوٹ سہی جو کم از کم دل کو خوشی تو دیتا ہے..

تو جیسے بچپن میں.. میں ابا جان کے لائے ہوئے تاج محل کے ماڈل میں ایک بونا ہو کر سیر کیا کرتا تھا تو کیا مضائقہ ہے اگر میں اب ایک سیاہ تاج محل کو تصور میں لاؤں اور اس کے سیاہ در و بام کو بصد حیرت دیکھوں.. کچھ مضائقہ ہے؟

”دنیا کا سب سے سیکسی بنچ اور لاہور کے تاج محل“

ایک تالاب کے کنارے.. پس منظر میں تاج محل کی سحر آفرینی مکمل طور پر جلوہ گر ہے.. سنگ مرمر کا ایک سفید بنچ ہے.. اور یہ نشست دنیا کی سب سے خوش نصیب نشست ہے.. کیسا نصیبوں والا وہ سنگ مرمر ہے.. جس سے یہ بنچ تراشا گیا ہے۔

تاج کو دیکھنے جو بھی شاہ آئے ’گدا آئے وہ اسی نشست پر براجمان ہو کر تصویریں اترواتے ہیں تاکہ سند رہے.. شاید یہ ممکن ہی نہیں کہ دنیا کا کوئی شاہ ہو‘ کسی ملک کا سربراہ ہو وہ یہاں آیا ہو اور اسی بنچ پر بیٹھ کر تصویر نہ اُتروائی ہو.. کلنٹن آئے تو ہلیری کو سینے سے لگا کر یہیں تصویر بنوائی تاکہ مونیکا کو بھلایا جاسکے.. برطانیہ کی ملکہ آئیں تو تنہا تصویر اُتروائی اور ڈیوک صاحب کو دور کھڑا کر دیا.. جنرل مشرف بھی آگرہ مذاکرات کے دوران ادھر آئے تو نہایت رومانوی ہو کر ماتھے پر آئے بالوں کو سنوارتے صہبا کی جانب اُلفت بھری نظروں سے دیکھتے کیمرے کا سامنا کیا..

اسے میں نے دنیا کا سب سے بخت والا بنچ اس لیے ہرگز نہیں قرار نہیں دیا کہ یہاں درجنوں شاہ بیٹھ چکے ہیں بلکہ اس لیے کہا ہے کہ اس کی سفید سطح ملائم ہو چکی ہے ان لاکھوں نوبیاہتا دولہنوں کی وجہ سے جن کی نشستیں یہاں نشست ہو چکی ہیں.. ہر نوع اور سائز کی پشتیں اس بنچ کی سطح پر اپنے بھار ڈال چکی ہیں.. اور بھار بھی نوخیز اور پر جوش اور البیلے.. کہ ہندوستان بھر میں ہر شادی شدہ جوڑے کی خواہش ہوتی ہے کہ نکاح یا پھیروں کے فوراً بعد وہ محبت کے اس سفید مندر میں ماتھا ٹیکنے کے لیے حاضر ہو.. اور اس بنچ پر بیٹھ کر تصویر

اُتروائے.. اور پھر اُسے زندگی بھر اپنے جھونپڑے یا کھولی میں لگائے رکھے اور جب بھی دیکھے تو اپنی نوخیزی اور ہیجان آمیز محبت کے دنوں میں چلا جائے.. جھونپڑے یا کھولی میں اس لیے کہ جو صاحب حیثیت ہوتے ہیں وہ شادی کے بعد امریکہ یا سوئٹزرلینڈ کا رُخ کرتے ہیں.. تاج یاترا صرف دہقانوں اور غربت کے مارے شادی شدہ جوڑوں کے لیے ہے..

مجھے یاد ہے کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد اباجی مجھے نسبت روڈ پر واقع ایک مکان میں لے گئے جہاں مشرقی پنجاب میں سب کچھ لٹا کر اور عزیز و اقارب کی لاشوں کو بے گور و کفن چھوڑ کر آنے والے ان کے ایک دوست رہتے تھے.. اور جس مکان میں وہ رہتے تھے اس کے ہندو مکین بھی اپنے گھر چھوڑ کر اور شاید کچھ پیاروں کے لاشے چھوڑ کر ہندوستان جا چکے تھے.. اباجی کے دوست کو یہ مکان دو چار روز پیشتر الاٹ ہوا تھا اور خالی نہ تھا بھرا پُرا جوں کا توں تھا جیسے اس کے مکین شام کی سیر کو نکلے ہوں اور ابھی گوالمنڈی اور میکلوڈ روڈ کا چکر لگا کر واپس آ جائیں گے.. نئے مکینوں نے گھر کی صفائی کی تھی اور کاٹھ کباڑ صحن کے ایک کونے میں ڈھیر کر دیا تھا.. اباجی تو اپنے دوست سے باتیں کرنے لگے اس کی رام کہانی سننے لگے کہ وہ مشرقی پنجاب سے بچ کر کیسے آئے اور میں.. ان زمانوں میں بھی ایک کھوجی تھا صحن میں پڑے ڈھیر کو کھوجنے لگا.. کچھ کتابیں تھیں ایک غیر مانوس رسم الخط میں.. اور ایک فوٹو البم تھی.. اس البم میں صاحب خانہ کی تصاویر تھیں.. اپنی اہلیہ کے ہمراہ.. تاج محل کے پس منظر میں.. لگ بھگ 1925ء کے زمانے کی.. اور وہ اسی بنچ پر بیٹھ کر اُتروائی گئی تھیں.. تاج کی سب سے پہلی تصویریں یہی تھیں جو میں نے دیکھیں.. یہ بنچ جو میرے سامنے تھا اسے میں نے تقریباً اسّی برس پیشتر کی ایک تصویر میں بھی دیکھا تھا..

تو میں عرض کر رہا تھا کہ تاج کو دیکھنے جو بھی شاہ آئے.. گدا آئے.. وہ اسی نشست پر براجمان ہو کر تصویریں اترواتے رہے تا کہ سند رہے..

تو میرے ساتھ شاہ تھے.. انہوں نے بھی تصویر اتروائی اور مجھ گدا نے بھی! ایسی تصویر جب وطن واپسی پر پُرفخر انداز میں دوستوں اور رشتے داروں کو دکھائی جاتی ہے تو اس

میں کیا دکھائی دیتا ہے.. آپ اس نشست پر تنہا آنکھوں میں رومان بھرے.. لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرے ایک پرفسوں پوز میں دکھائی دیتے ہیں.. اور آس پاس اور کچھ نہیں.. صرف آپ ہیں اور پس منظر میں تاج جلوہ گر ہے..

جب کہ ایسا نہیں ہے..

حقیقت قدرے مختلف ہے!

اس ایک سنگ مرمری بنچ کے گرد ایک ہجوم ہوتا ہے.. فوٹوگرافروں کے غول ہوتے ہیں.. تصویر اُتروانے کے شائقین کے جمگھٹے ہوتے ہیں.. یہاں بھی دھکم پیل ہو رہی ہوتی ہے.. لیکن پھر بھی تنظیم کا خیال رکھا جاتا ہے اور یہاں تصویر اُتروانے کے لیے ایک قطار لگی ہوتی ہے.. بلکہ فوٹوگرافر حضرات نے نمبر الاٹ کر رکھے ہوتے ہیں کہ اب کس کی باری ہے.. صرف یہ دھیان رکھا جاتا ہے کہ تصویر اتارتے ہوئے بنچ کے آس پاس اُمڈتے ہجوم کو پرے پرے رکھا جائے..

تو ہم بھی اس ہجوم میں شامل تصویر اُتروانے کے چاؤ میں پسینہ پونچھتے تھے.. اپنی جبیں سے..

جس فوٹوگرافر کی باری آتی وہ اپنے گاہک کو باقاعدہ دھکیل کر بنچ پر بٹھاتا اور پھر کیمرے سے آنکھ لگا کر احکام جاری کرنے لگتا.. ادھر دیکھیں.. چہرہ اوپر کرو.. مسکراؤ.. آنکھیں نشیلی کرو.. خوش نظر آؤ.. ایک دو تین اور کلک.. تنہا شخص کے لیے ایک مخصوص پوز ہوتا تھا اور نوبیاہتا جوڑوں کے لیے تصویر کا انداز کچھ جداگانہ ہوتا تھا.. یعنی فوٹوگرافر پہلے تو دولہا میاں کو.. اور اتنے ناتواں اور بےسُرے دولہے میں نے کم ہی دیکھے ہوں گے.. شادی کے فوراً بعد ناتوانی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ان کا بےسُرا ہونا فہم میں نہیں آتا.. تو فوٹوگرافر دولہا میاں کو پہلے نشست پر بٹھائے گا پھر دلہن کو ہدایت کرے گا کہ آپ ان کے برابر میں بیٹھیں گی نہیں بلکہ بنچ پر ٹانگیں سمیٹ کر استراحت یوں فرمائیں گی کہ آپ کا سر آپ کے دولہے کے شانے پر آرام کرے گا.. دلہن جیسے حال ہی میں ٹانگیں سکیڑنے کا موقع ہی نہ ملا تھا بخوشی اس ہدایت پر عمل کرے گی اور دولہا میاں کیمرے کی آنکھ میں آنکھیں ڈالے مسکراتے چلے

جائیں گے اور وہ جو دلہن ہے اسے کیمرے کی جانب نہیں آسمان کی جانب ایک مست الست کیفیت میں دیکھنا ہے.. یہ تو ایک پوز ہے.. ایک اور پوز میں میاں بیوی اِدھر اُدھر دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کی آنکھوں میں گمشدہ گائیوں کی مانند جھانکتے تصویر اترواتے ہیں۔

سچ مچ کے تاج محل کے پس منظر میں تصویر کھنچوانے کی مجھے مدت سے آرزو تھی.. میں جو میڈیا سے متعلق ہونے کے باعث تصویریں کھنچوا کھنچوا کر تنگ آچکا تھا اور کیمرے کا سامنا کرنے سے انکاری ہو جاتا تھا تو مجھے یہ ایک تصویر کھنچوانے کی آرزو مدت سے کیوں تھی..

ایک زمانے میں یعنی یہی کوئی پچپن برس پہلے کا قصہ ہے کہ لاہور کی ہسپتال روڈ پر میو ہسپتال کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ دنیا کے بہترین فوٹو گرافر قطار اندر قطار پائے جاتے تھے.. وہ اپنے سر ایک سیاہ کپڑے کی سرنگ میں گھسیڑے لکڑی کی تین ٹانگوں پر ایستادہ ایک صندوق میں سے سامنے بیٹھے فوٹو کھنچوانے کے شوقین کو جانے کیسے فوکس میں لاتے تھے اور پھر اس حالت میں ہاتھ بڑھا کر کیمرے کے لینز پر جمی کیپ ہٹاتے تھے اور اسے چند ساعتوں کے لیے فضا میں لہرا کر پھر سے لینز پر جما دیتے تھے.. یہ ایک عجیب جادوئی عمل تھا جو ہم بچوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا.. ایک بار ہمت کر کے میں نے بھی اس کپڑے کی سُرنگ میں سر ڈال کر اندر جھانکا تھا اور دیکھتا کیا ہوں کہ سامنے بیٹھا بندہ الٹا نظر آ رہا ہے.. اس عمل کے بعد نیگٹیو ایک محلول میں دھویا جاتا تھا اور اس پر بُرش پھیر کر کالے کلوٹے بندے کو بھی گورا کر دیا جاتا تھا.. لیکن ہمارے لیے اصل کشش ہسپتال کی دیوار کے ساتھ لٹکائے گئے وہ منقش پردے ہوتے تھے جن پر اکثر شالیمار باغ' کوہ قاف اور تاج محل پینٹ کیا ہوتا تھا.. اور جو مشہور زمانہ پینٹر یہ پردے پینٹ کرتے تھے وہ اپنے اپنے تصور کے مطابق شالیمار' کوہ قاف اور تاج محل تخلیق کرتے تھے اور نقل بہ مطابق اصل پر یقین نہ رکھتے تھے..

میں جب کبھی اُدھر سے گذرتا اور ظاہر ہے اباجی کی اُنگلی تھامے گذرتا تو ہمیشہ ضد کرتا کہ اباجی میں نے فوٹو کھنچوانی ہے تاج محل کے ساتھ.. اور اباجی سخت خفا ہوتے کہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر فوٹو اُتروانا شرفا کے لیے سخت معیوب ہے.. انہوں نے میری تشفی کی خاطر لاہور کے بہترین فوٹو گرافروں سے میری تصویریں اُتروائیں جن میں زیدی اور نسبت روڈ پر واقع ایک مصری فوٹو گرافر "آتچشن" بھی شامل تھے لیکن ان میں وہ مولوی مدن والی بات کہاں کہ ان کے پس منظر میں تاج محل نہ ہوتا تھا..

تو آج پچپن برس بعد میری دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی اور پس منظر میں منقش پردہ نہ تھا سچ مچ کا تاج تھا..

میں اتنا خوش قسمت تو نہ تھا میرے شانے پر سر رکھے کوئی نوخیز نہائی دھوئی نازنین ہوتی.. اس کی بجائے شاہ صاحب تھے' ایک عشق میں مارے ہوئے ہمالیائی ریچھ کی طرح مونچھوں تلے مسکراتے..

ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھامنے سے بھی گریز کیا کہ کہیں "گے" نہ ٹھہرائے جائیں..

اور اس لمحے میں نے اپنے اکلوتے اور مجھ سے بہت لاڈ کرنے والے مرحوم ماموں جان کو بہت یاد کیا جو اپنی چوتھی بیگم کو صرف یہ یقین دلانے کی خاطر کہ وہ ان سے گذشتہ تین بیویوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں خاص طور پر یہاں لائے تھے اور تاج کے سامنے کھڑے ہو کر عہد و پیماں کیے تھے کہ وہ میری پانچویں ممانی لانے سے اجتناب کریں گے.. عمر نے وفا نہ کی اس لیے یہ عہد برقرار رہا۔

تاج کے ہیجان نے مجھے اپنی سوکھتی زبان اور پانی پانی پکارتے بدن سے قدرے غافل کر دیا تھا.. اسے دیکھ لیا تو پھر سے دوہائیاں شروع ہو گئیں اور مجھے واقعی یہ محسوس ہوا کہ اگر اگلے چند لمحوں میں میرے حلق میں پانی نہیں ٹپکتا تو میں ممتاز محل کے دائیں جانب محو خواب ہو سکتا ہوں اور وہاں میری قبر بننے سے کم از کم تاج کا تناسب پھر سے مکمل ہو جائے

گا..لیکن زندگی کی ہوس ایسی ہوتی ہے کہ کوئی گدا بھی یہ پیشکش نہ کرے کہ اگر مجھے تاج محل میں دفنایا جائے تو میں مرنے کو تیار ہوں.. چنانچہ میں نے تاج سے منہ موڑ لیا..

ویسے کورذوقی اگر انتہا کو بھی پہنچ جائے تو بھی تاج محل کو محض دو گھنٹوں میں نہیں بھگتایا جاسکتا..اتنی طویل حیات میں سے اس حیات کے سب سے سحر انگیز منظر کے لیے صرف دو گھنٹے وقف کرنا اس منظر کی بے عزتی کرنے کے مترادف ہے..لیکن میں کیا کرتا.. مجھے یہ حیات بھی تو عزیز تھی جس کی شریانیں اور رگیں خشک ہوئی جاتی تھیں..اس لیے تاج سے منہ موڑا..

میں نے چند ساعتوں کے لیے اور وہ بھی کڑی دھوپ میں پیاس سے بلکتے ہوئے اس کا ایک ہی رُخ دیکھا تھا..سرخ محرابی دروازے میں سے داخل ہو کر جو چہرہ سامنے تھا صرف اسے ہی دیکھا تھا..بقیہ تین چہرے جو اتنے ہی سفید جادوگر تھے وہ نہ دیکھ پایا تھا.. دوسرا چہرہ جو ایک مدرسے اور سرخ مسجد کی عمارت کی جانب تکتا تھا..تیسرا چہرہ دائیں جانب جو سرو کے درختوں کی قطاروں اور سرخ فصیل کی جانب دیکھتا تھا اور چوتھا چہرہ..جمنا کے پار جاکر اِدھر دیکھنے والا تھا..اور اسے دیکھنے کے لیے بھی پورا ایک دن درکار تھا کہ انسان واپس آگرہ جائے اُس آہنی پل کو پار کرے جو جمنا پر ایستادہ ہے اور پھر پیدل چلتا اس مقام تک پہنچے جہاں سنگ سیاہ سے تعمیر کیے جانے والے تاج کی بنیادیں ہیں..میرے تصور میں تاج کا یہ چوتھا رُخ سب سے دل آویز ہوگا..کہ جمنا کے دوسرے کنارے پر یہ شاہ گوری کھڑی ہو اور اُس کی سفیدی کے عکس اور گولائیاں پانیوں پر تیرتی ہوں تو یہ رُخ کیسا دل آویز ہوگا.. اور ہاں آپ ایک ہجوم میں نہیں.تنہا کھڑے ہیں اور اسے جمنا کے پار جب تک جی چاہے دیکھتے ہیں تو کیا دل آویزی ہوگی..

ایک اور اعتراف کر لینا بے جا نہ ہوگا..میں نے تاج محل کو اس کی سب سے غیر مؤثر شکل اور صورت میں دیکھا تھا..بھری دوپہر میں اور تیز دھوپ میں وہ ایک سپاٹ سفیدی

تھا..دھوپ نے اس کے بدن کو سپاٹ کر دیا تھا..جیسے ایک تیز فلیش سے کھینچی گئی تصویر ہوتی ہے جس میں روشنی ہی روشنی ہوتی ہے اور کوئی نین نقش اور دھوپ سائے نہیں ہوتے..پہچان نہیں ہوتی کہ کون ہے..یہ بدترین وقت تھا تاج کو دیکھنے کا..سورج کو سر پر نہیں..اُبھرتے ہوئے یا ڈوبتے ہوئے ہونا چاہیے تھا..مجھے بتایا گیا تھا کہ جب سحر ہوتی ہے تو یہ سفید نہیں رہتا بلکہ گلابی ہو جاتا ہے الحمرا کے رنگ بدلتے ایوانوں کی مانند..اور جب شفق کی سرخی پھیلتی ہے تو اس کے گنبد و مینار..بیر بہوٹی ہو جاتے ہیں..اسے تو ہر موسم میں دیکھنا چاہیے تھا.. کسی روزِ ابر میں..کسی شب مہتاب میں..منتظر ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے اور جھلکنے لگے تیرا عکس ہر سائے تلے..غالب کی چھٹی شراب اس کے روزِ ابر میں اور شبِ مہتاب میں..یہ تو کفر کی باتیں ہیں..اور اگر کل چودھویں کا چاند ہو تو کیسے ممکن ہے کہ شب بھر اُس کا چرچا نہ رہا ہو..

یہ سب رُخ اور سارے موسم میں نہ دیکھ سکا تھا..

لیکن یہ اچھا ہی ہوا..کہ صرف ایک رُخ دیکھنے سے بھری دوپہر میں ایک ہموار اور سپاٹ رُخ دیکھنے سے ہی..جیسی میری حالت اب ہے کبھی ایسی تو نہ تھی..ہو گئی تھی..تو اگر میں سارے رُخ دیکھ لیتا اور انہیں سب کے سب موسموں میں دیکھ لیتا تو کیسے تاب لاسکتا.. ممتاز محل کے پہلو میں یقیناً دفن ہو جاتا..تو یہ اچھا ہی ہوا..کہ مجھ ایسے کم ظرف کے پیالے میں میرے ظرف کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بس ایک ہی رُخ کی شراب انڈیلی گئی..بس اتنی جتنی کہ میں سہار سکوں..

جب میں اس نانگا پربت ایسی شکل کی..سو چہروں والی محبوبہ سے منہ موڑ کر اُس بلند محرابی دروازے تک پہنچا جس میں سے ابھی دو گھنٹے پیشتر میں اچھا بھلا داخل ہوا تھا تو جدائی کے طے شدہ اصولوں کے مطابق میں نے مڑ کر اس غزال پر آخری نظر ڈالی جو میرے بدن میں چوکڑیاں بھرتا تھا..اور کبھی صحراؤں میں جیسے ہولے سے بادِ نسیم چلتی ہے ویسے میری حیات کے صحراؤں میں ہولے سے چلتا تھا..اور اُس لمحے میں نے خواہش کی کہ کاش ایک اور پرندہ جمنا کے پانیوں میں سے بلند ہو اور تاج کی سفیدی کے سامنے پرواز کرتا سفید

ہو.. پر ایسا نہ ہوا.. وہ پرندہ کوئی بار بار تھوڑا پرواز کرتا ہے.. حیات میں ایک بار کرتا ہے اور وہ یہ پرواز کر چکا.. وہ آپ کی خواہش کا تابع نہیں ہے بلکہ جب آپ محرابی دروازے میں سے پہلی بار داخل ہو کر تاج کو دیکھتے ہیں تو اس پہلی بار کا تابع ہے..

میں آگاہ نہ تھا کہ وہ پرندہ مجھ سے فریب کرتا ہے.. وہ میرے ساتھ ہی چلا آیا.. یقین کیجیے وہ اب بھی.. اس لمحے جب میں اپنی سٹڈی میں بیٹھا.. ٹیبل لیمپ کی تیز روشنی میں سفید کاغذ تاج کے بیان میں سیاہ کر رہا ہوں تو وہ میرے آس پاس ہے..

میں کاغذ سے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھتا ہوں تو وہ صد رنگ ہوتا ہے.. اور جب تاج کا بیان کرنے لگتا ہوں تو سفید ہو جاتا ہے..

ے رات چنّے دی چاننی تے پُونی ورگا کاں..

”مغلِ اعظم کے حضور.. مان سنگھ یلغار ہو“

آگرے کے قلعے کی سرخ فصیل اوپر.. ایک بلندی پر..

سنگ مرمر کی خوش نظر اور پر پیچ بارہ دریاں..

سفید ذی شان محلات..

اور کیسے کیسے سرخ جھروکے.. گزرتے جاتے تھے.. ہماری کاران کے نشیب میں گزرتی جاتی تھی.. اور ان میں کہیں ثمن بُرج میں وہ جھروکا بھی تھا' جو ایک تخت سے اتارے ہوئے شاہ جہاں کی آنکھوں میں دور جمنا کنارے تاج محل کو تصویر کرتا تھا..

آگرہ کے اس قلعے کی جانب ایک راستہ بُلند ہوتا چلا جاتا تھا..

کیا ہم اس راستے کے مسافر ہو جائیں..

مجھے فوری طور پر فیصلہ کرنا تھا کہ کیا ہمیں آگرہ کے قلعے کے عالی شان اور ذی شان معجزے دیکھنے ہیں اور اس جھروکے میں سے جھانکنا ہے جس میں تاج تصویر ہوتا تھا.. اس کوٹھڑی میں داخل ہونا ہے جہاں شاہ جہاں تنہا تھا اور اپنے بیٹے کی خدمت میں گزارش کرتا تھا کہ مجھے قلعہ آگرہ میں مقیم اہلکاروں کے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کی اجازت مرحمت فرما دی جائے تو اسے بوئے سلطانی کا طعنہ ملتا تھا..

قیدی باپ اور داراشکوہ کی وراثت پر متمکن بیٹے کے درمیان ایک عرصے تک خط و کتابت جاری رہی اور پھر بیٹے نے یہ مناسب نہ جانا کہ ایک قیدی کو ایک شہنشاہ جواب دیتا رہے.. بھلے وہ قیدی اس کا باپ ہو.. اور یا.. ہم آگرے کے قلعے کو ترک کرتے ہیں اور مغل

اعظم کے شہرِ سرخ فتح پور سیکری کا رخ کرتے ہیں..

وقت کم تھا.. دوپہر ڈھل چکی تھی.. اور ان میں سے کسی ایک کا چناؤ کیا جا سکتا تھا.. ذرا جھجک کے ساتھ کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں.. فیصلہ یہی ہوا کہ فتح پور سیکری.. کا رخ کرتے ہیں..

آگرے کی گھنی آبادی سے نکل کر ہم دلّی جانے والی شاہراہ پر گامزن ہونے کو تھے کہ دائیں جانب ایک بورڈ ایستادہ نظر آیا. نظر آیا اور گزر گیا.. اس میں کچھ شناسا سا نام تھا.. پڑھ تو میں نے لیا تھا لیکن جب وہ گزر گیا تب احساس ہوا کہ کیا لکھا تھا ''اکبر کا مقبرہ''.. اور یکدم بدن میں ایک جھرجھری سی پھیلی کہ ہائیں مغل اعظم کا مدفن اور ہم یوں بے اعتنائی سے گزرتے جاتے ہیں..

''روکو..'' میں نے ڈرائیور سے کہا۔

''کیا ہوا ہے؟'' شاہ جی چونکے..

''یار اکبر کا مقبرہ ہے.. وہ دیکھتے چلیں.. کہ نہیں؟''

''کیوں نہیں..'' شاہ جی نے ایک معتدل قسم کا ردعمل ظاہر کیا'' دیکھتے چلتے ہیں..''

''صاحب وہ دوسری جانب ہے تو ہمیں اوپر سے چکر لگا کر واپس آنا پڑے گا.. دیر ہو جائے گی..'' ڈرائیور کچھ پُراشتیاق نہ تھا..

''تو پھر رہنے دیتے ہیں..'' شاہ جی نے فوراً اتفاق کیا..

''یار میں دیکھنا چاہتا ہوں..''

''تو پھر دیکھ لیتے ہیں..''

یہاں تاج کے مقابلے میں تقریباً ویرانی تھی.. بہت کم لوگ تھے..

مقبرے کے مقابل جو باغ تھا.. اس کی روشیں اور زیبائشیں دھوپ میں ویران تھیں.. میں اب اس دھوپ میں ڈھے جانے کے خدشے کے بغیر چل سکتا تھا کہ تاج سے باہر آتے ہی ہم ہندوستان کے سیاحتی ادارے کے قائم کردہ ایئر کنڈیشنڈ ریستوران میں

چلے گئے تھے.. پہلے بدن کی سوکھی زمین کو ایک سرد مشروب سے سیراب کیا اور پھر کچھ قوت دینے دال اور گرم روٹی نوش کی چنانچہ اب میں دھوپ سہہ سکتا تھا..

ہمارے سامنے مغل فنِ تعمیر کی ایک نازک اور پیچیدہ بناوٹ کی عمارت تھی جس کی تین منزلیں تھیں اور وہ اتنی نازکی سے ایک دوسرے پر آرام کرتی تھیں جیسے اک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی منہدم ہو جائیں گی.. اور اس میں ایک گہری اداسی کی چھاؤں تھی.. جیسے یہ عمارت تنہا رہنا چاہتی ہو.. کسی سے میل جول کی متمنی نہ ہو.. اس تک پہنچنے کے لیے بھی ہمیں خاصا فاصلہ طے کرنا پڑا..

ہم ایک بلند چھت کے گونجدار ہال میں داخل ہوئے..

وہاں تو اکبر نہ تھا..

ہال کی بلند دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا جو ایک سرنگ کے دہانے پر تھا..

کیا ہمیں اس کے اندر جانا چاہیے..

اس کے سوا تو کوئی اور راستہ دکھائی نہ دیتا تھا..

یہ ایک تنگ نیچی چھت والی ڈھلواں اور پُرپیچ سرنگ تھی.. اتنی تنگ کہ دو شخص پہلو بہ پہلو بمشکل چل سکتے تھے.. اتنی نیچی کہ کوئی دراز قامت اپنے لامبے ہاتھوں سے اس کی چھت چھو سکتا تھا.. اس میں داخل ہونے سے جی گھبراتا تھا کہ جانے یہ کہاں جا رہی ہے.. جیسے کسی فرعون کے پوشیدہ مدفن میں کوئی تاریک سرنگ اترتی ہو.. میں نے آج تک جتنے بھی تاریخی نوعیت کے مقبرے دیکھے ہیں ان میں سے کسی کا داخلہ اتنا پُراسرار اور خفیہ سا نہ تھا.. جانے اس میں کیا بھید تھا' کیا رمز تھی اور یہ رمز شاہ نے سمجھائی ''چودھری صاحب.. یہ سرنگ دراصل قبر میں اترنے کی علامت ہے تاکہ اس میں اترتے ہوئے ہم محسوس کر سکیں کہ ایک دن ہم کیسے زیرِ زمین جائیں گے..''

اس مختصر سرنگ کا اختتام ایک بڑے بے در گنبد تلے ہوا..

نہ کہیں سے ہوا آتی تھی اور نہ کوئی روشنی.. شاید اوپر کہیں کوئی روشن دان ہو..

ایک نیم تاریکی اور خاموشی کی سرسراہٹ تھی..

باہر کی تیز دھوپ کے بعد اس گنبد میں قید نیم تاریکی آنکھوں کو بھلی لگی.. مدفن کہاں ہے..

پہلی نظر میں وہ نظر نہیں آتا.. نیم تاریک فرش پر سنگ مرمر کی ایک سادہ مستطیل سِل دھری ہے.. جانے وہ فرش میں نصب بھی تھی یا بس سطح پر رکھی ہوئی تھی.. وہاں نہ کوئی کتبہ تھا جو باادب باملاحظہ ہوشیار کا اعلان کرتا کہ اس میں کون دفن ہے.. اور نہ سنگ مرمر کی اس سِل پر کوئی ایک گُل کوئی ایک بوٹا.. ایک پتہ بھی نہیں.. کچھ آرائش نہیں، کوئی زیبائش نہیں.. سراسر سفید اور سادہ.. بس فرش پر دھری ہے.. یہی جلال الدین محمد اکبر کی قبر تھی..

مقبرے کے صدر دروازے کے باہر سیاحوں کو تاریخی حقائق سے روشناس کرنے کے لیے جو پتھر نصب تھا اور اس میں اس عمارت میں دفن شہنشاہ کے حالاتِ زندگی کھدے ہوئے تھے، اس پر درج تھا کہ اس مقبرے کا نقشہ اکبر نے خود اپنی خواہش کے مطابق بنایا تھا.. بنوایا نہیں تھا خود بنایا تھا.. چنانچہ یہ سادہ سنگ مرمر کی سِل اس کی خواہش تھی..

وہ کیسی حیرت انگیز اور متنوع صلاحیتوں کا مالک تھا.. کیسے اس نے مرّوجہ اقدار اور مذہب سے روگردانی کر کے ایک اکبری ثقافت کی بنیاد رکھی اور ایک نیا دین رائج کیا.. وقت کی نبض پر اس کا کیسا ہاتھ تھا کہ وہ اس کی ایک ایک دھڑکن سن سکتا تھا اور اس کے مطابق اپنے آپ کو اور نظام حکومت کو ڈھال لیتا تھا.. اور کیسے کیسے نابغۂ روزگار رتن وہ اپنی قربت میں لاتا تھا.. ہم اس سے اختلاف تو کر سکتے ہیں لیکن اس کے جینئس ہونے کو رد نہیں کر سکتے.. اس کی سلطنت وسیع تھی، رعایا مطیع تھی اور وسائل کی کچھ کمی نہ تھی.. وہ بھی آسانی سے اپنے لیے ایک تاج محل بنوا سکتا تھا.. تو اس نے اس سادگی اور گمنامی میں رہنا کیوں پسند کیا.. وہ اگر فتح پور سیکری ایسے شہر بنا سکتا تھا تو اپنے لیے ایک قبر بھی تو بنوا سکتا تھا..

وہ سنگ مرمر کی سِل سراسر سادہ کیوں تھی..

شاید اسی لیے کہ وہ موت کے بعد بھی غیر جانبدار رہنا چاہتا تھا.. ایک کتبہ مرنے والے کے عقیدے اس کے نام اور نسل کا اشتہار ہوتا ہے.. اس کی زندگی کی پہچان ہوتا ہے اور اکبر اپنے لیے کوئی بھی پہچان نہیں چاہتا تھا.. سوائے اس کے کہ وہ ہندوستان کا شہنشاہ تھا..

کسی ایک مذہب یا قومیت کا نہیں سب کا شہنشاہ تھا..

اس لیے وہاں کوئی کتبہ نہ تھا..

سنگ مرمر کی وہ سادہ فرش پر دھری ہوئی سِل دراصل اکبر کے کُل فلسفہ حیات کی نمائندگی کرتی تھی..

ہم دونوں اس گنبد بے در تلے کھڑے تھے اور ہمارے قدموں میں وہ سِل دھری تھی جس کے نیچے مغل اعظم دفن تھا..

ہم سرگوشی بھی کرتے تو اس کی گونج دیر تک گنبد کی کائنات میں بھٹکتی رہتی..

قدم اٹھاتے تو ہمارے پاؤں تلے آنے والے فرش کی رگڑ بھی ایک آہ کی مانند اٹھتی اور گنبد میں اس کی سرسراہٹ سر ٹکراتی رہتی..

میری خصلت میں کچھ ایسی آوارہ منش غیر سنجیدگی ہے کہ سنجیدہ اور مقدس مقامات پر بھی میرے ذہن میں عجیب غیر ذمہ دار قسم کے خیالات آنے لگتے ہیں.. مسجد قرطبہ میں لبنان کی ناژلا کے خیال آنے لگتے ہیں.. روضۂ رسول کی جانب بڑھتے ہوئے فلمی گانے اور نعتیں یاد آنے لگتی ہیں.. خانہ کعبہ کی دیوار سے لپٹے ہوئے بلھے شاہ یاد آنے لگتا ہے..

تو اس بے در گنبد تلے کھڑے.. قدموں میں ایک سادہ سِل دھری ہے تو وہاں مجھے فلم ''مغل اعظم'' کا وہ منظر یاد آنے لگا جب شہزادہ سلیم انارکلی کے عشق میں دیوانہ ہو کر تلوار سونت کر اپنے باپ کے مقابل میں آ جاتا ہے اور باپ.. اکبر اعظم، فلم میں پرتھوی راج کپور ہاتھی پر سوار اپنی افواج کو سلیم کے ساتھیوں پر حملہ آور ہو جانے کے لیے ایک بے مثل پاٹ دار اور تھیٹریکل آواز میں حکم دیتا ہے کہ.. مان سنگھ یلغار ہو..

پرتھوی راج کی آواز میں وہ تاثیر تھی کہ اگر وہ اکبر کے عہد میں ہوتا تو وہ بخوشی اس کے لیے اپنا تخت خالی کر دیتا کہ کپور صاحب.. میں نہیں آپ ہی تو اصل مغل اعظم ہیں.. تشریف رکھیے..

تو مجھ پر.. اس گنبد بے در اور تقریباً زیر زمین مدفن کا ایسا اثر ہوا کہ میں نے بس اس انداز میں اپنی آواز پاٹ دار بناتے ہوئے پکارا۔

''مان سنگھ یلغار ہو..''

اس پر شاہ جی یکدم ہراساں ہو گئے..مونچھیں سنوارنا بھول گئے کہ اس گنبد بے در میں ہر سو..یلغار ہو..یلغار ہو..کی صدا گونجنے لگی..

میں خود ہراساں ہو گیا کہ شاید میں نے اکبر اعظم کی ہڈیوں یا ان کی خاک کے اوپر یونہی ایک فلمی ڈائیلاگ دہرا کر شدید گستاخی کی تھی..کہ وہ یلغار ہو..یلغار ہو..کی گونج کم ہی نہ ہوتی تھی..

صد شکر کہ وہ زندہ نہ تھا..اور میں تھا..وہ فنا ہو چکا تھا اور میں ابھی زندہ تھا اس لیے اس سے بڑا شہنشاہ تھا..کہ موت میں ایک شہنشاہ فی الحال زندہ ایک گدا سے بھی کمتر ہو جاتا ہے..

وہ اگر زندہ ہوتا تو اس گستاخی پر فوری طور پر حکم دیتا کہ..مان سنگھ اس تارڑ کو سلطنت کے سب سے بھاری بھرکم ہاتھی کے پاؤں تلے روند دیا جائے..اس پر یلغار ہو..

''یکے بعد دیگرے پانچ بھالو..اور ویلکم ٹو راجھستان''

اس نے دور سے ہماری کار کو اپنی جانب آتے دیکھا تو پگڑی درست کر کے بھالو کی نکیل کو ایک جھٹکا دیا اور بھورے بالوں کے جنگل میں پوشیدہ وہ دونوں پنجوں پر کھڑا ہو گیا اور ناچنے لگا..

کچھ دور گئے تو ایک اور بھالو والا سڑک کے کنارے کھڑا تھا اور اس کا وسیع و عریض بھالو شاید دو تین بھالوؤں کو مجتمع کر کے بنا تھا کہ بہت ہی بھالو تھا..وہ بھی اپنے مالک کے اشارے پر کھڑا ہوا اور تھوتھنی ہلاتا رقص کرنے لگا..

پھر ایک اور بھالو..

یکے بعد دیگرے پانچ بھالو آئے..لیکن فتح پور سیکری نہ آیا..

یہ ان سیاحوں کی گزرگاہ تھی جو اکبر کا یہ شہر سرخ فتح پور سیکری دیکھنے کو جاتے تھے اور یہ بھالو والے اپنے اور بھالو کے پاپی پیٹ کی خاطر سڑک کے کنارے ان کے منتظر رہتے تھے..ویسے یہ بھالو اتنے شاندار اور بھولے بھالے تھے کہ اگر ہمارے پاس کچھ وقت ہوتا تو ہم ٹھہرتے..ان کا تماشا دیکھتے اور کچھ نہ کچھ پیش کرتے..

مغل اعظم کے مقبرے میں..اس کی سِل پر سایہ فگن گنبد میں..''مان سنگھ یلغار ہو'' کی گونج ابھی باقی تھی..جب ہم وہاں سے نکلے اور آگرہ سے چند کلومیٹر کے سفر کے بعد دائیں جانب بے وجہ اور بے نشان مڑ گئے کہ شنید یہی تھی کہ فتح پور سیکری کو یہی راستہ جاتا

ہے..اور وہ شہر یہاں سے محض چالیس کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے..

اس شاہراہ دلی سے بچھڑی ہوئی ذیلی سڑک کا حال کچھ اچھا نہ تھا..یہ وہ بیمار تھی کہ ہمارے دیکھے سے بھی اس کے منہ پر رونق نہ آتی تھی..یہ کسی کار کے ٹائروں کے لیے لائق نہ تھی بلکہ بالکل نالائق تھی..

بے جان قصبے گزرتے رہے..

بے روح تجارتی جھمیلے گزرتے رہے..

آس پاس کچھ ایسا نہ گزرا جو دیکھنے کے لائق ہوتا..

اگرچہ فاصلہ چالیس کلومیٹر کا بتایا گیا تھا لیکن میرے حساب سے ہم سینکڑوں کلومیٹر طے کر چکے تھے..سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے لیکن فتح پور سیکری کا کہیں کوئی نشان نہ تھا..

ہمیں فکرمندی یہی تھی کہ دوپہر ڈھل چکی ہے اور ہمیں وہ پتھروں کا شہر دیکھنے کے بعد رات تک دلی بھی لوٹنا ہے..

پھر آس پاس کا زمینی منظر کچھ مزید ویران ہو گیا..

سرراہ ایک سنگ میل نظر آیا اور جتنی دیر میں اس پر درج شہر کا نام پڑھتے وہ گزر گیا..مجھے شک ہوا کہ اس پر اجمیر..اتنے کلومیٹر لکھا تھا..ہائیں..ہم اجمیر کیسے جا سکتے تھے وہ تو راجھستان میں ہے...

ابھی کچھ اور دور گئے سڑک پر ایک بلند محراب قوس ہوتی دکھائی دی جس پر ہندی میں کچھ لکھا تھا وہ تو پڑھا نہ گیا البتہ انگریزی میں جو لکھا تھا اسے پڑھ کر تشویش میں اضافہ ہو گیا..محراب پر بھدے سے پینٹ سے لکھا تھا:

"ویلکم ٹو راجھستان"

"چودھری صاحب..یہ بندہ تو ہمیں راجھستان لے جا رہا ہے.." شاہ صاحب بھی سراسیمہ ہو گئے.."آپ نے اسے اچھی طرح سمجھایا تھا ناں کہ ہم فتح پور سیکری جانا چاہتے ہیں..دشمن ملک ہے احتیاط کرنی چاہیے.."

یہ بندہ..یعنی ونود کا ذاتی ڈرائیور سورت کا مسلمان تھا..لیکن صورت سے مسلمان نہ لگتا تھا بلکہ کچھ بھی نہیں لگتا تھا..ذرا سادہ سا بندہ تھا اور مجھے ذہنی طور پر قدرے کاہل لگتا تھا..

"بھائی ہم فتح پور سیکری جا رہے ہیں ناں؟"

"ہاں صاحب..راستہ تو یہی بتایا جاتا ہے اب آگے اللہ جانے.."

مسلمان جب اللہ کے کھاتے میں کوئی بات ڈالتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ بات گئی..

"نہ تم نہیں جانتے کہ یہ راستہ فتح پور سیکری ہی کو جاتا ہے؟"

"نہیں صاحب.."

"کیوں نہیں جانتے؟"

"ہم ادھر پہلے کبھی آیا ہی نہیں تو کیسے جانے.."

"مسلمان بھائی آپ کی مہربانی..کہیں کار روک کر کسی سے دریافت کر لو.."

آس پاس کوئی تھا ہی نہیں جس سے پوچھتے کہ بھائی صاحب یہ راستہ فتح پور سیکری کو جاتا ہے..

کچھ دیر بعد ایک اور سنگ میل نظر نواز ہوا جس پر واضح طور پر جیسلمیر..اتنے کلومیٹر درج تھا..

یہ تو واقعی خطرے کی گھنٹی تھی..

"چودھری صاحب..اگر یونہی چلتے گئے تو ہم کھوکھرا پار کی سرحد عبور کر کے پاکستان میں جا داخل ہوں گے.." شاہ جی باقاعدہ گھبرا گئے اور وہ تنہا نہ تھے جو گھبرا گئے میری بھی سٹی گم ہو گئی..

اور جو ڈرائیور جو تھا چلا جا رہا تھا..نہ اسے شاہ جی کی گھبراہٹ کی کچھ پروا تھی اور نہ اسے میری گمشدہ سٹی کا کچھ خیال تھا..ہم کیا کرتے..کشتی خدا پہ چھوڑ دوں بے شک راجھستان میں چھوڑ دوں..ایک چھوٹے سے قصبے سے گزر ہوا جہاں میلہ مویشیاں اور شادی بیاہ کی کچھ ملی جلی تقریب جاری تھی اور کیا دیکھتے ہیں کہ رنگ ہی رنگ بجیلے بھڑکیلے رنگ ہیں..جو مرد حضرات ہیں اگرچہ ان کے وجود منحنی ہیں پر ان کی مونچھیں گھنی اور بل دار ہیں اور

وہ شوخ نیلی پیلی سرخ اور بسنتی پگڑیاں باندھے ہوئے ہیں اور جو خواتین ہیں سرخ چولیوں میں اور گھاگھروں میں گھومتی ہیں.. ناکوں میں چاندی کی تھلیاں ہیں.. چوڑیاں کہنیوں تک بجی ہیں جیسے ابھی ''چولی کے پیچھے کیا ہے؟'' کی فلمبندی ہونے کو ہے.. اور ان بھڑکیلے خوش نظر لباسوں والے گھونگھٹ سے چہرے پوشیدہ کیے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے رنگ رنگ کی پگڑیوں والے بانکے حضرات کو دیکھ کر یکدم احساس ہوا کہ واقعی ہم راجھستان میں ہیں.. اگر فتح پور سیکری ایک شہرِ سرخ ہے.. اور اس کا سنگِ سرخ راجھستان کا ہے تو ظاہر ہے ہم راجھستان میں ہی تھے..

ہم اسی علاقے بلکہ پورے ہندوستان کے جغرافیے سے لاعلم لوگ تھے.. بتایا یہی گیا تھا کہ فتح پوری سیکری تو آگرہ کے آس پاس ہے.. پہلا دھچکا تو تب لگا جب یہ کھلا کہ تاج محل اُتر پردیش یعنی یوپی میں ہے اور دوسرا دھچکا اب لگا کہ فتح پور سیکری راجھستان میں ہے..

اس قصبے میں جہاں رنگین پگڑیاں اور سرخ چولیاں تھیں' ڈرائیور نے کار روک کر ایک دبیز مونچھوں والے سے کچھ گفت وشنید کی اور پھر واپس آ کر ہمیں مژدہ سنایا کہ صاحب ہم صحیح راستے پر گامزن ہیں اور فتح پور آیا ہی چاہتا ہے..

''فتح پور سیکری کے آثار اور جودھا بائی پیلس''

لیکن فتح پور کو کچھ ایسی جلدی نہ تھی آنے کی.. وہ تب ہی آیا جب وہ آنا چاہتا تھا..

وہ تو کیا آتا بس شواہد ملے کہ وہ کہیں آس پاس ہے..

ایک آبادی میں داخل ہوئے.. اور ابھی ہماری کار رکی نہیں تھی رُکنے کی تیاری کر رہی تھی اور اس کے ٹائر گردش میں تھے اور ہم کسی سے یہ پوچھنے والے تھے کہ بھائی صاحب فتح پور سیکری کدھر ہے تو درجنوں نوجوان بھائی صاحبوں نے ہماری کار پر یلغار کر دی.. اس کا گھیراؤ کر لیا..

صاحب ہم آفیشل گائیڈ ہے.. یہ دیکھو ہمارا کارڈ.. ہم کو لے چلو.. پلیز سر..

صاحب.. ہمارا بچہ ہے دو.. وہ بھی آپ کو دعائیں دے گا.. ہم کو لے چلو.. بہت خفیہ اور تاریخی جگہ دکھائے گا..

صاحب.. ہم گورا لوگ کو لے کر جاتا ہے.. ہمارے پاس ان کا سرٹیفکیٹ ہے آپ کو بھی لے جائے گا.. جودھا بائی کے اس کمرے میں لے جائے گا جہاں اکبر اعظم اس کے ساتھ سوتا تھا اور پھر جہانگیر پیدا ہوا..

صاحب صرف سو روپیہ لے گا..

مان سنگھ اس تارڑ اور شاہ پر گائیڈ لوگوں کی یلغار ہو..

تاج محل کے باہر بھی ہم نے ایسے درجنوں آفیشل گائیڈ حضرات سے بمشکل جان چھڑائی تھی اس لیے کہ میں اپنے اور تاج کے پہلے نظارے کے درمیان ایک مسلسل ٹیں ٹیں

کرتا۔ گائیڈ طوطا نہیں چاہتا تھا کہ یہ ستون دیکھو.. اس پر شاہ جہاں نے ہاتھ رکھا تھا.. اور یہ ستون دیکھو اس پر شاہ جہاں نے ہاتھ نہیں رکھا تھا.. سنگ مرمر کے اس بُوٹے کو ملاحظہ فرمایئے' موسم بہار میں اس میں حیرت انگیز طور پر کونپلیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں.. وغیرہ وغیرہ.. اور وہاں ہم نے کبھی منت سماجت کر کے اور بالآخر دھمکیاں دے کر ان آفیشل گائیڈز سے چھٹکارا حاصل کیا اور یہاں پہنچے ہیں تو انہی کے بھائی ہمارا گھیراؤ کیے ہوئے ہیں..

ہم نے ان کو بھی پرے پرے کیا پر اُن میں سے ایک پرے نہ ہوتا تھا نہایت عاجزی سے منت سماجت کرتا تھا۔ ''صاحب صبح سے ادھر کھڑا ہے.. کوئی ٹورسٹ نہیں ملا.. صاحب گھر میں بوڑھے ماں باپ ہیں.. لاچار پڑے ہیں.. آپ جو دو گے شکریہ کروں گا.. نہیں دو گے تب بھی اُف نہیں کروں گا..''

اس کی آہ وزاری نے مجھے تو رُلا دیا..

''اور صاحب فتح پور سیکری پہنچنے کے لیے جب آپ سامنے دکھتا پل پار کریں گے تو آپ کو بیس روپے ٹیکس دینا ہوگا.. ادھر فتح پور میں داخل ہونے کے لیے تیس تیس روپے کا ٹکٹ ہے.. اسی روپے ہو گئے.. مجھے آپ صرف پچاس دے دینا.. میں آپ کو پار لے جاؤں گا..''

''نہ تو باقی تیس روپے آپ کیسے پورے کرو گے؟'' میں اس کے دام میں آ گیا..

''صاحب.. ہمارا حساب کتاب چلتا ہے.. بوڑھا ماں باپ ہے سر..''

اور واقعی اس کا کچھ حساب کتاب چلتا تھا..

ہم نے اسے کار میں بٹھا لیا..

اور وہ ہمارے برابر میں بیٹھا ایک دبکے ہوئے لاچار پرندے کی طرح.. پر سمیٹے.. خاموش' لرزیدہ اور اس کی آنکھوں میں ہمارے لیے تشکر کے چراغ جلتے تھے..

اُس پل کے پار گئے تو میں منتظر تھا.. کہ میری آنکھیں دیکھیں گی.. ان کے سامنے ڈھلتی دھوپ میں اکبر کے اس راجستانی دارالسلطنت کے بے آباد اور کھنڈر ہو چکے شہر کے

آثار ایک وسیع علاقے میں تاحد نظر بکھرے ہوئے نظر آئیں گے.. ان میں اجڑی ہوئی سرخ بستیاں ہوں گی.. حویلیاں اور محلات دھوپ میں اپنی بربادی پر نوحہ کناں ہوں گے.. دالان.. برآمدے.. غلام گردشیں.. سوکھے پڑے تالاب اور شکستہ محرابیں ہوں گی اور ان سونی گلیوں میں ایک مرزا یار پھرے گا..

لیکن ایسا ہرگز نہ ہوا..

ہوا یہ کہ ہم اس پل کے پار گئے.. تو کچھ ویرانی نہ تھی ہریاول تھی اور ایک پُر پیچ راستہ تھا اور ٹورسٹ ویگنیں اور بسیں اس پر آتی جاتی تھیں..

ذرا اونچے ہوئے.. راستے پر بلند ہوئے تو ایک پارکنگ لاٹ میں آ نکلے.. جہاں بے شمار سیاحتی کاریں.. کوچز اور ویگنیں ساکت کھڑی تھیں..

ہم اپنی کار سے اترے..

اور ہمراہ ہمارے بے چارگی اور اطاعت کا وہ مجسمہ نکلا جو کہ ہمارا آفیشل گائیڈ تھا..

بائیں جانب بہت ساری سیڑھیوں کے آخر میں بلندی پر ایک بہت ذی شان بلند دروازہ نظر آ رہا تھا اور اس کے اندر کوئی عالی شان مسجد تھی جس کے احاطے میں حضرت سلیم چشتی کا مزار تھا.. جہاں کھتری دنو دہر برس قوالی کرواتا تھا..

لیکن فی الحال میں دائیں ہاتھ پر ایک اور بلندی پر براجمان سرخ پتھر سے تعمیر کردہ اکبر کے راجستانی دارالسلطنت کے کھنڈر معجزے دیکھنا چاہتا تھا..

یہ اکبر دلّی سے کیوں اجتناب کرتا تھا..

اس نے میرے شہر لاہور کو سولہ برس تک پورے ہندوستان کا دارالسلطنت بنائے رکھا.. وہ قلعہ جس کی دیواریں مٹی اور گارے کی تھیں' انہیں پکی اینٹوں سے نو تعمیر کیا.. میرے شہر سے محبت کی لیکن میرے شہر میں ہی جو محبت کرنے والے تھے انہیں دیوار میں چُنوا دیا..

میں روز اُدھر سے گزرتا ہوں..

جب بھی سنگ میل کے شوروم کی جانب جاتا ہوں تو سول سیکرٹریٹ کی عمارت

کے سامنے جو ٹریفک لائٹ ہیں وہاں سے کار موڑ کر جاتا ہوں اور وہاں انارکلی کا مقبرہ ہے.. جو چُنی گئی۔ کبھی وہ سکھ حکمرانوں کے اسلحہ کا ایک گودام ہوا.. کبھی ایک کلیسا ہوا.. اور ان دنوں وہاں گزر گئے زمانوں کی دستاویزات ہیں.. ان کی حفاظت کے لیے ایسے اہلکار ہیں جنہیں خبر نہیں کہ اس سفید گنبدوں والی عمارت کے تلے کون چُنی گئی محبت دفن ہے..

آس پاس کیسا وہ کتبہ ہے جس پر انارکلی کے لیے سلیم.. جہانگیر کے غم واندوہ کے کچھ حرف کھدے ہیں..

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں..

تو اکبر دلّی سے اتنا اجتناب کیوں کرتا تھا کہ دارالسلطنت کے لیے سنگِ سرخ سے ایک نیا شہر تعمیر کروایا..

جہاں تک میرا مشاہدہ ہے فتح پور سیکری کا پورا کمپلیکس آس پاس کی میدانی سطح کے درمیان ایک پہاڑی پر پھیلا ہوا ہے.. ہوسکتا ہے نیچے میدانوں میں اور موجودہ فتح پور کی آبادی میں جو اس بلندی سے نظر آ رہی تھی' وہاں بھی کچھ آثار ہوں.. ہمارے مسکین گائیڈ صاحب ٹکٹ کی کھڑکی کی جانب گئے اور وہاں کچھ گفت وشنید کر کے اپنے وعدے کے مطابق ٹکٹ حاصل کر کے واپس آئے اور ہم محلات کے کمپلیکس کے اندر داخل ہو گئے..

اندر سے مراد بلندی پر فائز سرخ پتھر کے ایک مختصر محلاتی شہر میں.. ہمارے آس پاس مختلف شکلوں اور بناوٹوں کی عمارتیں تھیں.. بارہ دریاں.. حویلیوں کی دیواریں' ایک قلعے کے آثار اور نہایت نفیس جھروکے اور محرابیں.. اسے ہرگز ایک کھنڈر نہیں کہا جاسکتا تھا.. یہ سب تو نیا نویلا حال ہی میں تعمیر کردہ دکھائی دیتا تھا. لگتا تھا کہ اس کے معمار اور کاریگر اس کی تعمیر مکمل کر کے ابھی کچھ دیر پہلے اپنی برس ہا برس کی تعمیری تھکن اتارنے کو اپنے آبائی قصبوں اور شہروں کو گئے ہیں اور یہ شہر سرخ ابھی آباد نہیں ہوا.. جن لوگوں نے اسے اپنا مسکن بنانا تھا وہ ابھی دلّی یا لاہور میں مقیم ہیں ابھی یہاں شفٹ نہیں ہوئے.. یہ اتنا نیا لگ رہا تھا..

اور ہاں اندر داخل ہوتے ہی ایک عجیب وقوعہ ہوا کہ مسکین اور عاجز گائیڈ صاحب کا رویہ یکسر بدل گیا.. کہاں تو وہ یتیموں کی مانند مسکراتا گھگھیاتا جی جناب.. یس سر یس سر کر

رہا تھا اور کہاں وہ ماتھے پر تیوری ڈالے ہماری ناکوں میں نکیلیں ڈالے ہمیں جانوروں کی مانند کھینچتا پھرتا تھا.. ہم سے براہ راست مخاطب بھی نہ ہوتا تھا.. ہواؤں سے باتیں کرتا تھا.. ادھر مت جاؤ.. ادھر دیکھو.. جلدی کرو.. جو میں دکھا رہا ہوں' دھیان سے دیکھو.. ہم سمجھ نہ سکے کہ وہ ایسا کیوں ہو گیا ہے اور کیا ایک انسان کے لیے پل بھر میں اپنی خصلت یوں بدل لینا ممکن ہے.. وہ ہم پر نظریں نہیں ڈالتا تھا' آگے آگے چلا جاتا تھا اور بولتا جاتا تھا.. جب ہم نے اسے ذرا آہستہ چلنے کو کہا تو نہایت بدتمیزی سے بولا.. ''میں سارا دن تو تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا.. میرے پاس اور ٹورسٹ بھی ہیں جو غیر ملکی ہیں اور تم سے زیادہ پیسے دیں گے..'' کیا یہ وہی شخص ہے جسے صبح سے کوئی کام نہیں ملا تھا اور جس کے گھر میں لاچار پڑے بوڑھے ماں باپ تھے اور جس کی آنکھوں میں ہمارے لیے تشکر کے چراغ جلتے تھے.. جی چاہا کہ اسے بتائیں کہ بھائی ہم بھی غیر ملکی ہیں اور یہ بتاتے ہوئے اسے کچھ زدوکوب کریں لیکن چپکے ہو رہے کہ پردیس کا معاملہ تھا..

ہم ایک نہایت وسعت والے ویران صحن کے گرد تعمیر کردہ ایک مستطیل شکل کی عمارت میں داخل ہوئے.. صحن کے گرد غلام گردشیں اور محرابیں تھیں' جن کے عقب میں رہائش گاہوں کے آثار تھے.. دیواروں پر.. سرخ پتھر کی دیواروں میں تراشے ہوئے گل بوٹے اور خوش نظر آرائشیں..

''یہ رانی جودھا بائی کا محل ہے.. جودھا بائی جانتے ہو.. اکبر کی راجپوت ملکہ.. جہانگیر کی ماں.. انارکلی والے سلیم کی والدہ.. صحن کے درمیان میں جو چبوترہ ہے وہاں وہ پوجا کرتی تھی.. کسی زمانے میں یہاں تلسی کا ایک پوتر پیڑ ہوا کرتا تھا..''

میں نے اس محل کو نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ ڈرتے ڈرتے دیکھا.. عقیدت سے اس لیے کہ اپنے لاہور میں دفن شہنشاہ جہانگیر کی والدہ ماجدہ کا محل تھا اور احترام سے اور ڈرتے ڈرتے اس لیے کہ ان کی مانند میری بیگم بھی ایک کٹر راجپوت ہیں اور حکم چلانے میں اور آن بان میں کسی جودھا بائی سے کم نہیں..

اور صرف میں ہی جانتا ہوں کہ ایک راجپوت خاتون سے شادی کرنے پر آپ

پر کیا گزرتی ہے.. یا پھر اکبر جانتا تھا.. البتہ ایک فرق تھا کہ مجھ پر جو گزرتی ہے میں اس کا اظہار بھی کر دیتا ہوں جب کہ مغل اعظم کو یہ جرأت کبھی نہ ہوئی..

جودھا بائی کے محل سے باہر آئے تو داخلے پر ایستادہ پتھر پر کندہ اس محل کے بارے میں تاریخی حقائق کو ذرا غور سے پڑھا اور وہاں درج تھا کہ اس محل کا جودھا بائی سے کوئی تعلق نہیں.. تاریخ میں کہیں بھی کوئی ایسا حوالہ نہیں ملتا اور جودھا بائی نے یہاں کبھی بھی قدم رنجہ نہیں فرمایا تھا.. چنانچہ میں نے اب ہمارے حاکم ہو چکے گائیڈ سے عرض کیا کہ بھیا یہ تو جودھا بائی کا محل نہیں ہے..

''ہے..'' اس نے خاصی خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورا.. ''جودھا بائی کا پیلس ہے..''

''لیکن یار حکومت ہند کی جانب سے یہاں جو عبارت ہے اس کے مطابق تو..''

''یہ غلط لکھا ہے.. میں صحیح کہتا ہوں..''

''یہ کیسے غلط ہو سکتا ہے.. محکمہ سیاحت کی جانب سے.. تاریخی حقائق..''

''تمہیں مجھ پر یقین نہیں؟''

''نہیں بھائی.. بالکل یقین ہے لیکن..''

''تمہیں اس پتھر پر لکھی ہوئی عبارت پر یقین ہے؟''

''نہیں.. لیکن..''

''میں یہاں کا رہنے والا ہوں.. میں جانتا ہوں کہ یہ جودھا بائی کا محل ہے اور تم مجھ پر یقین نہیں کرتے.. مجھ پر اعتبار نہیں کرتے تو مجھے فارغ کر دو.. نکالو میرے پچاس روپے..''

میں نے کان لپیٹ کر چپکے سے اسے پچاس روپے پیش کر کے فارغ کر دیا تا کہ وہ غریب کا بال نیچے واپس جا کر کسی اور سیاح کے سامنے مسکین شکل بنا کر کہے کہ صاحب.. بوڑھے ماں باپ ہیں.. صبح سے یہاں کھڑا ہوں.. مجھے لے چلو.. کچھ دو گے تو لے لوں گا.. نہ دو گے تو..

اس کے رخصت ہو جانے پر ہم دونوں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا..

ذرا آگے گئے تو پہاڑوں کے کنارے پر واقع ایک حفاظتی فصیل پر کھڑے ہو کر نشیب میں پھیلے ہوئے ایک منظر کو دیکھا جس پر دھوپ کم ہو رہی تھی اور جس کے درمیان میں ایک سست ندی ڈھلتی روشنی میں چمکتی تھی..

ہم پھر سے چلنے لگے کہ ہم شتابی سے سب کچھ دیکھنا چاہتے تھے اور پھر دلّی لوٹنا چاہتے تھے..

بے شمار سیڑھیاں تھیں جن پر ہم اترے.. اترتے گئے.. اور پھر کچھ سیڑھیاں آئیں جن پر ہم چڑھتے گئے.. تھکے ہوئے اور پژمردہ.. آپس میں بات بھی نہ کرتے تھے کہ سانس سنبھالتے تھے..

تاج کی شدّت نظارہ اور شدّت گرمی نے دراصل ہمارا دم نکال لیا تھا.. ہم میں سکت نہ رہی تھی' چلنے کی' کچھ دیکھنے کی.. اور ہم اپنے آپ کو گھسیٹ رہے تھے..

ہم طویل سرخ محرابوں والے لامتناہی برآمدوں میں چلتے جا رہے تھے.. کہ ہم نے رات ہونے سے پہلے پہلے دلّی پہنچنا تھا' ہماری ٹانگیں چلنے سے انکاری ہو رہی تھیں لیکن ہم اپنے آپ کو اشتعال دلا رہے تھے کہ تم فتح پور سیکری میں ہو اور کیا پتہ کل ہو نہ ہو.. تو آج ہی ڈوبتے سورج میں جو یہ سرخ پتھر سونے کی ڈلیوں کی مانند تمازت دیتا ہے اسے دیکھ لو.. دیکھ لو..

ہم ایک اور وسیع شہر نما وسعت میں داخل ہوئے جس کی عمارتیں اور ان کے گنبد اور بناوٹیں یہ بتلاتی تھیں کہ اکبر کے دربار یہیں پر لگتے تھے اور مغل عہد کی مختصر تصویریں انہیں جھروکوں اور محرابوں کی تھیں جن میں سے شہزادیوں کے چہرے جھلکتے تھے..

ایک دیوان خاص تھا.. یا شاید دیوان عام تھا.. جس کے آگے ایک تالاب کے درمیان میں ایک شاہی نشست سنگ مرمر سے تراشی ہوئی تھی.. جیسے شالیمار باغ لاہور میں ایک سفید تخت بچھا ہے.. اور روایت یہی تھی کہ اکبر اعظم یہاں سایہ کرتا تھا

یعنی ظلِ الٰہی ہوا کرتا تھا اور تالاب کے گرد ایران‘ طوران‘ کاکیشیا‘ ترکی اور ازبک نازک ترین کنیزیں محو رقص ہوا کرتی تھیں.. جانے جودھا بائی اکبر کو اس قسم کے لہو و لعب میں مشغول ہو جانے کی اجازت کیسے دیتی تھی کہ ہمارے گھر میں جو جودھا بائی ہے وہ تو ہمیں فون پر بھی کسی دوشیزہ سے بات کرنے کی اجازت نہیں دیتی..

یہ شاہی نشست.. جس تک پہنچنے کے لیے تالاب کے اوپر معلق سنگ مرمر کا ایک تنگ سا راستہ ہے اس پر ہم دونوں بھی چلے.. اور پانیوں میں گرتے گرتے بچے..

ویسے یہ منظر شاہی نشست کا اور تالاب کا کچھ شناسا سا لگتا تھا اور جب غور کیا تو کھلا کہ کسی شاہ رخ خان کی فلم میں ایک قوالی کا منظر یہاں فلم بند ہوا تھا..

ایک اور عجوبہ عمارت تھی اس وسیع صحن کے بیچ میں.. ظاہر ہے کہ سنگ سرخ میں.. اور اس کے ستون ایسے پر پیچ اور پیچیدہ تھے کہ ان کا اب تک ایستادہ رہ جانا ہماری سمجھ سے باہر تھا.. اس کے فن تعمیر میں ہندو تہذیب کا غلبہ تھا.. اور اس میں قدیم مندروں کی سی خاموشی اور وقار تھا.. میں اس عجوبہ عمارت کے نام سے واقف نہیں لیکن میں نے اس کے حیرت بھرے پر پیچ ستونوں اور نقش و نگار کی تصویریں بہت دیکھی تھیں اور اسی لیے یہ عمارت اور اس کے ستون مجھے آشنا لگتے تھے..

شام ہونے کو تھی..

جیسے ہم اس جہان میں سرسری آتے ہیں ویسے ہم نے سرخ پتھروں کے اس جہان کو سرسری دیکھا.. کہ تفصیل سے دیکھنے کے لیے جو وقت درکار تھا وہ ہمارے پاس نہ تھا.. اور جو سکت درکار تھی اسے تاج محل نے تمام کر دیا تھا..

چنانچہ ہم شتابی سے اس شہرِ سرخ کے طلسم سے نکلے.. باہر آئے.. اور اب ہم گھر جانا چاہتے تھے.. نہ کچھ اور دیکھنا چاہتے تھے اور نہ کہیں اور جانا چاہتے تھے.. دلّی جانا چاہتے تھے..

”بلند دروازہ اور سحرِ سنگِ سرخ میں ایک ہیرا.. بارش میں نکھرا ہوا“

ہم اس کمپلیکس سے باہر آئے.. جہاں پارکنگ لاٹ میں کوچوں اور بسوں اور ویگنوں کے درمیان میں ہماری اکلوتی کار منتظر تھی..

کار کی جانب کشاں کشاں جاتے تھے اس میں سوار ہونے کی اور اپنے نڈھال وجودوں کو آرام دینے کی خاطر بڑھتے تھے جب وہی ایک اور بلندی پر فائز ایک دروازہ نظر آیا.. اس کے اندر سلیم چشتی کا مزار تھا..

”شاہ جی..“

”ہاں جی..“

”کچھ ہمت ہے؟“

”نہیں ہے چودھری صاحب..“

”ٹھیک ہے.. مجھ میں بھی نہیں ہے..“

گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے شاہ جی کو جانے کیا خیال آیا مونچھوں کو تاؤ دے کر کہنے لگے: ”ویسے چودھری صاحب فرض کیجیے کہ اگر کچھ ہمت ہوتی تو کیا ہوتا؟“

”یہ ذرا بلند دروازے کے اندر بھی جھانک لیتے..“

”ویسے مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن اس بلند دروازے تک پہنچنے والی سیڑھیوں

کا آپ نے کچھ شمار کیا ہے.. اس عمر میں آپ کسی شے پر بھی چڑھنے جوگے نہیں ہیں.. اتنی سیڑھیاں کیسے چڑھیں گے.. رہنے دیں۔"

"شاہ جی ہمت مرداں.. مدد خدا۔"

"چودھری صاحب آپ کی عمر میں بندہ کتنا مرد رہ جاتا ہے.. رہنے دیں۔"

"شاہ جی.." میں بے حد محظوظ ہوا اور یونہی اداکاری کرتے ہوئے اپنا سینہ پھلا کر کہا "آپ نے میری قوتِ مردمی کو للکارا ہے.. ہم تو وہ لوگ ہیں جو کے ٹو اور نانگا پربت کے دامن تک پہنچ جاتے ہیں.. دنیا کے طویل ترین برفانی راستے کو طے کر جاتے ہیں.. یہ چند سیڑھیاں ان سے زیادہ تو بلند نہیں۔"

لیکن وہ تھیں.. وہ کے ٹو اور نانگا پربت سے کہیں بلند تھیں.. بھوک اور تھکاوٹ نے انہیں بلند کر دیا تھا..

وہ جانے کتنی تھیں.. سینکڑوں یا ہزاروں تھیں اور ہم ان پر ہانپتے ہوئے اپنے آپ کو کوستے ہوئے ان پر بلند ہوئے اور اس شاندار بلند دروازے کے سائے میں ہوئے جو فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے..

اس بلند دروازے میں فن تعمیر کی جو ایک نادر خوبی تھی' وہ میرے دوست ماہر تعمیر نیر علی دادا نے لاہور واپس پہنچنے پر مجھے بتائی.. نیر کا کہنا تھا کہ فتح پور سیکری کے اس بلند دروازے میں سے جب آپ داخل ہوتے ہیں تو ایک اونچی سر بہ فلک محراب میں سے داخل ہوتے ہیں لیکن جب آپ آگے بڑھتے ہیں اس عظیم اور وسیع مسجد میں اندر جانے کے لیے تو اس میں داخل ہونے کے لیے جو محراب ہے وہ بہت مختصر اور چھوٹی ہے تا کہ آپ اس میں قدم رکھ کر جب اگلا قدم اٹھاتے ہیں تو یکدم سامنے کا منظر کھلتا ہے اور وسیع ہو جاتا ہے..

مجھے تب اتنی فن تعمیر کے حوالے سے تکنیکی خوبیوں کا علم نہ تھا..

لیکن بلند دروازے میں سے ہم محض جھانک کر واپس نہ ہو گئے بلکہ اپنی تمام تر تھکان کے باوجود اندر چلے گئے..

اور کیسے نہ جاتے..

اس اندر جانے میں مرضی کو کچھ عمل دخل نہ تھا..

یہ ایک بے اختیاری عمل تھا کہ اندر ایک اور سحرِ سنگِ سُرخ تھا..

کیسے نہ جاتے..

یہ سحرِ سنگِ سُرخ بھی اثر انگیزی میں یکتا تھا.. ابھی کچھ دیر پہلے مطلع ابر آلود ہو چلا تھا اور ہلکی سی بارش بھی ہوئی تھی.. اور اس کی نمی سے مسجد کا بلند دروازہ اور وسیع صحراؤں ایسی وسعتوں والا صحن بھیگ کر سرخی سے دہک رہا تھا.. صحن کے چاروں اور محراب دار راہداریوں کے سلسلے تھے.. درویشوں اور طالب علموں کی کوٹھڑیاں تھیں.. اگر میں اس صحن کے گرد جو برآمدے اور راہداریاں تھیں ان میں چلنے لگتا تو مسجد کا احاطہ کرنے میں ہی رات ہو جاتی.. میرے پاس ایک ہی موازنہ تھا لاہور کی شاہی مسجد کا.. وہ بھی بے شک شاندار اور پرشکوہ تھی لیکن یہاں سوگوار حسن اور قدامت کی جو دلگیری تھی وہ مثال نہیں رکھتی تھی..

اور اس کے.. صحن کے ایک رُخ پر سلیم چشتی کا اس سرخ دنیا کے بیچ سنگ مرمر کا سفید پُرفسوں مزار تھا.. ایک ہیرا تھا بارش میں نکھرا ہوا.. قدم بے اختیار اسی کی جانب بڑھتے ہیں لیکن اس کا کیا کیجیے کہ ہندوستان میں جہاں کہیں بھی صوفیائے کرام کے مزار ہیں.. دلی والے نظام الدین ہوں یا اجمیر کے خواجہ چشتی ہوں یا ادھر فتح پور سیکری میں سلیم چشتی ہوں' وہاں جونکیں ہوں گی جو آپ کو چمٹ جائیں گی.. کہ صاحب نذرانہ دے کر جاؤ.. کیسے مرید ہو کہ پلے سے رقم نہیں نکالتے.. ہم اولیاءؒ کے خواجہ کے رکھوالے ہیں.. ان کی اولاد میں سے ہیں.. ہماری جھولی بھرو گے تو یہ تمہاری جھولی بھریں گے.. اجمیر میں تو شنید ہے کہ یہ حضرات سٹیشن پر پہنچ کر ٹرین سے اترنے والوں کو دبوچ لیتے ہیں تا کہ کوئی دوسرا مجاور ان پر قابض نہ ہو جائے.. اور اکثر کسی ایک زائر پر قبضے کی کوشش میں فساد بھی ہو جاتا ہے.. میں کم از کم ایک ایسے شخص کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جو صرف خواجہ کو سلام کرنے کے لیے اجمیر گیا اور وہاں مجاوروں کی ہاتھا پائی سے تنگ آ کر مزار پر حاضری دیے بغیر واپس آ گیا..

یہاں اگرچہ ان کی تعداد کم تھی لیکن ایک دو جونکوں نے فوری طور پر مجھ سے چمٹنے کی کوشش کی.. کہ حضور آیئے دعا میں شریک ہو جایئے اور ہاتھ بلند کر دیجیے.. میں کچھ

کہے بغیر آگے ہو گیا تو وہ اپنی دعا منقطع کر کے پھر میرے تعاقب میں چلے آئے.. جناب نذرانہ عطا کیجیے.. یہ طے تھا کہ میں دلجمعی سے اس صوفی کے مزار پر نہ کچھ پڑھ سکوں گا اور نہ کچھ سوچ سکوں گا..

ایک اور خرانٹ قسم کے نوجوان مولانا بازو پر چند سیاہ دھاگے لٹکائے آئے..

"آپ ہمارے حضرت کے مرقد کی جالی سے یہ دھاگا باندھ کر جو بھی خواہش کرو گے پوری ہو گی.. صرف دس روپے.."

"دس روپے میں ایک دھاگا.."

"جی.."

"جتنی خواہشیں مرضی کرو.."

"نہیں صاحب ہر خواہش کے لیے ایک الگ دھاگا درکار ہے.. کتنے دھاگے پیش کروں.."

"نہیں.."

"کوئی خواہش نہیں کرو گے.. بدقسمت ہو گے.. ایک دھاگا تو لے لو.. دس روپے.."

"نہیں.." میں نے اپنی تھکی ہوئی اور سرخ آنکھوں سے اتنی دیر گھورا کہ وہ تنگ آ کر بڑبڑاتا ہوا چلا گیا..

ایک دھاگا.. ایک خواہش..

اگر صرف ایک دھاگہ سلیم چشتی کے مزار کی جالی سے باندھنے سے میری ایک خواہش پوری ہونے کا ذرہ برابر بھی امکان ہوتا تو ایک دھاگا تو کیا میں جولاہا ہو جاتا.. بے انت دھاگے خرید کر ان سے خواہش کا کھیس بننے لگتا.. لیکن میں جانتا تھا کہ کسی بھی سحر کی یا معجزے کی ایک حد ہوتی ہے جس کے پار نصیب نہیں جا سکتا..

اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سنسار جھوٹا ہے.. اس نے جھوٹ کے دھاگے بنا رکھے ہیں مجھے فریب دینے کے لیے.. مجھے ان سے باندھ کر اپاہج کر دیتا ہے اور کہتا ہے تم

اب چلنے لگو گے.. یہ سب جانتے ہوئے بھی میں تمام عمر دھاگے باندھتا رہا.. خواہش کرتا رہا.. کہ کچھ اور کرنا میرے بس میں نہ تھا.. لوگوں نے یونہی ہمیں جُل دے رکھا ہے کہ کچے دھاگے سے بندھی آئے گی سرکار مری.. ہماری سرکار تو نہ بندھی.. ہم ایک مدت ایک کچی کوٹھڑی میں کھڈی کے سامنے پاؤں لٹکائے خواہش کے کھیس بنتے بنتے نابینا ہو گئے پر سرکار نہ بندھی..

وہ خرانٹ مولوی جی چند گورے سیاحوں کو دیکھتا ہے تو ان کے گرد لٹو ہونے لگتا ہے "وِشنگ سٹرنگ.. ففٹی روپی.. وِشنگ سٹرنگ.."

ویسے کچھ قلق بھی ہوا کہ دس روپے کی تو بات تھی ایک اور دھاگا باندھ کر دیکھ لیتے..

دعا اور فاتحہ کو بھول کر میں نے سوچا کہ سلیم چشتی کے مزار کی اندرونی کاریگری اور نقاشی کو ہی ذرا اطمینان اور تفصیل سے دیکھ لوں پر کہاں.. میں نے جونہی ایک منقش گُل بوٹوں سے تزئین کردہ پتھر کو ذرا غور سے دیکھا تو ایک اور صاحب چمٹ گئے.. "یہ دیکھو صاحب.. یہ سارے کا سارا کام سمندری سیپ کا ہے.. سیپوں کو جوڑ کر اس کی آرائش کی گئی ہے.. اور یہ پھول ملاحظہ کیجیے.. سینکڑوں رنگین پتھروں کو تراش کر اس کی پتیاں بنائی گئی ہیں.. اور ذرا جالی میں سے چھن چھن کر آتی روشنی کے زاویے کو ملاحظہ کیجیے.. دس روپے دیجیے گا..."

میں باہر آ گیا..

باہر اداسی بہت تھی..

بلند دروازہ مسجد کے بھیگے ہوئے وسیع صحن میں ایک گہری اداسی تھی..

شاید بادلوں کی وجہ سے جو نیم تاریکی نازل ہو رہی تھی یہ اس کا اثر تھا یا ہو چکی بارش میں کچھ سیاہ ذرّے تھے جو در و دیوار اور صحن کے پتھروں میں جذب ہو کر انہیں سوگواری میں بھگوتے تھے.. یا یہ میری غریب الوطنی تھی.. وطن سے دوری تھی اور دن بھر کی تھکاوٹ تھی جو مجھے بھی اور اس ذی شان عمارت کو اداس کرتی تھی..

بس یہی سبب تھا..

دراصل وقت کی کمی کے باعث میں ان پُرشکوہ عمارتوں کو جانے بغیر.. ان سے

تفصیلی ملاقات کیے بغیر ان کی تاریخی اہمیت سے آگاہ ہوئے بغیر ایک ہراساں ہرن کی مانند چوکڑیاں بھرتے ان میں سے نکل جانا چاہتا تھا تو یہی سبب تھا.. ایک ایسا ہرن جو تھکاوٹ سے نڈھال ہے جو اس کی ناتواں چوکڑیوں سے ظاہر ہے اور جس کے سامنے ایک اجنبی ملک کی رات میں ایک طویل سفر ہے اور اس کا ڈر ہے.. اگرچہ اس کے سامنے ان زمانوں کے ماہرترین کاریگروں اور صناعوں کے معجزے ہیں لیکن وہ انہیں ٹھہر کے نہیں دیکھ سکتا.. ان کو نظروں میں اتار نہیں سکتا بلکہ نظریں اُن پر تیراتا نکلتا جاتا ہے.. یہاں تک کہ اپنی طرز کے واحد بلند دروازے کی آسمانی محرابوں کو بھی رک کر چہرہ بلند کر کے کچھ دیر نہیں دیکھتا بلکہ ایک چور کی مانند منہ چھپائے تیزی سے گزر جاتا ہے..

اکبراعظم کے شہر سرخ کو میں نے اپنی بے اعتنائی. تھکاوٹ اور دلّی واپس پہنچنے کی سراسیمگی نے کھنڈر کر دیا تھا ورنہ وہ آباد تھا..

بلند دروازہ مسجد اور سلیم چشتی کے مزار کو میرے بدن کی پژمردگی نے پژمردہ کر دیا تھا ورنہ ان کی کوئی مثال نہ تھی..

میں نے بھی امریکی سیاحوں والا رویّہ اپنا لیا تھا کہ بس ایک اچٹتی ہوئی نظر ہر عمارت پر ڈالتا تھا اور اپنی ڈائری میں درج شدہ قابل دید مقامات کے آگے نشان لگاتا چلا جاتا تھا کہ.. تاج محل.. دیکھ لیا. ممتاز محل اور شاہ جہاں کی قبریں.. دیکھ لیں.. قلعہ آگرہ.. دور سے دیکھ لیا.. اکبراعظم کی قبر.. یلغار ہو مان سنگھ دیکھ لی.. فتح پور سیکری کا شہر اور سلیم چشتی کا مزار.. وہ بھی دیکھ لیا..

یہ احساس بھی ہوا کہ فتح پور سیکری نے میرے حواس پر اگر یلغار نہ کی اور میں کسی حد تک اس شہر سرخ سے مایوس ہوا تو قصور میرا نہ تھا تاج محل کا تھا کہ اس کے بعد ہر شے ہیچ ہو جاتی تھی.. جیسے غارِ حرا کا ایک پتھر دیکھ لو تو پورا ہمالیہ اس کے سامنے ہیچ ہو جاتا ہے.. ان دونوں کو.. تاج کو اور فتح پور سیکری کو ایک ہی دن میں یکے بعد دیگرے نہیں دیکھنا چاہیے.. کسی ایک دن صرف تاج اور کسی اور دن تازہ دم ہو کر صرف فتح پور سیکری..

لیکن یہ سفر فتح پور سیکری کا یکسر رائیگاں نہ گیا.. اک شہر سرخ اگر شفق کے رنگوں میں

سرخ در سرخ دکھائی دے جائے تو وہ تاج کی سفیدی کو چند ساعتوں کے لیے بھلا دیتا ہے..

ہم اکبر کے شہر سرخ اور بلند دروازے کی بلندی سے اترتے.. گھومتے.. بل کھاتے.. نیچے میدانوں میں آئے اور ہماری کار دلّی کی جانب رواں ہوئی.. ایک نامعلوم راستے پر رواں ہوئی.. اور کچھ لمحوں کے بعد میں نے حسب عادت ایک دل گرفتہ عاشق کی مانند جدائی کے لمحوں میں جب آخری بار مڑ کر پیچھے نظر کی تو میدانوں کے پار.. ایک ندی کے پار.. ایک بلندی پر سرخ پتھروں کی وہ بستی نظر آنے لگی جو دور ہوتی جاتی تھی.. اور یہ وہ بستی نہ تھی جس میں سے میں ابھی اتر کر آیا تھا..

کہیں ہم سے اوجھل راجھستان کے صحراؤں میں جو بادِ نسیم ہولے سے چلتی تھی اس میں اوجھل سورج ڈوبتا تھا.. اور اس کی ڈوبتی سرخی ابھرتی تیرتی اس بستی تک آتی تھی اور اسے اپنے رنگ میں رنگتی تھی..

میدانوں کے اوپر ایک بلندی پر سنگِ سرخ اور شفق کی سرخی کا ملاپ ہو رہا تھا اور ان کے ملن سے حیا کی وہ سرخی جنم لے رہی تھی جو فتح پور سیکری کی فصیلوں اور جھروکوں اور حویلیوں کو رنگتی تھی..

رنگ ریجوا نے اپنی بھٹی چڑھا دی تھی اور اس میں یہ شہر سرخ ایک قصرِ الحمرا کی مانند کہ وہ بھی سرخ ہے.. رنگا جا رہا تھا.. آج رنگ دے..

میری آنکھیں یوں بھی سرخ رہتی ہیں ان میں جب یہ شہرِ سرخ شفق کی روشنی میں رنگا اترا تو وہ سرخ سمندر ہو گئیں..

تو یہ سفر رائیگاں نہ گیا..

”بھرت پور کے جاٹ.. پیلی بھیت کے ڈاکو راجھستان کی رات میں“

اس منظر سے جب منہ موڑا.. بلکہ وہ اوجھل ہو گیا تو منہ موڑا.. تو دلی پہنچنے کی تشویش کا آغاز ہو گیا..

ڈرائیور ہماری بیتابی سے آگاہ تھا: ”صاحب.. ادھر سے اگر ہم واپس آگرہ جائے گا اور پھر وہاں سے دلّی جائے گا تو بہت ٹائم لگے گا.. آپ بولو تو ادھر سے شارٹ کٹ مارتا ہے.. بولو..“

”کدھر سے شارٹ کٹ مارتا ہے؟“

”ادھر سے ہم سیدھا نہیں جائے گا آگرہ کو.. بلکہ بھرت پور کے راستے پر نکل جائے گا اور متھرا پہنچ جائے گا.. ادھر سے نزدیک ہے.. بولو..“

اب میں نے اس بھرت پور کا نام تو کہیں اور بھی سن رکھا تھا لیکن تعین نہ کر سکا کہ یہ بھرت پور کون سا ہے.. میں کیا بولتا‘ ہامی بھر لی اور اس بھلے مانس سورتی مسلمان برادر سے یہ دریافت نہ کیا کہ بھلے آدمی کیا ابھی ابھی تمہارے ذہن میں یہ نادر خیال شارٹ کٹ کا آیا ہے یا تم اس پر اکثر آتے جاتے رہتے ہو.. اور وہ پہلی بار آیا تھا اور پہلی بار جا تا تھا‘ یہ بعد میں کھلا..

بائیں جانب ڈوب چکے سورج کی آخری دم توڑتی کرنوں میں ایک ٹیلے پر زنگ

خوردہ دو سیاہ توپیں آرام کرتی دکھائی دیں..

میں نے ان توپوں کا تذکرہ کہیں پڑھ رکھا تھا.. لیکن کہاں..

اور پھر تعین ہو گیا کہ بھرت پور کا نام میں نے کہاں اور کس حوالے سے سن رکھا تھا..

یہ ہمارے جاٹ بھائیوں کا بھرت پور تھا..

بھرت پور کے جاٹ جانے تارڑ تھے یا چیمے تھے‘ بہر طور جاٹ تھے اور تاریخ میں ان کے تذکرے تھے.. اور یوں میرے قبیلے کے لوگ تھے اور حسب دستور نہایت اکھڑ اور ان پڑھ اور مار دھاڑ کے شوقین تھے.. مغل سلطنت کے زوال کے دنوں میں یہاں کے جاٹ دلّی پر حملہ آور ہوئے.. مغل اعظم کے مقبرے کو برباد کیا... جی بھر کے لوٹ مار کی.. اور جب جی بھر گیا تو سوونیئر کے طور پر مغلوں کی فوج کی دو توپیں گھسیٹ کر بھرت پور لے آئے..

یہ وہی دو توپیں تھیں جو سورج کی آخری دم توڑتی کرنوں میں ایک ٹیلے پر آرام کرتی زنگ آلود گزرتی جاتی تھیں..

شام ہو رہی تھی..

تاریکی بڑھتی جاتی تھی..

بادل بھی تھے اس لیے تاریکی اور گھنی ہوتی جاتی تھی..

بھرت پور کا قصبہ بھی بھرتی کا ایک اور عام سا قصبہ تھا جس میں ہمیں کوئی بھی وحشی جاٹ دکھائی نہ دیا..

اور نہ اس کے مکینوں نے اُس کار پر ایک نظر کی جس میں ان کے قبیلے کا ایک تارڑ جاٹ گزرتا جاتا تھا..

بھرت پور ایک بکھرا ہوا سا کھویا کھویا قصبہ تھا اور شام کے سائے اس میں اداسی بھرتے تھے.. راستوں کا کچھ تعین نہ ہو پا رہا تھا.. کس چوک سے دائیں مڑنا ہے یا بائیں.. جدھر آسانی سے مڑ سکتے تھے مڑ جاتے.. ہر دوراہے پر میں ڈرائیور سے گزارش کرتا کہ بھائی

دلّی کا راستہ پوچھ لینے میں کیا حرج ہے..

ایک چوراہے پر ایک کاہل سا سپاہی کھڑا توند سہلا رہا تھا۔ اس سے راستہ دریافت کیا تو وہ ڈرائیور سے کہنے لگا: ”دلّی کو راستہ تو یہی جائے گا.. پر اس پر نہ جانا“

”کیوں؟“

”آگے ہمارا تھانیدار کھڑا ہے.. پیپر چیک کرتا ہے..“

”وہ میرے پاس سارا ڈاکومنٹ ہے صاحب“ ڈرائیور نے کہا۔

”تو جاؤ آگے اور ڈاکومنٹ دکھاؤ..“ سپاہی نے اسے گھورا۔ ”کچھ بھی دکھاؤ وہ نہیں مانے گا پیسہ مانگے گا ورنہ حوالات میں بند کر دے گا.. سب کو“

”ڈرائیور صاحب“ شاہ صاحب نے اسے سمجھایا: ”دلّی پہنچنے کی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔ آج رات نہ سہی کل صبح پہنچ جائیں گے۔ آپ ادھر سے نہ جاؤ جہاں تھانیدار کھڑا ہے..“

آخر یہ توندیلا سپاہی اپنے تھانیدار کی نسبت ہمارا خیر خواہ کیوں ہو رہا تھا۔ اس کی ایک ہی توجیہہ سمجھ میں آتی تھی کہ تھانیدار اسے مالِ غنیمت میں سے حصہ نہ دیتا ہوگا ورنہ اور کوئی وجہ نہ ہو سکتی تھی..

چنانچہ ہم اُدھر سے نہ گئے اور بھرت پور میں چکر لگاتے رہے.. جب کسی سے راستہ پوچھتے وہ وہی راستہ بتاتا جس پر وہ تھانیدار کھڑا تھا..

بالآخر بھٹکتے بھٹکتے ہم قصبے سے نکل ہی آئے..

شام کے بعد رات نے آنا تھا سو آ گئی.. اور ذرا گھنیری آئی کہ آسمان بادلوں سے بھرا ہوا اور چپ تھا.. تاریکی اتنی بڑھی کہ ڈرائیور نے کار کی ہیڈ لائٹس جلا دیں.. اس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی.. کار کے ذرا تھرتھرانے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ باہر ہوا کا چلن تیز ہو رہا ہے.. دونوں جانب گھنے سرکنڈوں کی ایک دیوار تھی جو بارش کی آمد سے پیشتر کے جھکڑ میں دوہری ہو رہی تھی اور ہوا ان کو چیرتی گزرتی بھٹکتی شائیں شائیں کرتی تھی..

ایک مہیب اور سیاہ منظر تھا جس کے درمیان میں سے ہماری تنہا کار ہوا کی شدت

سے ڈولتی چلی جا رہی تھی..

پہلے تو ونڈ سکرین پر چند موٹے موٹے چھینٹے گرے اور جہاں جہاں وہ گرے وہاں وہاں تیز ہوا نے انہیں پھیلا دیا اور پوری ونڈ سکرین نم آلود ہو گئی.. ان چھینٹوں کے قدموں پر بارش چلی آئی اور ایسی آئی گویا آبشاروں کے منہ کھل گئے ہوں.. پانی کی دبیز چادریں گرنے لگیں.. وائپر اپنی سکت کے مطابق جتنی تیزی سے ونڈ سکرین پر سے پانی سمیٹ سکتے تھے‘ سمیٹتے تھے پر وہ سمیٹا نہ جاتا تھا‘ اس کی مسلسل دھاریں شیشے کو نابینا کرتی تھیں.. چنانچہ ڈرائیور ونڈ سکرین کے ساتھ ناک لگائے اندازے سے چلا جاتا تھا کہ آگے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پر بھی اتنا مینہ برستا تھا کہ وہ دیے کی لو لگتی تھیں..

پہلے تو ہم اس آسمانی سیلاب کی آمد سے اگرچہ ڈرتے ڈرتے ہی سہی پر کچھ لطف اندوز ہوتے رہے.. یونہی ادھر ادھر کی ہانکتے رہے.. تاج اور فتح پور سیکری کے قصے ایک دوسرے کو سناتے رہے لیکن جب ہمارے حساب سے تو زمانے بیت گئے اور پانیوں کی بوچھاڑ میں کچھ کمی نہ آئی.. بارش کا شور بدستور گونجتا رہا.. آس پاس کے سرکنڈوں کی شائیں شائیں کی خوفناکی بلند ہوتی گئی اور ہیڈ لائٹس پر پانیوں کی چادر انہیں بجھانے کی کوشش کرتی رہی تو ایک شدید خوف بدن میں اترنے لگا.. پردیس تھا.. ہم کیسے جان سکتے تھے کہ بھرت پور سے باہر آ کر ہم دلّی کی بجائے کسی اور سمت چلے آئے ہوں.. شاید جیسلمیر کی جانب ہی چلے جاتے ہوں.. اس ڈر کے علاوہ اگر یہاں جہاں کہیں بھی ہم تھے کار کے انجن میں کوئی خرابی واقع ہو جاتی ہے یا ٹائر ہی پنکچر ہو جاتا ہے‘ کچھ بھی ہو جاتا ہے تو ہم کریں گے کیا.. اس ویرانے میں اور وہ بھی نامعلوم ویرانے میں برستی بارش اور سرکنڈوں کے شور میں کیا کریں گے.. یہ وسوسے تھے جو کار کی ہیڈ لائٹس کی زد میں آنے والے سرکنڈوں میں سے سر اٹھاتے تھے..

ہم اس خوف کی حالت میں دیر تک چپ رہے۔ ایک دوسرے کی حالت سے آگاہ رہتے ہوئے خاموش بیٹھے رہے۔ جب کار کی ہیڈ لائٹ نے ایک سنگِ میل پر درج ”پیلی بھیت“ کے نام کو روشن کر دیا..

''اے بھائی..'' میں نے ڈرائیور کا کاندھا چھو کر کہا۔ ''ہم تو کسی پیلی بھیت کی جانب جا رہے ہیں..''

''آپ کیسے جانتے ہو صاحب؟''

''ابھی سنگ میل پر لکھا ہوا نظر آیا ہے.. ورنہ میں کیسے جان سکتا تھا تو اُدھر جا رہے ہیں؟''

''کیا معلوم صاحب..'' صرف اتنا جواب تھا..

''کیا مطلب کہ کیا معلوم.. تمہیں معلوم نہیں.. تم اس راستے پر سفر کر چکے ہو اور پھر بھی تمہیں نہیں معلوم..''

''صاحب مجھے تو فتح پور میں ایک ڈرائیور نے بتایا تھا کہ اِدھر سے شارٹ کٹ ہے متھرا میں جا نکلو گے.. میں تو اِدھر پہلی بار آیا ہوں.. کیا معلوم یہ پیلی بھیت کہاں سے آ گیا..''

ہم سوائے سفر کرتے جانے کے اور کیا کر سکتے تھے.. آس پاس کوئی آبادی ہوتی' انسان ہوتا تو کار روک کر دریافت کرتے کہ بھائی..

کبھی کبھار کوئی موٹر سائیکل سامنے سے نمودار ہو کر ہمارے پاس سے گزر جاتا.. چلتے جانے کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا..

میرے ڈرے ہوئے ذہن کے کسی گوشے میں سے یکدم پیلی بھیت کے نام سے ایک قدیم شناسائی کی دھندلی یاد ابھری۔ ''شاہ جی..''

''ہاں جی..''

''مجھے یاد آ گیا ہے کہ یہ کون سا والا پیلی بھیت ہے.. بچپن میں میں نے ایک ناول یعنی بچوں کا ناول پڑھا تھا ''پیلی بھیت کے ڈاکو'' تو کیا یہ ایک حسین اتفاق نہیں ہے کہ ہم آج رات اس پیلی بھیت کے نواح میں ہیں۔''

''ہاں..'' شاہ جی نے صرف اتنا کہا اور چپ سادھ لی..

مجھے حیرت ہوئی کہ شاہ جی نے میری یادداشت کی داد نہیں دی.. ماحول کو قدرے

کم آزردہ کرنے کے لیے میں نے چہکتے ہوئے اور بہت جبر کر کے بظاہر چہکتے ہوئے کہا۔ ''یار یہ جو آس پاس ہوا سے دوہرے ہوتے بارش میں بھیگتے ہوئے گھنے سرکنڈے ہیں تو پیلی بھیت کے وہ ڈاکو اِن میں بھی تو پوشیدہ ہو سکتے ہیں۔''

''چودھری صاحب.. آپ چپ نہیں ہو سکتے۔'' شاہ جی باقاعدہ جلال میں آ گئے۔ ''ہمارے ملتان میں بھی کچھ لوگ شاید اسی پیلی بھیت کے آباد ہیں اور ان میں ایک معروف شاعر بھی ہیں جو پیلی بھیتی کہلاتے ہیں لیکن یہاں.. کیا ڈاکوؤں کا تذکرہ کرنا بہت ضروری ہے..''

''یار میں نے واقعی بچپن میں ''پیلی بھیت کے ڈاکو'' نامی ناول پڑھا تھا۔''

''پڑھا ہوگا چودھری صاحب.. پیلی بھیت کی چڑیلیں نامی ناول بھی پڑھا ہوگا.. لیکن اب تم نے اگر متھرا پہنچ جانے سے پہلے کوئی بھی ایسی ویسی ڈاکوؤں والی بات کی تو میں.. جسٹ شٹ اپ..''

شاہ جی اگر آپ جناب سے تم پر اتر آئے تھے اور ملتان سے جب پہلی بار شہر لاہور آئے تھے تو سیدھے مؤدب ہو کر میرے پاس آئے تھے اور اب اگر مجھے جسٹ شٹ اپ کہہ رہے تھے تو یقیناً وہ حق بجانب تھے کہ میں اس شب دیجور میں اور پردیس میں گمشدہ حالت میں خواہ مخواہ چہک رہا تھا لیکن میں کیا کرتا' میں نے واقعی بچپن میں ''پیلی بھیت کے ڈاکو'' نامی ناول پڑھا تھا..

میں اب اس شاہ کو کیا بتاتا کیونکر اقرار کرتا کہ میں اُس سے کہیں زیادہ ڈرا بیٹھا تھا.. لیکن زیادہ اس لیے کہ میں کچھ اور بھی جانتا تھا.. چونکہ مجھے متھرا تک منہ بند رکھنے کی وارننگ مل چکی تھی اس لیے میں وہ منہ کھول بھی نہیں سکتا تھا ورنہ جو کچھ جانتا تھا وہ بھی عرض کر دیتا کہ جناب ہم دونوں بھولے بادشاہ ہیں۔ آپ شاہ بادشاہ ہیں اور ہم چودھری بادشاہ ہیں اور اس کے باوجود ابھی تک کیسے بے خبر ہیں کہ کچھ غور نہیں کیا کہ ہم دونوں کے پاس صرف آگرہ دیکھنے کا انڈین ویزا ہے.. اور ہم منہ اٹھائے بے دھیانی میں یوپی کے صوبے سے سفر کرتے راجھستان کے فتح پور سیکری میں چلے گئے.. اب تک تو قسمت نے ساتھ دیا تھا جیسے ہر بے وقوف کی قسمت کچھ دور تک ساتھ دیتی ہے لیکن.. رات کی اس بارش تنہائی میں اگر

آگے کوئی روڈ بلاک ہوا جو ان زمانوں میں ہوتے ہیں تو پولیس والوں کو کیا جواب دیں گے کہ ہم پاکستانی ویزا کے بغیر رات کے وقت ادھر راجستھان میں، بھرت پور یا پیلی بھیت میں کیوں بھٹک رہے ہیں۔ یہ امکان قوی تھا کہ کہیں چیکنگ ہوگئی تو ہمارے پاکستانی جاسوس ہونے میں کچھ شبہ نہ ہوگا اور ہم شاید آگرہ کی جیل میں ایک مدت قیام کریں گے۔ جب تک کہ دونوں حکومتیں خیرسگالی کے اظہار کے طور پر اپنی اپنی جیلوں میں بند گلتے سڑتے قیدیوں کا تبادلہ نہ کرلیں..

میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار شاہ جی سے ہرگز نہ کیا۔ اگر کرتا تو قوی امکان تھا کہ جونیئر ہونے کے باوجود وہ میری بزرگی کا کچھ لحاظ نہ کرتے۔ اور بنا مجرم محسوس کیے میرا ٹینٹوا دبا دیتے کہ چودھری تم مجھے ساتھ کیوں لائے تھے..

جانے کون سی بستیاں تھیں جو گزرتی جاتی تھیں..

ہم چپ بیٹھے رہے.. یہاں تک کہ شاہ کی مونچھیں بھی ساکت رہیں.

اور جانے کون سے راستے تھے اور ہم اس رات میں کہاں تھے جب بارش کے زور میں کمی واقع ہونے لگی.. مدھم ہوتی ہوتی رک گئی.. اب صرف وہی چھینٹے اڑتے تھے جو سڑک پر جمع شدہ پانی پر سے گزرتے ہوئے ہماری کار کے ٹائر اڑاتے تھے..

اس لمحے ایک اداسی اور بے وطنی کا احساس میرے بدن میں خیمہ زن ہوا..

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان میں کچھ فرق نہیں.. وہاں گھومتے ہوئے ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ ہم پاکستان میں نہیں ہیں.. وہی لباس وہی چہرے.. تقریباً وہی زبان.. خوراک بھی اپنی اور ویسی ہی لینڈ سکیپ.. تو کچھ فرق نہیں لگتا.. لیکن میرے ساتھ ایسا کیوں نہ ہوا..

صوبہ سرحد کے اندرون میں.. وانا یا وزیرستان میں جو لوگ ہیں ان کی زبان ثقافت اور پکوان مجھ سے الگ.. بلوچستان کے کسی مری یا بگٹی کا سامنا ہو جائے تو مجال ہے کچھ سمجھ آجائے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور انہوں نے کس سلسلے میں اتنی بڑی بڑی پگڑیاں باندھ رکھی ہیں اور موقع بے موقع مجھ پر رائفل تان لیتے ہیں.. اور ادھر دلّی میں آگرہ یا فتح پور

سیکری میں سب کچھ سمجھ میں آرہا ہے اور پھر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا.. یہاں تک کہ ہندوستانی مسلمانوں سے میل ملاقات ہوتی ہے تو وہ بھی پرائے لگتے ہیں.. جیسے ایک سکاٹ، لنڈن میں آکر سب کچھ سمجھتا ہے لیکن اجنبیت محسوس کرتا ہے.. ایک آئرش یا ایک ویلش اگرچہ وہی مذہب اور ثقافت رکھتا ہے پھر بھی اسے انگریز کہا جائے تو وہ طیش میں آجاتا ہے.. میں اگر پاکستانی شمال میں دنیا کے طویل ترین برفانی راستے پر چلتا جان جوکھوں میں ڈالتا سنولیک تک پہنچتا ہوں جہاں ماسوائے ابدی برفوں.. ویران وسعتوں اور موت کے قوی امکانات کے اور کچھ نہیں ہوتا اور اگر مجھے وہاں سے اپنے لاہور واپس جانا پڑ جائے تو اس کے لیے کم از کم سات آٹھ روز کا دشوار ترین سفر درکار ہوتا ہے.. اور اس کے باوجود سنولیک پر میرا ذہن اور بدن پرسکون رہتے ہیں کہ یہ میری سنولیک ہے.. اول تو وہاں پوچھنے والا کوئی نہیں ہوسکتا اگر ہو بھی اور پوچھے کہ تم کون ہو.. تو میں اسے ڈانٹ پلا کر کہہ سکتا تھا کہ تم کون ہو پوچھنے والے.. میں اپنے وطن میں ہوں..

اور اس کے برعکس اگر میں متھرا میں ہوں یا دلّی میں ہوں اور میں فیصلہ کرلیتا ہوں کہ مجھے لاہور جانا ہے تو میں دو گھنٹے کے اندر اندر دوپہر کے کھانے کے لیے اپنی ڈائننگ ٹیبل پر ہوسکتا ہوں.. سنولیک سے لاہور تک کے آٹھ روز کے دشوار سفر کے مقابلے میں صرف دو تین گھنٹے کا پرآسائش سفر..

بس فرق یہی ہے کہ سنولیک پر مجھے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ تم کون ہو اور دلّی اور متھرا میں میں ایک پردیسی ہوں.. کوئی بھی پوچھ سکتا ہے کہ تم کون ہو..

کوئی پوچھے کہ تم کون ہو تو ہم بتلائیں کیا..

جارج برنارڈ شا کی تحریر ایک معروف سٹیج ڈرامے ”مائی فیئر لیڈی“ کی بنیاد ہے جو بعد میں ریکس ہیری سن اور آڈری ہیپ برن کی صورتوں میں ایک فلم کی شکل میں سامنے آیا اور میوزیکل کی حیثیت سے کلاسیک بن چکا ہے تو اس میں ایک گیت ہے محبوب سے مخاطب ہوتے ہوئے ایک گیت ہے کہ مجھے تمہارے چہرے کی عادت ہوگئی ہے.. مجھے تمہاری مسکراہٹ کی عادت ہوگئی ہے.. کچھ ایسے ہی مجھے بھی اپنے پاکستان کی عادت ہوگئی ہے.. یہ

کیسے بنا.. کیونکر بنا.. نہ بنتا تو اچھا تھا اس سے مجھے کچھ خاص غرض نہیں ہے.. بس یہ ہے کہ مجھے اپنے پاکستانی ہونے کے سوا کچھ اور ہونا اچھا نہیں لگتا.. اتنی عادت ہو چکی ہے..

متھرا آ گیا..

ہم دلّی جانے والی شاہراہ پر آ گئے..

وہاں ہلکی بارش کے آثار چھوٹے چھوٹے تالابوں کی صورت میں شاہراہ پر کار کی ہیڈ لائٹس میں لشکتے تھے اور ان پر سے گزرتے ہوئے ٹائر چھینٹیں اڑاتے تھے..

دلّی دور نہ تھا..

"کسی کو کچھ بھی یہاں حسبِ آرزو نہ ملا.."

رات کے دس بج چکے تھے..

انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے مے خانے کے باہر گُل چیں کے جو دو پیڑ تھے ان کے زہر مہرا ہرے پتّوں کے بیچ پھولوں کی سفید پنکھڑیاں گویا سفید تتلیاں تھیں جو جھانکتی تھیں.. اور اِن پر نظریں جمائے رکھیں تو کبھی کبھار ایسا ہوتا تھا کہ ان میں ایک تتلی ڈنٹھل سے جدا ہوتی اور کمسن گھیریاں کھاتی گرتی اور نیم تاریک گھاس پر سج جاتی.. ہار سنگھار.. نرگس.. مالٹے کی کلیوں اور پٹونیا کے علاوہ مہک آور پھولوں میں گُل چیں میرا من پسند تھا..

یہ صرف پھول ہیں جن کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔

اندلس میں.. قرطبہ کی گلیوں میں ناڑلا سعد کے ہمراہ اس پھول میں وہی مہک تھی جو باغ جناح لاہور کی شاموں میں اور اب دلّی کی رات میں تھی..

یہ صرف آشنا مہک ہوتی ہے جو کُل دنیا کو آپ کا گھر کر دیتی ہے..

میں.. تھکا ہوا.. پژمردہ کہ ابھی ابھی میں ایک پرائے دیس میں کہیں راجھستان یا یُو پی میں تیز بارش میں گمشدہ تھا اور اب میں شکر گزار کہ میں عافیت کے ایک گوشے میں پہنچ گیا ہوں.. گھاس پر گرے گُل چیں کے ایک سفید پنکھڑیوں والے پھول کو میں نے آگے بڑھ کر اٹھایا اور ناک تک لے گیا اور یہ مہک مجھے اندلس لے گئی.. اپنے لاہور لے گئی..

مے خانے کے اندر جھانکا تو وہ آباد اور سرشار تھا..

اور حسبِ معمول کیپٹن شیر سنگھ وہاں آباد تھے اور کسی حد تک سرشار تھے۔ وہ مجھے

دیکھ کر نشست سے اٹھے اور مسکرا کر مجھے اپنے ہمراہ بیٹھنے کی دعوت دی: ''آئیے تارڑ صاحب.. کہاں سے آ رہے ہیں؟''

''مت پوچھیے..''

''لیکن ہم تو پوچھیں گے آپ ہمارے مہمان ہیں.. کچھ پیجیے..''

''جی نہیں شکریہ..''

انہوں نے میرے انکار پر کچھ دھیان نہ دیا..

''کہاں سے آ رہے ہیں؟''

میں نے انہیں اختصار سے اپنی تاج یاترا اور فتح پور سیکری کے بارے میں بتایا.. ان کے لیے یہ ایک معمول کی بات تھی.. جیسے ایک سیاح مجھے بتائے کہ میں آج شالیمار باغ دیکھ کر آیا ہوں.. نور جہاں کے مقبرے میں شب کی سیاہی کے منظر دیکھ کر آیا ہوں..

وہ.. کیپٹن شیر سنگھ جان سکتے تھے نہ دیکھ سکتے تھے کہ میرے کاندھے پر اب بھی ایک رنگین پروں والا پرندہ براجمان ہے جو میرے ساتھ ہی چلا آیا ہے..

جمنا کے پانیوں سے بلند ہو کر وہ چند ساعتوں کے لیے تاج کے سامنے پرواز کرتا ہوا سفید ہوا تھا اور پھر اس کے رنگ اسے واپس مل گئے تھے..

گُل چیں کی سفید تتلی کی مہک اپنی جگہ اور میرے کاندھے پر رنگین پرندے کا اپنا مقام.. لیکن ایسی جادوئی مہک اور ایسے خواب وخیال سے پاپی پیٹ کو کچھ غرض نہیں ہوتی اور وہ تو روٹی روٹی کی دوہائی دیتا چلا جاتا ہے.. آج سویرے آگرہ جانے کے چاؤ میں ایک بھاگ دوڑ کا داجبی سا ناشتہ کیا تھا.. تاج سے نکل کر اپنی پیاس بجھائی تھی اور کچھ دال بھات کھایا تھا جو بلند دروازے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہضم ہو گیا تھا اور تب سے اب تک اور کچھ نہ کھایا تھا.. وہ جو اندھیاری رات پردیس میں تھی اور جہاں آس پاس کے بارش میں جھولتے سرکنڈوں میں سے پیلی بھیت کے ڈاکو جھانکتے تھے' ان کے خوف کے سامنے بھوک نے عارضی پسپائی اختیار کر لی تھی اور وہ اب پھر سامنے آ کر دوہائی دے رہی تھی..

چنانچہ میں کچھ لمحے کیپٹن شیر سنگھ کی رفاقت میں گزار کے ان سے معذرت کر کے گُل چیں

کے پھول کو شاہ جہاں کی مانند شان سے سونگھتا اوپر ڈائننگ ہال میں چلا گیا تا کہ کسی بھگوان کی نہیں پیٹ کی پوجا کی جائے..

ڈائننگ ہال بھی ویران ہو رہا تھا..

نہایت کولونیل انداز میں وقت کی پابندی کی جا رہی تھی اور سروس کا اختتام ہو رہا تھا..

میں آخری بھوکا تھا جو اندر داخل ہوا.. جب کہ سب کے سب جو سیر ہو چکے تھے باہر جا چکے تھے..

ڈائننگ ہال کے منیجر جو کوئی چوپڑا یا مہرا صاحب تھے نشست پر بیٹھنے کے عمل کے دوران ہی میرے سر پر آ کھڑے ہوئے: ''سر.. اب تو سروس ختم ہو چکی ہے.. سوری!''

''ہاں.. مجھے تاخیر ہو گئی ہے.. میں دلّی سے باہر تھا..''

میں اٹھنے کو تھا کہ شاید انہیں ترس آ گیا یا انہیں میرا وہ کامپلی منٹ یاد آ گیا کہ اس ڈائننگ روم میں جو یورپی خوراک سرو کی جاتی ہے وہ یورپ کے معیار سے بھی بہتر ہے تو انہوں نے ایک مسکراہٹ مجھ پر نچھاور کی: ''سر.. آپ تشریف رکھیے.. میں خانساماں کو رکنے کو کہتا ہوں.. کیا میں آپ کے لیے تندوری مچھلی لے آؤں؟''

ایک بھوکے کو اور کیا چاہیے دو نہیں.. ایک تندوری مچھلی..

اس ڈائننگ ہال میں.. خالی میزوں اور کرسیوں میں تنہا بیٹھے.. اس کھڑکی کے قریب جہاں سے مجھے ایک خوش رنگ پرندہ نیچے جو کنول کا تالاب تھا اور اس کے کناروں پر جو گھنا درخت تھا' اس کی ایک ٹہنی پر جھولتا.. بار بار جھولتا دکھائی دیا تھا.. وہاں میں بیٹھا تھا..

یکدم دماغ کے بلیک بورڈ پر یادداشت کی جو عبارتیں لکھی تھیں تنہائی اور تھکاوٹ کی جھاڑن نے انہیں مٹا دیا..

میں کون ہوں..؟ یہاں کیا کر رہا ہوں..؟ کہاں سے آیا ہوں اور میں نے کہاں جانا ہے..؟

میں ایک گمشدہ شخص ہوں..

ایک ناتمام شخص ہوں..

کسی ایک زندگی میں شہرت اور کامیابی جتنی عزتِ نفس کو مجروح کیے بغیر حاصل ہو سکتی ہے وہ مجھے حاصل ہے.. اپنی اوقات اور لیاقت سے کہیں بڑھ کر حاصل ہے.. اور پھر بھی میں ایک ناتمام شخص ہوں..

کسی کو کچھ بھی یہاں حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور کسی کو تو نہ ملا..

مجھے تو حسب آرزو سب کچھ مل گیا تھا.. بلکہ آرزو کہاں کی تھی یونہی راہ چلتے چلتے مل گیا تھا..

لیکن اس آرزو میں ایک حرص تھی' جس سے میں آزاد نہ ہوتا تھا.. ایک ہوس تھی جس میں میں گرفتار تھا. حرص اور ہوس ان شاہ گوریوں کی جن کی سفید بدن نیلونیل تھے اور وہ مجھے اپنی ناتمامی کا احساس دلاتی تھیں..

کتنی گوریاں.. سوہنیاں.. ہیریں اور اونچی لمبی ٹاہلیوں کی پینگوں پر جھولتی گجریاں.. انڈیا انٹرنیشنل کے ڈائننگ روم میں آئیں اور مجھے ناتمام کر دیا..

تاج محل.. اکبر اعظم اور فتح پور سیکری کو صفر کر دیا اور مجھ پر حاوی ہو گئیں..

اکثر شب تنہائی میں.. کچھ دیر پہلے نیند سے..

تندوری مچھلی آئی تو اس میں اس تندور کے ذائقے تھے جو پھاتاں ماچھن کا تھا.. گاؤں کی مسجد کے زیر سایہ.. جس میں سے دیسی گندم کی موٹی روٹیاں نکلتی تھیں ایک خمار آور مہک کے ساتھ..

پر وہ خمار یہاں نہ تھا جس کا میں تمنائی تھا..

جو مجھے تمام کرتا تھا..

''جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو''

ہاں.. میں بے تحاشا.. قہقہے لگا رہا تھا..

ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا..

ایک مکمل طور پر فاتر العقل بوڑھے کی مانند جو میں کسی حد تک ہو چکا تھا' قہقہے لگاتا لگاتا نڈھال ہو رہا تھا..

منہ کھلا ہوا.. چہرہ سُرخ سُرخاب.. ماتھے کی رگیں پھٹنے کو اور بدن کی ہر شریان میں خون پاگل ہوتا ہوا.. میں قہقہے لگا رہا تھا..

پانچ سو برس سے زیادہ قدامت کے.. صبح کی دھند میں نمودار ہوتے' لودھی عہد کے مقبرے.. پتھریلے گنبدوں کی گولائیاں' وینس ڈی میلو کی چھاتیوں ایسی پُرتناسب کہ وہ بھی پتھر کی تھیں صرف سنگ مرمر سے تراشی ہوئی تھیں.. دھند میں یہ کبھی مکمل طور پر عریاں ہو جاتیں اور کبھی روپوشی اختیار کر لیتیں..

یہ دلّی میں میرا آخری دن تھا..

میں ہر سویر کی مانند آج بھی انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کی قیام گاہ سے اٹھ کر ادھر لودھی گارڈن میں چلا آیا تھا اور ''قہقہہ کلب'' کی ایک سویر کی رکنیت حاصل کر کے مقدور بھر قہقہے لگانے میں مشغول تھا..

جنوں کے شہر.. بومِ زرد کے شہر.. دلّی میں.. یہ میرا آخری دن تھا۔

بھلا زندگی بھر قہقہے کون لگا سکتا ہے..

لگا سکتا بھی ہو تو زندگی حسد میں مبتلا ہو کر تمہارے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دے گی کہ اتنی مسرت کی اجازت نہیں ہے..

بالآخر جب میں قہقہے لگا لگا تانڈھال ہو گیا اور مجھ میں کچھ سانس باقی نہ رہے.. سکت نہ رہی تو میں نے پسپائی اختیار کر لی اور "قہقہہ کلب" کے دائمی ممبران کا شکریہ ادا کر کے سنٹر واپس آ گیا..

ابھی صبح کے سات بجے تھے..فلائٹ شام کے چھ بجے تھی چنانچہ رخصتی میں کچھ وقت باقی تھا..

ڈائننگ ہال میں پچھلی شب میں آخری شخص تھا اور آج سویر بھی پہلا شخص تھا جو ناشتے کے لیے داخل ہوا..اور فوراً اپنی من پسند ٹیبل پر جا بیٹھا' جہاں سے ہریاول امڈ امڈ کر آتی تھی..اور تالاب کے کنول تمہارا چہرہ دیکھ کر کھل جاتے تھے..وہ ڈال بھی نظر میں آتی تھی جس پر ایک روز ایک رنگین پنچھی اپنے آپ کو جھولنے جھلاتا تھا.گرم چائے میں سے وہ مہک اٹھتی تھی جو مولانا ابوالکلام آزاد کے معیار پر بھی پوری اترتی..تلے ہوئے انڈے خوش نظر تھے کہ ان کی سفیدی میں جو زردی کے جزیرے تھے وہ جامد نہیں تھے زندہ تھے..آلوؤں کا بھرتا نیم سرخ تھا اور کھیرے اور ٹماٹر کی قاشیں تازگی کی خوشبو میں تھیں..اور چپٹی ناک والا گورا چٹا ویٹر دبے پاؤں چلتا آتا تھا اور احتیاط سے ایک خاص انداز سے ناشتے کے یہ اجزاء میرے سامنے رکھ کر اسی احتیاط سے الٹے قدموں لوٹ جاتا تھا..

یہ بھی زندگی کی خوبصورتیوں میں سے ایک ہے کہ انسان کو ایک سویر اس قسم کا ناشتہ نصیب ہو جائے..

مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ یہاں رہائش اور طعام کے بندوبست اتنے ستھرے اور شفاف ہوں گے..

مجھ میں ایک عجیب قسم کا دوگلہ پن ہے..

میں کوہ نوردی کے لیے گھر سے نکلتا ہوں تو ہر نوعیت کی پہاڑی صعوبت میرے

لیے باعث راحت ہوتی ہے..پتھروں کے سرہانے رکھ کر سو جاتا ہوں..کچھ دھیان نہیں کرتا کہ پاٹی کہاں کروں گا اور پانی بھی میسر ہو گا یا نہیں اور جو روکھی سوکھی مل جائے کھا کر مطمئن ہو جاتا ہوں اور نہ بھی ملے تو شکایت نہیں کرتا..لیکن..

جونہی گھر سے نکلنے کی کوئی سرکاری یا نیم سرکاری دعوت ملتی ہے تو میں ہراساں ہو جاتا ہوں..جانے قیام کہاں ہو گا..کیسے ہوٹل میں ہو گا..کہیں مجھے کسی اور ادیب یا دانشور کے ساتھ کمرہ شیئر نہ کرنا پڑ جائے..وسوسوں میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ جانے اس ہوٹل میں تکیہ کیسا ملے گا..کمبلوں میں سابقہ مکینوں کی بُو ہو گی..بستر کی چادر پر اگر کوئی بال نظر آ گیا تو پھر کیا کروں گا..کموڈ جانے کس ساخت کا ہو گا اور اس کا فلش پتہ نہیں کتنا شور مچائے گا..اور پھر ناشتے پر جو ٹوسٹ ہوں گے وہ کتنے سینکے ہوئے ہوں گے اور تلے ہوئے انڈے کتنے تلے ہوئے ہوں گے..

یہ دوگلا پن مجھ میں ہے..

میں نک چڑا نہیں ہوں لیکن..گورنر ہاؤس سے بھی دعوت نامہ آئے تو پوچھ لیتا ہوں کہ کون لوگ آ رہے ہیں اور مینو میں کیا ہے..میرا یہ رویّہ سنابری کے ضمن میں نہیں آتا..میں اسے بڑھتی ہوئی عمر کے کھاتے میں ڈال تو سکتا ہوں لیکن میں ہمیشہ سے ہی ایسا تھا..چنانچہ دلی سارک کانفرنس میں میری شمولیت صرف کشور ناہید کی ڈانٹ ڈپٹ کی برکت سے ہوئی..وہ بار بار ٹیلی فون کرتی تھی کہ تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے..ویزے کے لیے تصویریں کہاں ہیں اور میں اجتناب صرف اس لیے کرتا تھا کہ جانے یہ لوگ مجھے کہاں ٹھہرائیں گے اور کموڈ جانے کس ساخت کا ہو گا..

اور یہاں پہنچنے پر سب کچھ حسب آرزو ملا۔

بلکہ اس سے کہیں زیادہ..ایک ڈال پر ہلکورے لیتا پرندہ اور تالاب میں کھلے ہوئے کنول اور یہ ناشتہ ملا..

پاکستانی وفد کے بیشتر اراکین آج کی پرواز سے واپس نہیں جا رہے تھے..

انور سجاد..جاوید شاہین..ڈاکٹر انوار احمد اور اصغر ندیم سیّد تو غالب اکیڈمی میں شفٹ ہو رہے

تھے اور انتظار حسین علی گڑھ کے لیے پر تول رہے تھے.. انتظار صاحب کا پر تولنا بھی معنی رکھتا ہے کہ ان کے پر بھی اساطیری ہوتے ہیں اور کبھی پتھر کے اور کبھی موم کے ہوتے ہیں..

میں اس لیے آج واپس جا رہا تھا کہ میری ٹیلی ویژن کی ریکارڈنگز کے کچھ مسائل تھے اور یوں بھی جون ایلیا کے بقول..

نظر پہ بار ہو جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو

اس سے پیشتر کہ دلی اور انڈیا سنٹر اور لودھی گارڈن کے منظر نظر پہ بار ہو جاویں میں یہاں سے کوچ کر جانا چاہتا تھا.. اکثر نہیں رہنا چاہتا تھا..

صرف میں اور احمد فراز آج شب واپس جا رہے تھے..

فراز نے اس لیے جانا تھا کہ انہوں نے یہاں سے لاہور جانا تھا' وہاں سے اسلام آباد جانا تھا اور پھر وہاں سے کہیں اور جانا تھا اور کہیں اور سے کہیں اور.. مشاعرے پڑھنے جانا تھا.. پوئٹس آر ریچ کی باسٹرڈز..!

میں نے کہیں بھی نہیں جانا تھا صرف گھر جانا تھا..

"سائیں بابا کون ہے اور سب کچھ ہیر پھیر ہے"

ڈائننگ روم سے اٹھ کر میں نیچے تالاب کنارے آیا۔ ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر سویر کی ہلکی دھوپ کو کنول کے ایک کلیجی رنگ کے پھول پر اترتے دیکھا اور صبح کا پہلا سگریٹ پیا..

کمرے میں واپس آیا تو فون کی گھنٹی ایک مسلسل بے صبری سے بجتی چلی جا رہی تھی.. دوسری جانب وہی دلی کا فرشتہ یا جن ونود تھا۔ "سوری تارڑ صاحب.. میرے ڈرائیور کی نالائقی کی وجہ سے سنا ہے آپ کل راجھستان میں بھٹکتے رہے.. اور اس کے باوجود آپ نے اسے کچھ رقم سے نواز دیا.. آج کیا ارادے ہیں؟"

"ابھی پیکنگ کروں گا.. ایک انٹرویو کے لیے وعدہ کر رکھا ہے وہ نبھاؤں گا.. دوپہر کے کھانے کے بعد سو جاؤں گا اور شام کو چلا جاؤں گا.."

"میں آ رہا ہوں.."

"نہ ونود آپ کس سلسلے میں آ رہے ہیں.. آپ سے میرا جی بھر چکا ہے آپ وہیں رہیے جہاں ہیں.."

"آپ کو ایئر پورٹ پر ڈراپ بھی تو کرنا ہے.."

"اس کا مناسب بندوبست ہے.. یوں بھی آج آپ کا ورکنگ ڈے ہے اور.."

"میں آ رہا ہوں.."

اور وہ آ گیا..

ایک جن سے یہ بحث نہیں کی جاسکتی کہ وہ کیوں آ گیا ہے..

''دلّی میں آپ اور کیا دیکھنا چاہتے ہیں.. جو دیکھنے سے رہ گیا ہے وہ دیکھتے ہیں.''

میں نے سوچا جن حاضر ہو ہی گیا ہے تو اس کی حاضری کا فائدہ اٹھایا جائے..''یہ جو کہتے ہیں کہ دلّی کے جو کوچے ہیں اوراق مصور ہیں تو یہ اوراق کہاں ہیں؟''

''وہ محض کتابوں یادوں اور ناسٹلجیا میں ہیں.. یہاں نہیں ہیں.. دلّی کی آلودگی میکسیکو سٹی سے بھی بڑھ گئی ہے..ایسی آلودگی میں اوراق مصوّر کہاں دکھائی دے سکتے ہیں.. اگلے ماہ انڈر گراؤنڈ یعنی میٹرو کا افتتاح ہو رہا ہے.. پندرہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرے گی اور پھر اگلے دو تین برس میں پچاس کلومیٹر کا علاقہ اس کی زد میں ہوگا..امید کی جاتی ہے کہ میٹرو کے باعث آلودگی کم ہو جائے گی..دو چار لاکھ لوگ جب کاروں' موٹر سائیکلوں اور بسوں پر سفر کرنے کے بجائے میٹرو میں سوار ہوں گے تو آلودگی میں کمی آ جائے گی..''

''لیکچر کا شکریہ..''

''سوری.. دراصل ہم دلّی والے اس میٹرو پر بہت فخر کرتے ہیں کہ یہ کسی غیر ملکی کمپنی نے نہیں بنائی بلکہ ہمارے اپنے انجینئرز نے بنائی ہے..''

''تو آج آپ مجھے اوراق مصور نہیں دکھائیں گے..''

''آپ کار میں بیٹھیں جو کہیں گے دکھائیں گے..''

اس کھتری کی سادگی اور محبت کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیے۔''میں تغلق آباد اور قطب مینار دیکھنا چاہتا ہوں..''

''دکھا دیں گے..''

ہم جدھر بھی جا رہے تھے ٹریفک میں گھرے جا رہے تھے اور سڑک کے درمیان گھاس کی جو پٹی تھی اور آس پاس کے فٹ پاتھوں پر نہایت آسودہ اور کاہل گائیں یا تو چرتی تھیں یا چاروں پاؤں چت اونگھتی تھیں۔ہم مہرولی کی جانب چلے جاتے تھے اور راستے میں یہ گئوماتائیں بہت بہتات میں دکھائی دیں۔

''ونود.. یہ یقیناً مقدس گائیں ہیں جو یوں بے راہ رو ہیں اور انہیں کوئی ٹوکتا نہیں..نہیں؟''

''نہیں..کم از کم یہ والی گائیں نہیں..'' ونود نے کہا:''قدیم دلّی اور مہرولی کی بستی کے درمیان ایک زمانے میں مختلف گاؤں پڑتے تھے..اور ان میں زیادہ تر گوجر قبیلے کے افراد رہائش پذیر تھے..پھر دلّی پھیلا اور ان دیہات کو اپنا حصہ بناتا ہوا آگے چلا گیا..لیکن.. ان گوجروں کے پاس ان زمانوں کے قانونی کاغذات ہیں جن کے تحت وہ آس پاس کی چراگاہوں میں اپنے مویشی چرا سکتے ہیں..اور انہیں یہ قانونی حق اب بھی حاصل ہے..اور وہ یہ حق اب بھی استعمال کرتے ہیں اور صبح سویرے اپنے ڈھور ڈنگر کھول دیتے ہیں جو دن بھر سڑکوں پر آزاد گھومتے ہیں..گھاس میسر آ جائے تو چر لیتے ہیں ورنہ فٹ پاتھ پر پڑے اونگھتے ہیں..سرِشام ان کے گوجر مالکان انہیں گھیر کر واپس لے جاتے ہیں..تو کم از کم یہ گائیں جو مہرولی کے راستے میں ہیں یہ مقدس نہیں ہیں محض اپنا قدیمی قانونی حق استعمال کر رہی ہیں..''

''واقعی؟''

''ہاں..اور یہ اگر اتنی مقدس ہوتیں تو میں ان کا گوشت اتنی رغبت سے کیوں کھاتا..''

ہم ایک مرتبہ پھر دلّی کے سُنہری اُلّو کی آماجگاہ کے قریب سے گزرے..ظاہر ہے دن کی سفیدی تھی تو وہ اُلّو نیند میں تھا اور اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ تھا..ویسے اس اُلّو سے ملاقات کرنے کی خواہش تو میں رکھتا تھا لیکن وہ چونکہ اُلّو تھا اور مستزاد یہ کہ ایک سنہری اُلّو.. چنانچہ رات کے وقت ادھر سے گزرتے تو وہ آؤٹنگ پر گیا ہوتا اور دن میں وہ استراحت فرما رہا ہوتا..کہیں یہ ونود مجھے اُلّو تو نہیں بنا رہا..

پاکستان واپسی پر ایک روز انتظار حسین ''ڈان'' میں چھپنے والے میرے کالم کے حوالے سے پوچھنے لگے:''صاحب یہ سنہری اُلّو کا کیا قصہ ہے..ہم نے تو اس سے پیشتر اس کا تذکرہ نہ پڑھا نہ سنا..''

''انتظار صاحب بے شک آپ دلّی کو مجھ سے کہیں بڑھ کر جانتے ہیں اور اس شہر

کے بارے میں ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ آپ اس سنہری اُلو کے وجود سے آگاہ ہوں.. آپ بے شک صاحب نظر ہیں آپ کو وہ کچھ دکھائی دے جاتا ہے جو ہمیں دکھائی نہیں دیتا.. اور ہم چونکہ نظر ہی نہیں رکھتے اور ذاتی طور پر بھی تھوڑے سے اُلو ہیں اس لیے ایک سنہری اُلو کے وجود سے ہم ہی آگاہ ہوں گے آپ تو نہیں..''

''آپ نے ذاتی طور پر اسے دیکھا ہے؟''

''جی نہیں.. وہ کمبخت اپنے کھنڈر میں سوتا تھا یا دلّی کی راتوں میں کہیں مزے کرتا تھا.. اگرچہ مجھے بھی کچھ شک ہے لیکن میں ونود کے بیان پر شک نہیں کر سکتا.. اگر وہاں ایک سنہری اُلو نہ تھا تو وہ کبھی نہ کہتا کہ وہاں ہے.. ویسے بھی عام طور پر جن جھوٹ نہیں بولتے..''

خود انتظار صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ جو روائتیں ہوتی ہیں ایک دیومالا ہوتی ہیں کیا ضروری ہے کہ اس کی نون میخ نکالی جائے کہ یہ حقیقت ہے یا نہیں.. اگر وہ ایک خوبصورت تصور اور خیال ہے تو اسے مان لینا چاہیے..

یعنی اگر تاج محل کے سامنے سے ایک رنگین پرندہ نہ بھی اڑے تو اسے اڑنا چاہیے.. اور اگر اس کھنڈر میں ایک سنہری اُلو نہ بھی ہو تو اس کے وجود سے انکار نہ کیا جائے..

دلّی میں اس مختصر.. چندروزہ قیام کے دوران.. میری نظروں میں ایک ہندو سادھو کی تصویر مسلسل آئی.. رکشوں میں.. ٹیکسیوں کے ماتھے پر.. دکانوں میں اور کبھی دیواروں پر چسپاں.. ناف تک آتی سفید داڑھی.. ایک سفید چادر اوڑھے.. گیان میں گم دھیان میں کھوئے ہوئے کوئی بزرگ.. ان گنت دیوی اور دیوتاؤں کی بھیڑ میں وہ الگ دکھائی دیتے تھے.. ظاہر ہے مجھے چنتا ہوئی کہ یہ کون ہیں.. اور میں نے کسی سے بھی پوچھا تو ایک مختصر جواب ملا: ''سائیں بابا..''

اور جس تقدس اور احترام سے یہ نام لیا جاتا تھا اس کے بعد یہ گنجائش معدوم ہو جاتی تھی کہ آپ پوچھیں کہ کون سائیں بابا..

ونود سے البتہ کچھ بھی پوچھا جا سکتا تھا.. تو میں نے پوچھا.. کہ کون سائیں بابا..

''سائیں بابا.. ایک نہایت متشرع مسلمان بزرگ تھے.. پانچ وقت کے نمازی' تہجد گزار اور روزوں کے پابند.. وہ ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے تھے' جس کسی نے بھی انہیں دیکھا اکثر سجدے میں دیکھا.. اور انہوں نے پوری عمر صرف ایک چادر کی لپیٹ میں گزار دی.. وہ ایسے بابا تھے جو کسی ایک مذہب کی قید میں نہ تھے' جو کوئی بھی ان کے پاس آتا اسے دعائیں دیتے.. گلے سے لگاتے.. اور کہا جاتا ہے کہ لوگوں کی مرادیں پوری ہو جاتیں.. خاص طور پر ہندو اور سکھ ان کے بے لوث پجاری اور عقیدت مند تھے.. پھر سائیں بابا کو احساس ہوا کہ ہجوم بڑھ رہا ہے اور ان کی عبادت میں خلل آ رہا ہے.. وہ ہجوم سے گھبرا کر دلّی چھوڑ کر دور دراز مہاراشٹر کے شہر شردی چلے گئے اور وہیں قیام کر لیا.. 1914ء میں وہ مالک سے جا ملے اور وہیں شردی میں دفن ہوئے.. ان کے پجاریوں نے ان کی قبر کے اوپر ایک عظیم الشان مندر تعمیر کیا۔ ان کی شکل کا ایک مجسمہ بنا کر مندر میں رکھا.. ان کے ماننے والے یہ صدق دل سے مانتے ہیں کہ سائیں بابا موت کے بعد بھی مرادیں پوری کرنے پر قادر ہیں.. ہندوستان بھر سے لوگ سائیں بابا کے مندر کو جاتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں اور ہر برس ان کا عرس اکتوبر کے مہینے میں نہایت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے..'' ویسے جوانی کے ایام میں سائیں بابا غزل کے شائق تھے اور بلھے شاہ کی مانند پیروں میں گھنگھرو باندھ کر رقص بھی کرتے تھے.. اُن کے پاس ایک گراموفون بھی تھا جس پر وہ ٹیون اسادری دلدار حسین سنا کرتے تھے.. نیم کے پیڑ تلے اُن کا ڈیرا تھا.. شہر دلّی میں کسی مسجد کو دیکھتے تو کہتے ''مسیت آئی۔ مسجد ماں آئی..'' کچھ عرصہ ناگپور میں ایک سنت کے ہاں قیام کیا۔ ان کا کرتہ پھٹا ہوا ہوتا.. اسے ''کفنی'' بولتے تھے.. شنید ہے کہ 1857ء کی جنگ میں ایک باورچی کی حیثیت میں کام کیا.. اس حوالے سے مٹن پلاؤ ایک دیگ میں خود بناتے تھے اور لوگوں کو کھلاتے تھے.. اکثر جذب کی حالت میں کہتے ''ماں مجھے بھوک لگی ہے'' ہاتھ میں ایک چھڑی رکھتے.. قد تقریباً چھ فٹ تھا.. اردو' انگریزی' ہندی اور مراٹھی نہایت روانی سے بولتے تھے.. دلّی میں آج بھی ایک رام مندر ہے جس کے برابر میں سائیں بابا کا ایک مندر بھی ہے اور وہاں زیادہ لوگ جاتے ہیں.. مہاراشٹر میں اُن کے عقیدت مند اپنے نام کے ساتھ سائیں لگاتے ہیں

اور نیا گھر تعمیر کرتے ہیں تو اُس کے ماتھے پر ''سائیں کی کرپا'' لکھواتے ہیں.. میری بیوی نکی بھی اُن کی پجاری ہے اور کہتی ہے کہ سائیں بابا سے جو مانگو مل جاتا ہے.. تو یہ ہیں سائیں بابا!''

''یار ونود تم ہندو لوگ بھی کیسے عجیب ہو.. تمہارے راستے میں جو کوئی بھی آتا ہے.. پتھر آتا ہے.. سانپ آتا ہے.. بندر آتا ہے یا مہاتما بدھ آتا ہے یا سائیں بابا آتا ہے.. تم اسے اپنے سینکڑوں دیوتاؤں کی پلٹن میں شامل کر کے پوجنے لگتے ہو.''

''نہیں تارڑ صاحب.. ہر کوئی جو راستے میں آتا ہے اسے دیوتا نہیں بنا لیتے.. اگر ایک شخص محبت تقسیم کرتا ہے' ذات صفات اور مذہب سے بالاتر ہے تو اسے مان لینے میں کیا حرج ہے.. بے شک وہ عیسائی مدر تھریسا ہو یا مسلمان سائیں بابا.. محبت بھرے لوگوں کو مان لینے میں کچھ حرج ہے..''

''نہیں.. میرا بھی یہی خیال ہے کہ کچھ حرج نہیں..''

''ہم نے تو آپ کے قومی شاعر کو بھی اپنا لیا ہے.. سرکاری طور پر تو ہمارا قومی ترانہ ایسا گنجلک ہے کہ عام لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتے لیکن روزمرہ کی زندگی میں ہم سب کا قومی ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا..'' ہے.. آپ کو پتہ ہے جب پہلا ہندوستانی خلاباز روس کے خلائی جہاز میں سوار ہندوستان کے اوپر سے گزر رہا تھا تو اندرا گاندھی نے فون پر اس سے پوچھا تھا کہ تم اوپر آسمانوں سے نیچے ہندوستان کو دیکھ رہے ہو تو یہ کیسا لگ رہا ہے تو اس نے جواب دیا تھا کہ.. سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا..''

''ونود یہ عجیب جھگڑے جھیڑے ہیں.. کہ کون کیا ہے اور کس کا ہے.. تم جانتے ہو کہ ریڈیو پاکستان سے جو سب سے پہلا ملّی نغمہ نشر ہوا وہ کس کا لکھا ہوا تھا..؟ جگن ناتھ آزاد کا.. عظیم تلوک چند محروم کے بیٹے کا.. کہتے ہیں یہ آرام گہہ نور جہاں ہے والے محروم کے بیٹے کا..''

''واقعی..'' ونود کو بھی دھچکا سا لگا..

''اور ایک اور تاریخی حقیقت.. ہندوستان کی آزادی پر آل انڈیا ریڈیو سے نشر کیا

جانے والا پہلا ملّی نغمہ ہمارے قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری نے لکھا تھا.. اور ادھر مسلمان بنگلہ دیش کا قومی ترانہ رابندر ناتھ ٹیگور کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے.. تو کیا یہ سب کچھ ہیر پھیر نہیں لگتا..''

''پتہ نہیں..'' ونود مسکرانے لگا.. ''مجھے ان تاریخی حقیقتوں کا علم نہیں تھا.. ہیر پھیر ہے..؟''

زمین پر اب تک مضبوطی سے جمی ہوئی تغلق آباد کی بلند فصیل کے سائے میں سفر کرتے ہیں.. محمد تغلق کے آباد کردہ شہر تغلق آباد کے اب بے آباد شہر کی فصیلوں تلے سے گزرتے ہیں..

شاہراہ سے اونچا ہوتا ہوا ایک قدیم دروازہ تھا' جہاں سے ہم اس کھنڈر بستی کے اندر جا سکتے تھے لیکن ہمارے پاس وقت نہ تھا' تغلق آباد پر صرف ایک نظر ڈالنے کا وقت نہ تھا.. جس شہر کو ہند کے ایک سلطان نے ایک زندگی صرف کر کے تعمیر کروایا تھا' ہم جیسے بے وقعت لوگوں کی زندگی میں چند لمحے بھی نہ تھے اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے..

''اس حصار کے اندر.. اس کے کھنڈروں میں مہرولی کے گوجروں نے بستیاں بسا لی تھیں.. اپنے ڈھور ڈنگر سمیت وہاں آباد ہو گئے تھے..''

''ہمارے ہاں بھی شیر شاہ سوری کے تعمیر کردہ قلعہ روہتاس کے اندر گاؤں آباد ہو گئے ہیں..''

''کیا آپ نے اپنی تاریخ کو محفوظ کرنے کی خاطر اس قلعے کو بستیوں سے آزاد کروا لیا ہے؟''

''نہیں.. ابھی تو نہیں..''

''کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ ہم ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکے کہ ہماری تاریخ ہے کیا.. کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے.. مہر گڑھ اور موہنجوداڑو سے شروع ہوتی ہے یا قیام

پاکستان سے شروع ہوتی ہے.. کیا چندر گپت موریہ اور اشوک بھی اس تاریخ میں شامل ہیں یا نہیں.. میں ایک لاہوری ہونے کے ناتے سے تو بابر اور شیر شاہ سُوری کو پسند نہیں کر سکتا کہ ان ہر دو حضرات نے لاہور کے بارے میں یہی بیانات دیئے تھے کہ کاش میں لاہور کو ملیامیٹ کر سکتا یا اگر میرا بس چلتا تو میں لاہور کو نذرِ آتش کر دیتا. صرف اس لیے کہ شمال سے جو کوئی بھی آتا ہے وہ لاہور میں آ کر تازہ دم ہوتا ہے. محلہ تیر اندازاں اور محلہ کمان گراں سے تیر اور کمان حاصل کرتا ہے اور نئی سپاہ بھرتی کر کے دلّی پر حملہ آور ہو جاتا ہے.. تو مجھے اصولی طور پر تو ان حضرات کو اپنا ہیرو ماننے سے گریز کرنا چاہیے' لیکن ہم کیا کریں کہ مسلمانی کے ہاتھوں مجبور ہیں.. یہاں تک کہ پنجاب پر ایک قہر کی طرح نازل ہونے والے افغان ابدالی کو بھی جو لاہور کو ڈھا دیتا ہے اور اس کی سپاہ خواتین کا بھی کچھ لحاظ نہیں کرتیں.. مجھے اس کو بھی اپنا ہیرو ماننا پڑتا ہے کہ وہ مسلمان تھا.. ونود..''

''جی تارڑ صاحب..''

''مجھے اس طول کلامی پر بھی معاف رکھیے گا..''

''جی تارڑ صاحب.. میں صرف اتنا کہنا چاہتا تھا کہ تغلق آباد کے کھنڈروں میں جو گوجر بستیاں اُس تاریخ کو مجروح کرتی تھیں جو اگرچہ مسلم تھی لیکن ہماری تھی' انہیں وہاں سے ہٹانے کے لیے ایک طویل قانونی جدوجہد کی گئی جس میں.. میں بھی شامل تھا.. اور اب تغلق آباد کے کھنڈر اطمینان کے ساتھ سانس لیتے ہیں کہ وہ بستیاں وہاں سے ہٹا دی گئی ہیں..''

''یہ آپ کی تاریخ ہے.. مسلمان ہونے کے باوجود..؟''

''جی.. دلّی میں ہے تو ہماری تاریخ ہے..''

''تو پھر ہماری تاریخ کہاں گئی؟''

''سرخ پتھر سے تراشا ہوا ایک مخروطی جام.. قطب مینار''

ہم مہرولی کی جانب چلے جاتے تھے..

بھاری ٹریفک اور دلّی شہر کی بدنظمی اور شور میں.. اور اونگھتی یا چرتی گائیوں میں..

اور پھر وہ دور سے نظر آ گیا..

شہر دلّی معدوم ہو گیا اور بابل کا شہر نظر آنے لگا جہاں ایک بلند مینار اُس تخلیق کار کی قربت میں پہنچنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا جو ایک گورکھ دھندا تھا..

ایک مخروطی جام نظر آیا جو سرخ پتھر سے تراشا ہوا.. بابل کا ایک مینار تھا..

جس کی بالکونیوں میں باغ معلق ہو سکتے تھے.. اور اس جام کے گرد آیاتِ قرآنی گردش کرتی تھیں..

میں نے اس حیات میں.. جو اتنی مختصر بھی نہیں ہے بہت سے میناروں.. تاریخی اور مذہبی میناروں کو دیکھا ہے.. ان کی دید کا بیان بہت طول پکڑ جائے گا' اس لیے اسے مختصر کیا جائے تو ان میں مسجد وزیر خان کے بے مثل مینار ہیں.. میں ان میں تاج محل کے میناروں کو شامل نہیں کروں گا کہ وہ اس سفید معجزے کا ایک حصہ ہیں' ان کی الگ سے کوئی شناخت نہیں ہے.. مسجد قرطبہ کا وہ مینار ہے جو بقول اقبال.. جلوہ گاہِ جبریل ہے.. اشبیلیہ کا جیرالڈا ہے.. مسجد اُمیہ دمشق کا وہ مینار ہے جہاں ایک روایت کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کا دوبارہ ورود ہوگا.. نیلی مسجد استنبول کے زمین میں گڑے تیروں کی مانند باریک اور خوش نظر مینار ہیں.. ہرات کے سربریدہ زرافوں کی مانند اپنی نیلی تعمیر کے امیر تیمور کے تخلیق کردہ مدرسے کے

مینار ہیں... ان میں میرے گاؤں کی مسجد کے وہ مینار بھی شامل کر لیجیے جو فنِ تعمیر کے ہر معیار پر پورے اترتے ہیں.. اگرچہ ان کے معمار چٹے ان پڑھ تھے.. ان میناروں کو شیشے کی کرچیوں سے تزئین کیا گیا تھا.. یہ فہرست بہت طویل ہے لیکن اسے کتنا ہی طویل کر لیجیے اس میں لاہور کا مینارِ پاکستان ہرگز شامل نہیں ہو سکتا.. جب دیکھیں نظر پر بار گذرتا ہے۔

تو ان سب میناروں میں کوئی بھی ایسا مینار نہیں جو قطب مینار کے سامنے پل بھر کے لیے کھڑا ہو سکے.. کھڑا ہونے کی کوشش کرے تو اگلے لمحے مسمار ہو جائے گا..

قطب مینار کی کوئی بھی تصویر یا توصیف اس کی شاہانہ آسمانی سرخ رنگت کی نقش در نقش سربلندی سے انصاف نہیں کر پاتی..

یہ اپنی سربہ فلک عظمت اور پروقار تعمیراتی حسن میں کسی طور تاج محل سے کم نہیں.. صرف اس کے انداز جداگانہ ہیں..

تاج محل ایک وسیع کمپلیکس ہے.. اس کے آس پاس کی عمارتیں، فصیلیں، مدرسے اور مسجدیں.. اس کی روشیں، تالاب.. پہلی جھلک ایک بلند محرابی دروازے میں سے اور پھر ایک طویل فاصلہ اس تک پہنچنے کے لیے جس کے دوران میں وہ مسلسل آپ پر اثر انداز ہوتا چلا جاتا ہے..

تاج محل ایک کائنات ہے جب کہ قطب مینار تنہا ہے..

صرف ایک تعمیر ہے..

اس کے آس پاس نہ کوئی جمنا ہے اور نہ ایسے مناسب فاصلے ہیں جہاں کھڑے ہو کر اس کی مکمل سرو قامتی کو نظروں میں اتارا جائے..

آپ اندر داخل ہوتے ہیں تو اس کے قدموں میں ہوتے ہیں.. سر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو کہاں تک دیکھ سکتے ہیں..

اگر یہ اہرام کی طرح کسی صحرا میں تنہا کھڑا ہوتا اور دور سے دکھائی دیتا تو اہلِ بابل اپنے مینار فراموش کر دیتے..

اس کی ساخت مخروطی ہے یا.. مجھے اس سے بہتر اظہار تلاش کرنا چاہیے تھا کہ یہ

گاؤدم شکل کا ہے.. اس کا وسیع گھیر بلندی کے ساتھ گھٹتا چلا جاتا ہے..

تیسری منزل تک اس کا گھیر سرخ پتھر میں کندہ نایاب خطاطی سے آرائش کیا گیا ہے اور اس خطاطی کے حروف تقریباً قد آدم ہیں اور انہیں آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے..

دوسری منزل کے قریب ایک تعمیراتی مچان پر چند ہنرمند موجود تھے جو شکستہ حروف کو نہایت مہارت سے بحال کرنے میں مصروف تھے..

میرا تو اب بھی یہی قیاس ہے کہ قطب مینار کے گرد تیسری منزل تک جو خطاطی لپٹی ہوئی ہے، وہ یقیناً تعمیرِ نو کے ضمن میں آتی ہے کہ وہ بہت تازہ اور نئی تراش خراش کی دکھائی دیتی ہے، جیسے اسے حال ہی میں کندہ کیا گیا ہے لیکن ونود کا کہنا تھا کہ یہ اوریجنل شکل میں ہے صرف اس کی تزئین اور صفائی نئے سرے سے کی گئی ہے..

میں پہلی بار آیا تھا تو اس کی دوسری منزل تک گیا تھا.. لیکن اب اوپر جانے کی ممانعت تھی.. چند برس پیشتر سکول کے بچوں کا ایک گروپ اوپر گیا تھا اور ایک گیلری کے ڈھے جانے سے بہت سے بچے جاں بحق ہو گئے تھے.. اس لیے اوپر جانے پر پابندی لگا دی گئی تھی..

دنیا بھر میں جو لازوال تعمیرات ہیں جن کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے.. وہ دیوار چین ہو.. اہرام مصر ہوں.. قصر الحمرا ہو یا تاج محل.. ان سب کو جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں آپ مختلف زاویوں سے.. طویل فاصلوں اور مختلف حالتوں میں دیکھ سکتے ہیں.. جدا موسموں میں انہیں پرکھ سکتے ہیں.. ان کی عظمت اپنی جگہ لیکن یہ اپنے چار چفیرے کے سینکڑوں فریموں میں سجتے ہیں تو عظیم تر دکھائی دیتے ہیں.. یہ صرف قطب مینار ہے جس نے ایک کنال سے بھی کم زمین گھیری ہے اور اس زمین کو آسمان تک پہنچا دیا ہے.. دنیا میں اور کوئی ایسی تعمیر نہیں ہے جس کی اٹھان اتنی مختصر جگہ سے اٹھی ہو اور اس جگہ کو ایک حیرت کدہ بنا دیا ہو.. نہ کوئی فاصلے اور نہ کوئی آرائش آس پاس.. بس تنہا اور یکتا!

مجھے قطب الدین ایبک سے ایک ہی شکایت ہے کہ اس نے یہ مینار دلی میں ہی کیوں تعمیر کیا، اپنے پسندیدہ شہر لاہور میں کیوں تعمیر نہیں کیا جس کی خاک نے اس کے تنِ خاکی کو قبول کیا..

ایک موہوم سی.. مٹتی ہوئی تقریباً دھندلا چکی یاد ہے.. کب کی؟ شاید پچپن برس پیشتر کی.. میں اپنے دراز قامت نیلی آنکھوں والے اباجی کی انگلی تھامے انارکلی بازار کی جانب جا رہا ہوں اور وہ مجھے بائیں ہاتھ پر واقع ایک تنگ مکانوں میں گھری گلی میں لے جاتے ہیں.. یہ ایک بند گلی ہے.. دائیں جانب گلی کی سطح سے بلند بوسیدہ مکانوں کے نیچے ایک معمولی سا مزار ہے اور اس پر ایک بوسیدہ پھٹی ہوئی چادر پڑی ہے اور اس چادر پر چھت سے رس رس کر گندا پانی گرتا ہے.. مزار کی چھت پر جس کوٹھڑی کا فرش ہے شاید اسے دھویا جا رہا ہے.. کچھ اگربتیاں ہیں جو جانے کن برسوں میں دھواں دیتی تھیں.. سوکھی ہوئی کچھ پتیاں ہیں جو ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں اور اباجی مجھے بتاتے ہیں: ''مستنصر یہ قطب الدین ایبک کا مزار ہے..''

''وہ کون تھا اباجی..''

''خاندان غلاماں میں سے تھا.. ایک غلام تھا.. پھر ہندوستان کا سلطان ہوا.. تب لاہور کی فصیل کے باہر یہاں ایک وسیع میدان ہوا کرتا تھا.. ایبک یہاں چوگان کھیلتا تھا.. ایک روز گھوڑے سے گرا اور مر گیا.. یہ قبر عین اسی مقام پر ہے جہاں وہ گھوڑے سے گرا تھا..''

''لیکن اباجی اس کی قبر تو بہت گندی مندی ہے.. اس پر گندا پانی گرتا ہے.. بُو آتی ہے.. تو یہ سلطان کیسے ہو سکتا ہے.. اس کی قبر اتنی شاندار کیوں نہیں جتنی جہانگیر کی ہے..''

''اس لیے کہ وہ ایک غلام تھا..''

''غلاموں کی قبریں ایسی ہوتی ہیں؟''

''ہاں بیٹے.. کیونکہ وہ ایک انسان کے لیے سب سے بڑی ذلت غلامی کو جانتے ہیں.. جیسے حضرت بلالؓ جانتے تھے.. وہ چاہے سلطان اور شہنشاہ ہی کیوں نہ ہو جائیں اور ہندوستان کے ہو جائیں تو بھی اپنی اوقات نہیں بھولتے.. عوام کو حقیر نہیں جانتے اور ان کی دولت بے دریغ اپنے باغات اور مقابر کی تعمیر پر ضائع نہیں کرتے.. وہ ایسا کر نہیں سکتے.. اس لیے ان کی قبریں گمنام رہتی ہیں.. ان پر گندا پانی ٹپکتا ہے..''

میں نے جو مکالمے درج کیے ہیں یہ حرف بہ حرف اسی صورت میں ادا نہیں کیے گئے تھے.. موہوم سی یاد ہے کہ ایسا ہوا تھا.. ان کا متن یہی تھا..

پھر ایسا ہوا کہ کسی کو احساس ہوا.. کوئی ایسا شخص جو صاحب اقتدار تھا اور تاریخی شعور رکھتا تھا.. یا شاید لاہور کے کچھ ایسے لوگ جو اپنے ماضی کو سنبھالنا چاہتے تھے.. انہیں احساس ہوا کہ یہ بھی تو ایک شہنشاہ تھا.. جہانگیر، اکبر، ہمایوں اور شاہجہان کی مانند ہندوستان کا.. تو اس نے اگر اپنی حیات میں ہی اپنے لیے ایک شاندار مقبرہ اپنے نقشے کے مطابق نہیں بنوایا.. کوئی تاج محل تعمیر نہیں کروایا تو اس کا بھی کچھ احترام کیا جائے.. چنانچہ مزار کے اردگرد اور اس کے اوپر تعمیر کردہ مکانوں اور عمارتوں کو حاصل کر کے انہیں مسمار کیا گیا.. سلطنت عہد کے فن تعمیر کے مطابق ایک کا مقبرہ تعمیر کیا گیا اور چوگان کے شوقین کو سانس لینے کے لیے کچھ کھلا آسمان ملا..

مقبرے کی تزئین کے لیے قطب مینار پر کندہ خطاطی کے نمونوں کی پیروی کی گئی.. یہ خطاطی ایک نادر معجزہ قلم درویش صفت شخص حافظ یوسف سدیدی کے ہاتھوں کی ہے.. جو اگر قطب مینار کے گرد لپٹی ہوئی خطاطی سے اگر برتر نہیں تو کمتر بھی نہیں..

1975ء میں میرا بہت عزیز خالہ زاد بھائی.. ماں باپ کی اکلوتی اولاد.. اپنے خاندان میں واحد مکانوں اور زمینوں کا وارث کیپٹن ساجد نذیر جب اپنے طیارے میں آگ لگنے سے جل کر شہید ہو گیا تو میں نے حافظ صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس کی قبر کا کتبہ لکھ دیں.. انہوں نے لکھ دیا.. میں نے جھجکتے ہوئے ان کی محنت کا ایک حقیر سا نذرانہ پیش کرنے کی کچھ ڈھکی چھپی خواہش کی تو وہ سر ہلا کر بولے: ''تارڑ صاحب میں ایک شہید کا کتبہ لکھنے کی قیمت وصول کروں؟.. آپ نے تو مجھے ایک اعزاز بخشا ہے..''

مجھ ایسا خطاطی کے رموز سے یکسر ناواقف شخص بھی جب اخبار میں کسی کتاب میں کوئی ایک حرف.. ایک ''ن'' یا ایک ''م'' لکھا دیکھتا تھا تو جان جاتا تھا کہ یہ یوسف سدیدی کا قلم ہے..

ایبک کے مزار کے گرد جو ستون ہیں ان پر کندہ خطاطی کو بھی ایک نظر دیکھنے سے علم ہو جاتا ہے کہ یہ کس کا اعجازِ قلم ہے..

''مسجد میں مندر یا مندر مسجد میں..

ایک ستون تصویر ہوتا ہے''

قطب مینار کے سائے میں..ایک مختصر احاطے میں مسجد قوت الاسلام کے کچھ آثار ہیں..ایک نیم شکستہ گنبد ہے اور چند راہداریاں ہیں..خوشنما پتھریلے جھروکے اور ستون ہیں اور یہ سراسر ہندو اور جین مت سے مستعار شدہ ہیں..

احاطے میں داخلے پر حکومت ہند کی جانب سے سیاحوں کے لیے جو تاریخی جانکاری درج ہے اس میں بھی اسی حقیقت کی جانب توجہ مبذول کروائی گئی ہے..اور اگر یہ معلومات نہ بھی مہیا کی جاتیں تو بھی ہر پتھر ہر گل بوٹا اور ہر سجاوٹ اپنے کافر حسن سے صاف پہچانا جاتا..کہ قدیم ہندوستان کی یہ کاریگری دل کو خوش کر دیتی ہے..ہندو مندروں اور جین مت کی عبادت گاہوں کے کچھ حصے جُوں کے تُوں اس مسجد کی آرائش کے لیے یہاں منتقل کر دیئے گئے..مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو براہمن کو..سو ہم نے گاڑ دیا..دوسروں کی عبادت گاہوں کو اجاڑ کر اپنی عبادت گاہ کو سجانے کا گناہ یا ثواب اپنی جگہ لیکن داد اُن کے حسن نظر کو بھی دی جائے کہ مندر کی سجاوٹ اگر من موہنی ہے تو اسے ہم اپنی مسجد میں کیوں نہ سجا لیں..اور یہ بھی تو دیکھئے کہ وہ بت شکن نہ ہوئے ستونوں اور جھروکوں پر دیوتاؤں کے جو بُت ہیں وہ جوں کے توں رہنے دیئے کہ اگر ان دیوتاؤں کی موجودگی سے مسجد حسین ہوتی ہے تو کیا مضائقہ ہے..

یہ مجسّمے دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ بیجنگ کی چھ سو برس قدیم مسجد نیو جیا کی چینی ڈھلوان چھتوں کے کونوں پر عفریتوں' اژدھوں اور شیروں وغیرہ کے مجسّمے آویزاں ہیں اور جب میں نے اپنے ترجمان سے ان کی موجودگی کا سبب پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ یہ تو بلاؤں کو دور کرنے کے لیے نصب کیے گئے ہیں..

''لیکن یہ تو مسجد ہے..''

''مسجد سے بلاؤں کو دور کرنے کے لیے ہی تو یہ نصب کیے گئے ہیں..ویسے بھی یہ مسجد ہمارا مذہب ہے اور یہ مجسّمے ہماری ثقافت ہیں..''

چنانچہ اس میں بھی کچھ قباحت نہیں کہ ایک مسجد کی تعمیر میں ہندو اور جین مندروں کے حسن تعمیر کو شامل کر لیا جائے کہ ایسا ہوتا آیا ہے..مُدّہ قدیم سے ہوتا آیا ہے..قدیم معبد ڈھیتے رہتے ہیں اور اسی مقام پر نئے خداؤں کے مسکن تعمیر ہوتے رہے ہیں اور کبھی ان معبدوں کے ستون اور محرابیں اور آرائش کسی اور مقام پر منتقل کر کے نئی عبادت گاہوں کو تعمیر کیا جاتا رہا ہے..

مسجد قرطبہ کے جتنے بھی ستون ہیں وہ سب کے سب شمالی افریقہ کے قدیم رومی کھنڈروں اور معبدوں سے لائے گئے تھے' اسی لیے وہ یکساں قد کے نہیں اور انہیں تناسب دینے کی خاطر ان پر محرابیں تعمیر کی گئی تھیں..

- اندلس میں درجنوں کلیسا ایسے ہیں جن کے مینار ان مسجدوں کے ہیں جو مورش عہد میں تعمیر کی گئی تھیں..

اشبیلیہ کے عظیم کلیسا کا جیرالڈا اور جامع مسجد کا ایک مینار ہوا کرتا تھا..

یہاں تک کہ خانہ کعبہ کا وہ حصہ جو ترکوں نے تعمیر کیا تھا اس کے چند ستون بھی اپنے رومی ہونے کی گواہی دیتے ہیں..

بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر بھی کچھ اشارے فراہم کرتی ہے..

چنانچہ..ایسا ہوتا آیا ہے..

ہر عہد میں طاقت ور خدا کمزور پڑتے دیوتاؤں پر حاوی ہوتے رہے ہیں..اور کبھی دیوتاؤں کے زمانے آ جاتے ہیں..تو ایسا ہوتا رہتا ہے..

یکدم مسجد قوت الاسلام میں جو مندر سجے ہیں ان کے درجنوں ستونوں میں سے ایک ستون الگ ہوا ایسے کہ باقی عمارت دھندلکے میں چلی گئی اور صرف وہ قطب مینار کی مانند تنہا نظر آنے لگا.. میری نظروں میں تصویر ہو گیا..

میں نے اسے کبھی.. کہیں دیکھا تھا..

اس کی بناوٹ اور پتھریلی سجاوٹ آشنا لگتی تھی..

کہاں دیکھا تھا..

پھر اس ستون سے ٹیک لگائے ہوئے ایک عورت کی شکل اور بدن جیسے کسی سحر کے زور سے دکھائی دینے لگے.. تصویر مکمل ہو گئی..

ہاں میں نے اسے کبھی.. کسی تصویر میں دیکھا تھا..

اسی پوجے گئے قدیم ستون سے ٹیک لگائے نیلی جین اور نیلے سویٹر میں خوشنما ہوتی ایک عورت.. اس کے نیم والب جیسے وصل کے پیاسے ہوں.. اپنی بائیں ٹانگ کو سکیڑے کھڑی ہے.. یہ تصویر دیکھ کر فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ پُرکشش ہے.. ہزاروں برس پیشتر پتھر سے تراشا ہوا گھنٹیوں اور گل بوٹوں سے کاڑھا ہوا ستون یا وہ عورت' سناٹے میں لے جانے والی حد تک خوبصورت..

حسن میں کون زیادہ تراشیدہ ہے.. وہ ستون یا اس عورت کی بدنی بناوٹ..

ستون سے ٹیک لگائے وہ عورت گویا اس مندر میں کبھی جو دیویاں تھیں' انہیں مات کرتی ہوئی خود ایک دیوی ہوئی جاتی تھی..

میں نے قریب ہو کر اس ستون کو چھوا ایسے کہ جیسے میں اسے چھوتا ہوں.. جس کی پشت قدرے بھاری اس کے ساتھ لگی تھی..

وہ تصویر تو ایسے یاد آ گئی تھی جیسے میں اسے سامنے دیکھ رہا ہوں.. ستون تو حقیقت میں سامنے تھا اور عورت میرے تصور نے مکمل کر دی تھی لیکن یہ تصویر میں نے دیکھی کہاں تھی.. کسی میگزین میں.. کسی سیاحتی پوسٹر پر.. کہاں.. یہ یاد نہ آ سکا..

یہ تو ممکن نہیں کہ وہ عورت اس وسیع دنیا میں کہیں ہو اور اگر یہ تحریر پڑھے تو یہ نہ

جان جائے کہ یہ تو میں ہوں.. جو کبھی جانے کتنی صدیاں پیشتر قطب مینار کے سائے میں اس ہندو ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی تھی اور وہ لمحہ منجمد ہو گیا تھا.. اور ایک لکھنے والے نے اسے پھر سے زندہ کر دیا تھا.. اس پہچانے گئے ستون نے مجھے حسد میں مبتلا کر دیا تھا کہ اس کے بدن کے اتار چڑھاؤ کبھی اس کے ساتھ ٹیک لگا کر خوش نظر ہوئے تھے..

ایک ملا جلا خاندان جس میں عورتیں' بچے اور لڑکیاں بھی شامل تھیں' سوتی ساڑھیوں میں گندمی بھی اور قدرے سیاہ رنگوں کی وہ سب اس ستون کے آگے سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گئے.. چہرے چمکنے لگے.. دمکنے لگے اور وہ مجھے پیار سے دیکھنے لگے.. نہیں' مجھے نہیں بلکہ وہ میرے برابر میں کھڑے حیران کھڑے ونود کو پیار سے دیکھتے تھے جو مجھے اس ستون کے سامنے بُت بنا دیکھتا تھا.. انہوں نے ملی جلی ہندی انگریزی اور مراٹھی وغیرہ میں پُرمسرت چیخیں ماریں اور ونود کے گرد ہو گئے.. اس کے ہمراہ تصویریں اتروانے لگے.. اس سے آٹوگراف حاصل کرنے لگے.. وہ جنوبی ہندوستان سے دلّی یاترا کو آئے تھے اور یہاں انہیں ونود دکھائی دے گیا جس کی شکل اور عینک سے بیشتر ہندوستان شناسا ہے.. اسے ٹیلی ویژن پر سیاستدانوں کو اپنے سامنے بٹھا کر ان کے بخیے ادھیڑ دینے میں کمال حاصل تھا اور اس کے باوجود ہر سیاستدان کی آرزو ہوتی تھی کہ وہ ونود کے شو میں آ کر اپنے بخیے ادھڑوائے..

ونود نے اپنے چاہنے والوں سے میرا تعارف کروایا اور میں نے کچھ عجیب سا اور حقیر سا محسوس کیا کہ جو میرے وطن میں میرے ساتھ کبھی ہو جاتا تھا وہ ونود کے ساتھ یہاں ہو رہا تھا اور مجھے یہاں تعارف کی حاجت تھی.. تو میں نے اداس ہو کر اپنے وطن کو بہت یاد کیا اور سوچا چل خسرو گھر اپنے' جہاں لوگ تجھے جانتے ہیں' پہچانتے ہیں' تجھ سے الفت رکھتے ہیں..

ہم قطب مینار کے کمپاؤنڈ سے باہر آنے لگے تو میں نے ایک بار پھر اس ستون پر ہاتھ پھیر کر اس گمشدہ عورت کو زندہ کیا.. میرا بس چلتا تو میں اسے اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے جاتا.. اگر یہ ایک ہندو مندر سے اکھاڑ کر یہاں ایک مسجد تعمیر کرنے کے لیے لایا جا سکتا تھا تو یہاں سے اکھاڑ کر میں بھی تو اسے گھر لے جا کر ایک اور معبد بنا سکتا تھا..

''مرزا غالب.. انڈیا انٹرنیشنل کے ڈائننگ روم میں''

وقت کم تھا اور مقابلہ سخت..

مجھے اب دلّی بُھلا کر اس کے وہ کھنڈر.. مقبرے اور یادگاریں بُھلا کر جو میں نہیں دیکھ پایا تھا' انہیں بُھلا کر انڈیا انٹرنیشنل سنٹر پہنچنا تھا.. پیکنگ کرنی تھی.. کچھ دوستوں کو الوداع کہنا تھا' چند فون کرنے تھے' لنچ کرنا تھا اور پھر تھوڑی دیر ستا کر ایئرپورٹ پہنچنا تھا..

قطب سے نکلتے ہی دائیں ہاتھ پر ایک ٹیلے پر سجا ایک بازار نظر آیا جس کے بیچ میں سے راستہ بلند ہوتا کسی مقبرے تک پہنچتا تھا..

''یہ التمش کا مقبرہ ہے.. دیکھیں گے؟''

''نہیں دیکھیں گے.. ایک غلام کا مقبرہ کیا دیکھنا..''

شہر میں داخل ہوئے تو ونود نے استفسار کیا. ''ادھر ہمایوں کا مقبرہ ہے.. دیکھیں گے؟''

''نہیں.. ایک اور شہنشاہ کا مقبرہ بھی کیا دیکھنا..''

''جہاں بہادر شاہ ظفر نے پناہ لی تھی.. جہاں ایک طشتری میں انگریزوں نے اس کے بیٹے کا سر پیش کیا تھا.. پھر بھی نہیں دیکھیں گے؟''

''نہیں.. وقت کم ہے اور مقابلہ سخت..''

میں شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ دلی میں مجھے تین لوگوں سے ملنے کی چاہت تھی. عینی آپا. خوشونت سنگھ اور امرتا پریتم..

عینی آپا اور تاج محل کے بیچ بُعد پڑ گیا.. اور میں تاج چلا گیا..

اور ابھی ونود نے بتایا کہ اس نے آج صبح میری جانب آنے سے پیشتر خوشونت سنگھ سے رابطہ کیا تھا.. انہیں میرے بارے میں بتایا تھا اور مجھے خوشی ہوئی کہ وہ میرے کام سے شاید نہیں لیکن میرے نام سے آگاہ تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ اپنے ہفتہ وار طبی معائنے کے لیے اپنے ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں' لیکن آج شام نہ صرف مشروبات پر بلکہ ان کے بعد انہیں خوشی ہوگی اگر میں ان کے ہمراہ رات کا کھانا بھی کھاؤں..

کیسے رات کا کھانا کھاؤں.. میں آج شام کی فلائٹ سے وطن لوٹ رہا تھا..

''آپ کل چلے جائیے گا.'' ونود نے مشورہ دیا. ''خوشونت رات کے کھانے پر کم ہی لوگوں کو مدعو کرتے ہیں..''

لیکن میں نہیں ٹھہر سکتا تھا.. چاہے میری من پسند ایشوریا رائے کی جانب سے رات کے کھانے کی دعوت بھی آ جاتی.. کہ میں اپنے لاہور کے لیے اداس ہو چلا تھا. خسرو اب رک نہیں سکتا تھا.. اسے گھر جانا تھا..

البتہ امرتا کے بارے میں طے پایا کہ اس کا گھر ایئرپورٹ کے راستے میں ہے تو ونود مجھے ان کے درشن کروا دے گا..

کیونکہ انڈیا انٹرنیشنل تک کا سفر ابھی طویل تھا تو ونود نے میرے جانے کی گھبراہٹ کے ازالے کے لیے باتیں شروع کر دیں. ''مجھے ایک بات پر حیرت ہے.. بیشتر پاکستانی ممبئی جانے کی شدید حسرت رکھتے ہیں.. بالی ووڈ کے فنکاروں اور گلوکاروں سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں.. آپ نے اس قسم کی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا..''

''ایک تو مجھے سمندر کی مرطوب ہواؤں والے شہر پسند نہیں.. دوسرے میں جس نوعیت کے لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں وہ ممبئی شہر میں کم کم ہیں.. لائل پوری سریندر پرکاش ایک تھا جو رخصت ہو گیا.. ہاں اگر کبھی وہاں جانے کا اتفاق ہو جائے تو مجھے سوائے دلیپ کمار' گلزار' اے آر رحمٰن اور نصیر الدین شاہ سے ملاقات کے سوا اور کوئی غرض نہ ہوگی.. (اس لمحے تک میں نے ''دیوداس'' تو دیکھی تھی لیکن بنسالی کی ''بلیک'' نہیں دیکھی تھی.. ایک ایسی تخلیقی

قلم جو شاید ہالی ووڈ کے بس میں بھی نہ ہو..تو آج میں اس فہرست میں بنسالی کے علاوہ رانی مکرجی کو بھی شامل کرتا)"

"آپ ارادہ کر کے آئیے..ان لوگوں سے ملاقات کا بندوبست میں کروا دوں گا.."

ایک بہت بلند..کم کھڑکیوں والی..ایریملو..انٹینوں اور ڈشوں کی جھاڑ جھنکار میں اٹی عمارت شاہراہ کے برابر میں دکھائی دینے لگی..

"یہ "را" کا ہیڈ کوارٹر ہے"..ونود نے اطلاع کی..

آپ جانتے ہیں کہ "را" پاکستان کی آئی ایس آئی..امریکہ کی سی آئی اے یا اسرائیل کی "موساد" وغیرہ کی سگی بہن ہے..اس ادارے کو خصوصی طور پر پاکستان کی بہبود اور سلامتی میں بے حد دلچسپی ہے..جیسے آئی ایس آئی کو ہندوستان کی سلامتی اور خوشحالی بیحد عزیز ہے..جیسے "موساد" فلسطینیوں کو ان کے جائز حقوق دلوانے کی جدوجہد میں دن رات ایک کر رہی ہے..ویسے "را" کا ہم پاکستانیوں کو بہت فائدہ ہے..یہ نہ ہوتی تو ہم اپنی بیشتر نالائقیوں کا ذمہ دار کسے ٹھہراتے..اور اسی طور ہندوستان بھی آئی ایس آئی کے بے حد شکر گزار ہیں..وہ نہ ہوتی تو الزامات کس پر تھوپتے..

یہ دنیا ایسی کمینی ہے کہ اگر کوئی ہنس کر آپ سے بات کر لے تو شک ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہنس کر بات کرتا ہے..اسے کیا غرض ہے اس کے کیا مقاصد ہیں..کوئی ہمدردی کرے تو انسان چوکنا ہو جاتا ہے کہ یہ تو کوئی سازش ہے..چنانچہ مجھے بھی ونود پر شک تھا..کیسے یقین آئے کہ وہ کیوں میری اتنی قدر کرتا ہے..ایک جن کی مانند میری ہر خواہش پوری کرنے پر تُل جاتا ہے..کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے اور میں نے بظاہر مسکراتے ہوئے اپنے اس شک کا اظہار کر دیا."ونود بھیا.تم مجھ پر جو یوں جان چھڑکتے ہو..بے دام غلام بلکہ جن ہوئے جاتے ہو تو کہیں تم "را" کے ایجنٹ تو نہیں ہو.شکل اور لباس سے تم ایک عامیانہ قسم کے جاسوس تو لگتے ہو.."

"ہاں یہ تو ہو سکتا ہے."اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے میری جانب نگاہ کیے بغیر کہا.

"ویسے مجھے فخر ہے کہ میں اتنا اہم ہوں کہ "را" نے تم جیسے ایک خصوصی ایجنٹ کو میری حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کے لیے مقرر کیا ہے.."

"تارڑ صاحب..اگر ہمارے ملک میں "آئی ایس آئی" کا ایک ایجنٹ وارد ہو جائے تو "را" کو یہ حق تو حاصل ہے کہ اس کا پیچھا کرنے کے لیے ایک ایجنٹ مقرر کر دے.."

"ہاں..یہ بھی سوچنے کی بات ہے."میں نے مسکراتے ہوئے کہا..

ونود نے انڈیا انٹرنیشنل کے کار پارک میں اپنی کار پارک کی اور ہم دونوں پہلی منزل تک جاتی سیڑھیاں طے کرتے ڈائننگ روم میں داخل ہو گئے..

اس نے میری دل پسند تندوری مچھلی آرڈر کر دی..

برابر کی میز پر پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کی منڈلی جمی تھی اور وہ بار بار مجھے اپنی میز پر آنے کی دعوت دے رہے تھے..اور میں خواہش کے باوجود جا نہ سکتا تھا کہ دلّی کے ایک جن کی قید میں تھا..

ڈائننگ روم کی قد آدم شیشے کی کھڑکیوں میں سے دوپہر کی دھوپ اترتی تھی اور اس دھوپ میں ایک کھڑکی کے برابر میں براجمان چند لوگ روشن ہو رہے تھے..اور ان میں ایک حضرت کی سفید ریش دھوپ کی لشک سے کچھ نورانی اور الوہی ہوئی جاتی تھی..اور یہ حضرت..اُس ستون کی عورت کی طرح کہیں دیکھے ہوئے لگتے تھے..

اور ابھی میں انہیں ایک مقامی مولوی صاحب قرار دے کر ان پر سے نظر اٹھانے کو تھا کہ میری نظر ان کی بہت آشنا ناک نقشے پر ٹھہر گئی..

"ونود.." میں نے تندوری مچھلی کو ٹھنڈا ہو جانے دیا."یہ نصیر الدین شاہ تو نہیں ہیں؟"

ونود نے اُدھر نظر کی جہاں میری نظر ٹھہری ہوئی تھی."ہیں..وہی ہیں..اپنا نصیرو..میں اسے لاتا ہوں.."وہ اٹھ کر ادھر گیا اور نصیرو کو لے آیا..میرا تعارف کروایا..اگرچہ میرے ذاتی جن کی حیثیت میں اس نے آقا کی توصیف بڑھ چڑھ کر کی لیکن شاہ صاحب پر کچھ اثر

نہ ہوا کہ دنیا انہیں جانتی تھی وہ تو دنیا بھر کو نہیں جان سکتے تھے..

چند لمحوں کے لیے ہم روبرو کھڑے رہے.. باتیں کرتے رہے..

وہ ایک اجنبی شکل کے پاکستانی کے ساتھ..

اور میں ایک ایسے شخص کے ساتھ جس کی شکل سے میں مدتوں سے آشنا تھا' جیسے کسی قریبی دوست کی شکل..

دلیپ کمار اور سنجیو کمار کے بعد اگر کسی نے میرا من موہ لیا تو وہ نصیرالدین شاہ تھے.. کبھی "اجازت" میں اور کبھی "کھنڈر".. "مرچ مصالحہ" یا "پار" میں.. اور یہ فہرست من موہ لینے کی بے حد طویل ہے لیکن اس میں سرِفہرست گلزار کی "غالب" ہے..

وہ مجھ سے باتیں کرتے تھے اور میں غالب کی آواز سنتا تھا..

وہ بول رہے تھے اور میں کوچۂ بلّی ماراں میں ان کی گفتگو سن رہا تھا..

وہ ان دنوں دلّی میں ایک سٹیج ڈرامے کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے اور انہوں نے نہایت محبت سے مجھے دعوت دی کہ میں ان کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے یہ ڈرامہ آج رات دیکھوں..

آج رات.. یہ کیسی رات آ رہی تھی کہ اس میں خوشونت سنگھ کے گھر میں ایک ڈنر تھا.. میرے لیے.. نصیرالدین شاہ مجھے مدعو کر رہے تھے.. اپنا سٹیج پلے دیکھنے کے لیے.. اور میں نپولین کی مانند جوزفین سے یہی کہہ سکتا تھا کہ.. نہیں جوزفین آج رات نہیں..

"ممبئی واپسی پر آپ کی ملاقات گلزار صاحب سے ہو گی؟" میں نے پوچھا..

"جی.. گلزار بھائی سے تو بہرصورت ملاقات ہو گی' آپ انہیں جانتے ہیں.."

"جی.. وہ مجھے جانتے ہیں.. اور مجھے کچھ فخر ہے کہ انہوں نے میرے افسانے "بابا بگلوس" سے متاثر ہو کر دو نظمیں لکھی تھیں اور یہیں سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا تھا.. آپ انہیں ضرور میرا اسلام کہیے گا.. یہ میرا کارڈ ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ میرا نام بھول جائیں گے.."

"ارے نہیں صاحب.." انہوں نے بے حد نستعلیق لہجے میں کہا.. "ہم آپ کو کہاں بھولنے والے ہیں.."

اور بے شک وہ بڑے اداکار تھے لیکن میں ان کے چہرے سے جان سکتا تھا کہ لمحہ موجود میں بھی انہیں میرا نام یاد نہیں.. اور یہ قدرتی امر تھا اور میں بھی ایسی صورت حال سے گزرتا رہتا تھا کہ جب کوئی چاہنے والا آپ کے پاس آتا ہے' اپنا نام بتاتا ہے تو آپ سن نہیں رہے ہوتے' محض مسکرا رہے ہوتے ہیں.. شاہ صاحب بھی اسی طرح مسکرا رہے تھے...

پھر میں نے وہی بوسیدہ ایسی شخصیتوں سے ہر بار ہزاروں بار پوچھا جانے والا سوال پوچھا.. "آپ ان دنوں کیا کر رہے ہیں؟"

"میں ان دنوں.. بلکہ پچھلے دو برسوں سے ایک ذاتی فلم بنانے کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ بن نہیں پا رہی.."

"کیا ایک نصیرالدین شاہ کو بھی فلم بنانے کے لیے کوشش کرنی پڑتی ہے؟"

شاہ جی نے باقاعدہ مرزا غالب کی مانند تبسم کیا اور ریش مبارک پر ہاتھ پھیرا..

"ہاں صاحب ہندوستان میں اگر آپ مروجہ کمرشل ڈگر سے ہٹ کر کوئی ڈھنگ کا کام کرنا چاہیں تو کوئی گھاس نہیں ڈالتا.. کوئی پیسہ لگانے کو تیار نہیں ہوتا.. آپ کوشش کی بات کرتے ہیں نصیرالدین شاہ تو ہاتھ جوڑ کر منتیں کرتے ہیں تو بھی کوئی آمادہ نہیں ہوتا.."

"لیکن وہ جو آرٹ فلموں کا ایک گولڈن پیریڈ تھا جس میں آپ گولڈ ہوا کرتے تھے وہ کیسے ممکن ہوا.."

"وہ بھی اسی طرح منت ساجت اور کچھ لوگوں کی لگن سے ممکن ہوا.."

مجھے احساس ہوا کہ ہم بہت دیر سے ڈائننگ ہال کے بیچ کھڑے ہوئے ہیں..

"اگرچہ آپ دوستوں کے ہمراہ ہیں لیکن ہمیں بھی دوست ہی سمجھئے اور ہماری ٹیبل پر آ جائیے.."

"وہاں صرف دوست ہی نہیں.. اپنی بیگم بھی ہیں.." انہوں نے بیگم کو اشارہ کیا تو وہ بھی اٹھ کر ہمارے پاس چلی آئیں.. ان سے تعارف ہوا.. وہ ابھی حال ہی میں پاکستان گئی تھیں اور وہاں کے بارے میں رطب اللسان تھیں کہ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ نصیر کو پورا پاکستان جانتا ہے اور وہ اتنے پاپولر ہیں.. اگرچہ وہ خود بھی تھیٹر کی ایک منجھی ہوئی اداکارہ ہیں

لیکن پاکستان میں ان سے شاہ صاحب کے بارے میں ہی سوال پوچھے جاتے رہے..

ان کی میز پر بیٹھے ہوئے دوست انہیں مسلسل اشارے کر رہے تھے کہ وہاں کیا کر رہے ہو..

''آپ آیئے ہمیں جوائن کیجیے..'' شاہ صاحب نے دعوت دی.. ''مجھے خوشی ہوگی..''

میں نے اپنی فلائٹ کی مجبوری بیان کی' معذرت کی اور پھر ہم دونوں اپنی ٹیبل پر لوٹ آئے جہاں میری تندوری مچھلی اتنی ٹھنڈی ہو چکی تھی جیسے دریائے کنہار میں سے نہا کر نکلی ہو..

''چل خسرو گھر اپنے''

احمد فراز کو ایسے مداحین کی کچھ کمی نہ تھی جو انہیں سر آنکھوں پر بٹھا کر دلی ایئر پورٹ تک لے جاتے اور مجھے بمشکل ایک مداح ونود کی شکل میں نصیب ہوا تھا' جس نے مجھے ایئر پورٹ چھوڑنے جانا تھا' چنانچہ میں نے فراز کو پیشکش کی کہ وہ ہمارے ساتھ چلے چلیں.. انہوں نے میری پیشکش قبول کر لی اور بعد میں مجھے بہت قلق ہوا کہ میں نے ایسی مؤدبانہ پیشکش کیوں کی تھی..

میرا کل سامان بندھا ہوا.. استقبالیہ کے فرش پر پڑا ہوا.. ونود منتظر اور فراز غائب..

پھر دیکھا کہ فراز مے خانے کے سامنے باغیچے میں ٹہل رہے ہیں..

''خان صاحب.. ایئر پورٹ نہیں چلنا؟''

انہوں نے گھڑی پہ نگاہ کی.. ''ابھی سے.. ابھی تو بہت وقت ہے..'' اور وہ لاپروا ہو گئے.. اب وہ جدھر جاتے تھے میں ان کا پیچھا کرتا تھا.. اب دیکھا کہ استقبالیہ پر جو ایک ہندوستان کے معیار سے قدرے خوش بدن خاتون کھڑی ہیں ان سے گپ لگا رہے ہیں..

''فراز صاحب فلائٹ مس ہو جائے گی.. چلیں..''

''یہ فلائٹ مس ہو گئی تو کیا قیامت آ جائے گی.. کل چلے جائیں گے.. ابھی وقت ہے..''

بالآخر انہوں نے بتایا کہ انہوں نے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کی ممبر شپ کے لیے جو درخواست دے رکھی ہے اس پر غور کرنے کے لیے اور ان سے انٹرویو کرنے کے لیے کلب

کے کوئی ڈائریکٹر آ رہے ہیں وہ ان کے منتظر ہیں..

"فراز صاحب.. اس طرح تو فلائٹ چھوٹ جائے گی.."

"تمہیں اتنی جلدی ہے ناں تو چلے جاؤ.. مجھے چھوڑ جاؤ.. جاؤ.." وہ باقاعدہ خفا ہو گئے.. فراز دشمنیاں پالنے میں بہت ملکہ رکھتے ہیں.. میں نے سوچا کہ میں نے تو پہلے سے بہت دشمن پال رکھے ہیں ان میں اگر فراز کا بھی اضافہ ہو گیا تو یہ مجھ اونٹ پر آخری تنکا ثابت ہو گا چنانچہ خون کے چند گھونٹ بھر کر چپکا ہو رہا..

بالآخر ایک فون کہیں سے آیا کہ وہ ڈائریکٹر صاحب آج مصروف ہو گئے ہیں' اس لیے انٹرویو کے لیے نہیں آ سکتے..

فراز کے دیگر سامان سفر کے علاوہ کہ جس میں چھوٹے موٹے بیگ' شاپر' مٹھائیوں کے ڈبے اور ایک بڑے حجم کا سوٹ کیس شامل تھے.. ایک بیش قیمت گٹھڑی سی بھی تھی اور اس میں پاپڑ تھے.. کسی دہلوی مداح کے پیش کیے ہوئے کوئی مخصوص روایتی دہلوی پاپڑ.. اور فراز ڈرائیور کی جان کو آتے تھے جو ان کا سامان کار میں رکھ رہا تھا کہ.. بھئی احتیاط سے.. میاں ہاتھ ہولا رکھو.. کہیں ٹوٹ نہ جائیں جیسے مرزا غالب یا نصیر الدین شاہ ایک ٹھیلے پر شراب کی بوتلیں لاتے تھے اور کہتے تھے.. میاں احتیاط سے کانچ کا سامان ہے..

جانے یہ پاپڑ کہاں بیلے گئے تھے.. جو اتنی احتیاط کی جا رہی تھی.. کسی ہاتھوں میں کانچ پہننے والی مداح خاتون کے بدن سے ہی بیلے گئے ہوں گے.. جو اتنی احتیاط کی جا رہی تھی..

خدا خدا کر کے ایئرپورٹ کی جانب سفر شروع ہو گیا..

میں نے فراز کو بتایا کہ راستے میں ہم امرتا پریتم کے گھر تھوڑی دیر کے لیے رکیں گے..

"کیوں؟"

"میری خواہش ہے کہ میں انہیں ملوں.. انہیں دیکھوں.."

"وہ تمہیں جانتی تو ہوں گی.."

"ہاں.. امروز نے انہیں میری تحریروں کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے تھے اور ان کا کہنا تھا.. کہ اس شخص کی نثر میں اتنا زور ہے کہ یہ جھوٹ کو بھی سچ بنا دینے پر قادر ہے لیکن..

اس میں مسلمانی بہت ہے اور ایک کھرے ادیب کو مذہب سے ماورا ہونا چاہیے.."

"لو یہ کیا بات کی ہے اس نے.. اس کی اپنی تحریروں میں مذہب بہت ہے.. پتہ چلتا ہے کہ وہ سردارنی ہے.. کڑاہ پرشاد اور گوروؤں کے حوالے دیتی ہے.."

مجھے کچھ حیرت ہوئی کہ فراز جسے کافر اور زندیق کہلانے کا شوق ہے مذہب کے حوالے سے یوں جذباتی ہو گیا ہے.. "فراز جی.. ہم اپنے اپنے عقیدوں کی قید میں ہیں.. چاہے کتنے رسے تڑوائیں.. لیکن.. میں امرتا سے ملنا چاہتا ہوں.. وہ مجھے پسند کرتی ہیں یا نہیں.. میں ان سے ملنا چاہتا ہوں.."

"تارڑ.. تم کبھی ان سے ملے ہو؟"

"نہیں.."

"تو اب نہ ملو.."

"کیوں؟"

"وہ بہت بیمار ہے.. بوڑھی اور لاچار ہے.. اس کی ذہنی حالت بھی اچھی نہیں.. کسی کو پہچانتی نہیں.. تقریباً اپاہج ہو چکی ہے.. بستر سے اٹھ نہیں سکتی.. اسے کچھ خبر نہیں کہ کون آیا کون گیا.. امروز اس کی تیمارداری کرتا ہے.. اسے سنبھالتا ہے.. تو تم اسے دیکھ کر کیا کرو گے.. صرف اس لیے کہ بعد میں تم یہ کہہ سکو کہ میں نے امرتا کو اس کے آخری ایام میں دیکھا تھا.."

میں لرز گیا.. "نہیں.. اس لیے تو نہیں.."

"کیا یہ بہتر نہیں کہ تمہارے ذہن میں امرتا کا اس کی شاعری اور نثر کے حوالے سے جو زندہ اور خوبصورت تصور ہے وہی قائم رہے.. مجھے تو کچھ اعتراض نہیں اگر تم اسے اس حالت میں ملنا.. بلکہ دیکھنا چاہتے ہو.."

فراز سنجیدہ کم ہی ہوتا تھا.. اپنی فقرے بازی اور خوش طبعی سے کم ہی باہر آتا تھا لیکن جو کچھ اس نے امرتا کے بارے میں کہا' گہری رنجیدگی اور دکھ سے کہا.. تو میں نے اس کا کہا مان لیا.. ایک بھاری دل کے ساتھ شدید قلق کے ساتھ اسے ملنے.. دیکھنے کا ارادہ ترک کر دیا.. اور اس ترک شدہ ارادے کے ماتھے پر ایک رسیدی ٹکٹ چسپاں کر دیا.. میں نے

متروک کر دیا اس سردارنی کو جو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئی تھی.. لاہور ریڈیو سٹیشن سے ستار بجایا کرتی تھی.. موہنی روڈ پر رہتی تھی اور جس کے مکان کی سیڑھیوں میں اس کے عشق میں لاچار میرے اک بزرگ اور نستعلیق پنجابی لہجے کے ڈرامہ نگار.. ساری رات پڑے رہتے تھے.. اور وہ جو ساحر کے عشق میں لاچار ایسی ہوئی کہ اس کے سگریٹوں کے بجھے ہوئے ٹوٹے سنبھال سنبھال رکھتی تھی اور آرزو کرتی تھی کہ اس کا بچہ اس کی شکل کا ہو.. تو میں نے اس سردارنی امرتا پریتم کو ملنے.. بلکہ دیکھنے کا ارادہ ترک کر دیا..

اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے..

"اَج آ کھاں وارث شاہ نوں.."

ونود فراز کی غزلیں گنگنا رہا تھا..

ایئرپورٹ پہنچ کر ہم کار سے سامان نکال رہے تھے اور فراز کی مانند اس کا سامان بھی بہت بکھرا ہوا تھا.. ونود وہ خصوصی گٹھڑی نکالنے لگا تو فراز نے شور مچا دیا.. "بھئی احتیاط سے.. اس میں میرے پاپڑ ہیں ٹوٹ جائیں گے.."

"آپ کا ٹکٹ کہاں ہے؟"

"ہے۔"

"نکال کر دکھایئے.."

اب فراز کبھی عینک اتارتے ہیں کبھی پہنتے ہیں جیسے اس کے پہننے اور اتارنے سے ٹکٹ برآمد ہو جائے گا.. پھر دونوں ہاتھوں سے اپنی متعدد جیبیں الٹتے پلٹتے.. ان میں سے درجنوں کارڈ.. چٹیں.. کاغذوں کے پلندے نکالتے اور ان میں سے ٹکٹ تلاش کرتے.. نہ ملتا تو پھر سے اُنہی جیبوں میں ٹھونسنے میں مشغول ہو جاتے.. بالآخر وہ پتلون کی پچھلی جیب میں سے برآمد ہو گیا..

"میں کہتا تھا ناں کہ ٹکٹ ہے.." انہوں نے فاتحانہ انداز میں ٹکٹ لہراتے ہوئے اعلان کیا۔

میں نے ٹکٹ ملاحظہ کیا تو وہ دلّی سے لاہور تک کا نہ تھا بلکہ اسلام آباد سے کراچی تک کا کوئی ایئر ٹکٹ تھا.. میں نے انہیں اطلاع کر دی کہ یہ غیر مناسب ٹکٹ ہے..

ایک مرتبہ پھر جیبوں کو الٹانے پلٹانے کا عمل شروع ہو گیا. ٹکٹ تو برآمد ہوتے لیکن وہ دلّی سے لاہور تک کے نہ ہوتے.. کوئی ٹمبکٹو کا ہوتا تو کوئی شکاگو کا..

فراز کو دنیا بھر سے جو پیغام آتے رہتے ہیں ان کے ہمراہ ایئر ٹکٹ بھی آتے رہتے ہیں، جنہیں وہ ہمہ وقت اپنی جیبوں میں ٹھونسے پھرتے ہیں.. جب کبھی وقت ملتا ہے یا یونہی لہر سی اٹھتی ہے تو کوئی بھی ٹکٹ نکال کر کہیں بھی روانہ ہو جاتے ہیں.. لیکن مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ فراز پر عمر بالآخر اثر انداز ہو رہی ہے اور ان کی بوکھلاہٹ ان کے مزاج کا ایک حصہ بن رہی ہے.. تب میں نے انہیں ایک چھوٹے بچے کی مانند ساکت کھڑے رہنے کا حکم دیا اور انہوں نے یہ حکم مان لیا.. میں نے ان کی جیبوں کی باری باری تلاشی لی اور مطلوبہ ٹکٹ تلاش کر ہی لیا..

ونود اس دوران یہ تماشا دیکھ دیکھ کر محظوظ ہوتا رہا..

ابھی میں ونود کی مہمان نوازی اور مہربانیوں کا شکریہ ادا کر ہی رہا تھا اور فراز سامان کی ٹرالی دھکیلتے چل پڑے تھے کہ وہ پھر پلٹے.. "اوئے تارڑ میرا موبائل پتہ نہیں کہاں گیا ہے.." وہ پھر سے اپنی جیبیں الٹنے پلٹنے لگے..

اس دوران لاہور فلائٹ کی روانگی کی اناؤنسمنٹ سنائی دینے لگی..

"فراز صاحب جانا کہاں ہے.. آپ کے سامان میں کہیں ہوگا.."

"نہیں میرے ہاتھ میں تھا اور اب دیکھو نہیں ہے.."

میں نے پھر ان کی جیبوں کی تلاشی لینے کا فریضہ سرانجام دیا لیکن بے سود.. موبائل نہ ملا..

"اوہو.. یار مجھے یاد آ رہا ہے.. ہاں" انہوں نے خلاؤں میں گھورا جیسے کوئی مصرع موزوں کرنے کو ہوں.. "ہاں.. انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے لاؤنج میں ٹہلتے ہوئے میں نے اسے کاؤنٹر پر رکھ کر سگریٹ پیا تھا.. وہیں ہوگا.. واپس چلیں..؟"

"خدا کے لیے فراز صاحب.."

"میں اپنا موبائل دلّی میں چھوڑ جاؤں.. بڑا قیمتی موبائل ہے.."

"اگر یہاں سے سنٹر جائیں گے تو واپس نہیں آسکیں گے فراز.."

"تو نہیں آئیں گے.. کل چلے جائیں گے.. کیوں ونود؟"

ونود تو جیسے اسی موقع کے لیے گھات لگائے بیٹھا تھا "جی بالکل فراز صاحب.. کوئی مسئلہ نہیں.. میں کل کی فلائٹ پر بندوبست کردوں گا.. یوں بھی خوشونت سنگھ نے آج رات تارڑ صاحب کو کھانے پر مدعو کیا تھا تو وہاں بھی چلے چلیں گے.."

"تارڑ اس سے نہ ملنا بڑا بدمعاش بوڑھا ہے.. ایک مرتبہ.." فراز سب کچھ بھول بھال کر مجھے خوشونت کی کہانیاں سنانے لگے..

"فراز میں نے جانا ہے اور اسی فلائٹ پر جانا ہے.."

"تو جاؤ.." فراز ایک دم مزید پٹھان ہو گئے.. جلال میں آگئے.. "میں اپنے موبائل کے بغیر نہیں جا رہا.."

اس تشویش ناک صورت حال کو ونود نے سنبھالا کیونکہ میں بھی مزید جاٹ ہو جانے کو تھا.. طے یہ ہوا کہ ونود ایئرپورٹ سے سیدھا سنٹر واپس جائے گا' موبائل حاصل کرے گا اور پھر کل صبح سب سے پہلا کام یہ کرے گا کہ اس فرازی موبائل کو پاکستانی سفارت خانے کے فلاں اہلکار کے حوالے کردے گا جو اسے پاکستان پہنچا دے گا..

امیگریشن اور کسٹم وغیرہ میں سے جانے ہم کیسے نکلے کہ کیونکہ وہاں جو بھی کاغذات درکار تھے ان میں سے چند ایک فراز صاحب کے ہاں نہیں تھے اور وہ نہایت خوش طبعی سے انہیں طرح طرح کے کاغذات اپنی جیبوں سے برآمد کرکے دکھاتے رہے کہ یار فی الحال یہی ہے' اسی سے کام چلا لو اور ان میں چند حسینوں کے خطوط بھی تھے.. آخری ناکہ بندی پر سکیورٹی کے اہلکاروں نے سب مسافروں کی مانند اُن کی بھی تفصیلی تلاشی لی تو ان کی جیبوں میں سے دو سگریٹ لائٹر برآمد ہوگئے..

"یہ نہیں جاسکتے.."

"ناں.. کیوں نہیں جاسکتے.. میں ان سے جہاز کو آگ لگا دوں گا' تخریب کاری کروں گا.. ویسے بھی پی آئی اے کا جہاز ہے میرے اپنے وطن کا.. میں وہاں جو کچھ بھی کروں آپ ہندوستانیوں کو کیا اختیار ہے کہ اعتراض کریں.."

ایک اور تشویش ناک صورت حال..

"فراز صاحب جانے دیجیے.."

"کیوں جانے دوں یار.. میں لاہور ایئرپورٹ پر اتر کر اپنا سگریٹ کیسے سلگاؤں گا.."

"سر.. یہ بحث نہ کریں۔"

"کیوں نہ کروں.."

میں نے ایک سینئر پولیس آفیسر سے رابطہ کیا اور اسے فراز کے بارے میں کچھ بڑھا چڑھا کر بتایا کہ وہ کون ہیں لیکن اس پر چنداں اثر نہ ہوا اور اس نے صرف اس قدر عنایت کی کہ ٹھیک ہے ہم یہ دونوں لائٹر پی آئی اے کے عملے کے سپرد کردیں گے جو لاہور میں لینڈ کرنے کے بعد انہیں مل جائیں گے..

بالآخر ہم پسنجر لاؤنج میں پہنچ گئے اور انڈیا انٹرنیشنل سنٹر سے فراز کی رفاقت میں چلنے کے بعد میں نے اطمینان کا پہلا گہرا سانس لیا کہ اب آگے کوئی رکاوٹ نہ تھی اور شیشے کی ایک دیوار کے بعد وطن نظر آرہا تھا۔ پی آئی اے کا جہاز دکھائی دے رہا تھا..

لاؤنج کے ایک کونے میں کوئی ڈیڑھ درجن کے قریب نوجوان.. چھریرے بدن کے.. شوخ سبز رنگ کے بلیزر پہنے ہوئے ایک بھدا سا کپ اٹھائے مسلسل "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے.. اتنے پرجوش کہ باقاعدہ دنگا کر رہے تھے.. تفتیش کی تو کھلا کہ یہ پاکستانی ہاکی ٹیم کے کھلاڑی ہیں جو ہندوستان کے مختلف شہروں میں میچ کھیل کر آرہے ہیں اور سیریز جیت کر آرہے ہیں جس کے صلے میں انہیں یہ بیہودہ سا چیمپئن کپ ملا ہے..

"فراز صاحب.. یہ لڑکے کچھ زیادہ ہی شور مچا رہے ہیں.. انہیں ذرا عمدہ اخلاقیات کا مظاہرہ کرنا چاہیے.."

"تارڑ یہ نوجوان اپنے روایتی حریف کو اس کے ملک میں شکست دے کر آئے ہیں تو شور مچانا ان کا حق ہے.. بلکہ ہمیں بھی ان کے ساتھ مل کر شور مچانا چاہیے.. اور تم کیسے عمدہ اخلاقیات کا درس دے سکتے ہو جو ٹیلی ویژن پر ایک واہیات شو کی میزبانی کرتے ہو اور اپنی ساتھی میزبان کے ساتھ مسلسل فلرٹ کرتے ہو.."

اس دوران دنگا کرتے.. پاکستانی رنگ میں رنگے اچھے لگتے ہوئے چھریرے بدن کے نوجوانوں نے ہمیں سپاٹ کر لیا اور شور مچاتے کپ اٹھائے ہمارے ہاں چلے آئے اور ہمارے ہمراہ کچھ تصویریں اتروائیں.. اور ان میں سہیل عباس بھی تھا جو میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتا تصویر اترواتا تھا.. اور اس لمحے میں نہیں جانتا تھا کہ وہ دنیا بھر میں آج تک ہاکی کے سب سے زیادہ گول کرنے والا واحد کھلاڑی ہے.. ایک ورلڈ ریکارڈ ہولڈر ہے.. میری خواہش ہے کہ کبھی نہ کبھی سہیل مجھے وہ تصویر بھیج دے کہ مجھے اس پر فخر ہے..

بورڈنگ کا اعلان بار بار دوہرایا جانے لگا.. کہ پی آئی اے فلائٹ نمبر..

برائے لاہور.. روانگی کے لیے تیار ہے..

چل خسرو گھر اپنے..

اور گھر پی آئی اے کی جہاز کی صورت سامنے کھڑا تھا..

اور اس جہاز کے باہر سکیورٹی کا جو عملہ تھا وہ بھی اپنے گھر کا تھا چنانچہ انہوں نے میری تلاشی لی تو محض مسکراہٹوں سے لی..

جہاز میں داخل ہوئے تو گویا سچ مچ گھر میں آ گئے.. وہی پی آئی اے کی ہلکی سی ابتری اور کچھ بدنظمی اور بے اعتنائی لیکن وہاں جو خواتین تھیں جنہیں فضائی میزبان بھی کہا جاتا ہے ان کے چہرے جیسے کیسے بھی تھے اپنے لگتے تھے اور اچھے لگتے تھے.. اگلی نشست کی پشت پر جو پاکٹ تھی اس میں اڑسے ہوئے پاکستانی اخبار بھلے لگتے تھے..

خسرو خوش ہو گیا..

جہاز اڑا تو تنہا نہ اڑتا تھا.. اس کے سنگ سنگ دلی کے علاوہ آگرہ اور فتح پور سیکری

کے اوراق مصور بھی اڑتے تھے..

اور کھڑکی کے باہر دو پرندے بھی پرواز کرتے چلے آتے تھے..

دلی کا بُوم زرد اور اپنی گول گول آنکھیں جھپکاتا کہ ابھی شام نہ ہوئی تھی سورج کی کچھ دھوپ باقی تھی جس میں اس کی آنکھیں کھلتی نہ تھیں۔ جہاز کے پہلو بہ پہلو پرواز کرتا چلا آتا تھا اور رنگ اس کا واقعی سنہری تھا..

اور اس کے ساتھ ساتھ رنگوں کا ایک اڑن کھٹولا تھا.. اڑتا چلا آتا تھا.. وہ پرندہ تھا جو تاج کے سامنے سے گزرتے ہوئے اپنے رنگ کھو بیٹھتا تھا..

اور اوراق مصور تھے..

اور ان اوراق پر مصور نے کیسے کیسے نقش بنائے تھے..

کیسی کیسی تصویریں اور مناظر مصور کیے تھے..

وینس ڈی میلو کی چھاتیوں کی گولائی کے تناسب والے دُھند میں لپٹے لودھی مقابر کے گنبد چلے آتے تھے.. اور ہاں ان کے سائے میں لچکیلے بدن کی وہ یوگن تھی جس نے میرے پتھر بدن میں دراڑیں ڈال دی تھیں..

راموگاندھی اور صدام حسین انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے مے خانے میں چلے آتے تھے.. ایک ورق پر ڈائننگ روم کے شیشے کی کھڑکی میں سے وہ شاخ نظر آتی تھی جو ابھی تک ایک پرندے کے بیٹھنے اور اگلے لمحے اڑ جانے کے بوجھ سے لرزتی تھی..

ایک دراز قامت مجھ پر ترس کھاتی خاتون تھیں جو مجھ پر ترس کھاتی بار بار میری جانب ہاتھ بڑھا کر مجھے رقص کرنے کو کہتی تھیں..

ایک فربہ پانڈا آلتی پالتی مارے میرے سامنے براجمان تھا اور کہتا تھا کہ میں متھرا کے اتنے پیڑے کھا سکتا ہوں جتنے کہ تمہارے گناہ ہیں اور میں اسے کہتا کہ.. چل جھوٹے..!

پرتھوی راج کی آواز کی گونج ایک گنبد بے در میں گونجتی تھی.. مان سنگھ یلغار ہو.. اور اس کی آواز کی لہروں میں اتنی شدت تھی کہ یہ جہاز ڈولتا محسوس ہوتا تھا..

میں ابھی گھر نہیں پہنچا تھا لیکن فتح پور سیکری کے اوراق مصور میں رانی جودھا بائی کے محل میں مجھے اپنی بیگم ٹہلتی ہوئی نظر آتی تھی..

ہاں.. پیلی بھیت کے ڈاکو بھی میرا پیچھا کرتے تھے.. راجھستان کی بارش میں اور ہواؤں کے زور سے سہمے ہوئے سرکنڈوں میں پوشیدہ..

پرندے دو تھے.. اوراق کئی تھے جو پھڑ پھڑاتے چلے آتے تھے..

لیکن پتھر ایک ہی تھا جو اگرچہ بھاری تھا اور کب مجھ ناتواں سے اٹھتا تھا لیکن حیرت در حیرت کہ وہ بھی اڑتا چلا آتا تھا.. ایک تراشیدہ شکل میں ایک ستون کی صورت میں.. اور تنہا اس کی کچھ وقعت نہ تھی.. بس ایک تراشا ہوا پتھر تھا اسے زندہ کرنے والا وہ بدن تھا جو اس کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ایک نیلی جین اور نیلے سویٹر میں.. وصال کی آرزو میں لب وا کیے..

برف کی ڈلیوں میں سرد ہوتا ایک زیتون تھا..

ے خانے کے سامنے گل چیں کے زہر بھرے سبزے میں سے گرتا چکراتا ایک سفید پھول تھا.. ایک سفید تتلی کی مانند گھومتا اور پھر گھاس پر آرام کرتا..

پرندے دو تھے.. اوراق کئی تھے اور ستون ایک تھا لیکن ان کے جلو میں ایک سیاہ دھاگا بھی تھا۔ سلیم چشتی کے مزار کی جالیوں سے ایک خواہش کر کے باندھ دیا جانے والا دھاگا.. میں اس دھاگے کا مجرم تھا۔ میں اس پر ایمان نہ رکھتا تھا' اس لیے یہ آوارہ ہو گیا تھا اور مجھے چڑانے کی خاطر میرے جہاز کے ہمراہ بل کھاتا چلا آتا تھا.. میں اگر اس دھاگے پر ایمان رکھتا تو کیا میں جولاہا نہ ہو جاتا..

بے شک میں دلّی میں چند روز رہا تو کیا اس مختصر قیام کے حوالے سے ایک کتاب لکھ ڈالنا جائز ٹھہرتا ہے..؟

جیمز جوائس نے کچھ نقادوں کے مطابق اس صدی کا سب سے بڑا ناول ''یولیسس'' لکھا تو ڈبلن شہر کے چوبیس گھنٹوں کے بارے میں لکھا۔ اگرچہ میں جوائس نہ تھا' اس لیے بھی کہ میں انگریزی کا نہیں ایک یتیم سی زبان اردو کا لکھاری تھا تو کیا میں متعدد چوبیس گھنٹوں کے بارے میں ایک چھوٹی سی کتاب بھی نہیں لکھ سکتا؟

جونہی جہاز نے حضرت انسان کی تشفی اور تنگ دلی کے لیے دنیا میں جو لکیریں کھینچ رکھی ہیں.. سرحدیں بنا رکھی ہیں تو جونہی نامعلوم انداز میں جہاز کے پروں تلے سے وہ گذر گئیں اور پاک سرزمین شاد باد ہوئی تو..

جتنے بھی اوراق مصور تھے.. سب کے سب پھڑ پھڑاتے ہوئے لوٹنے لگے..

یہاں تک کہ سنہری اُلو بھی پلٹ گیا.. کہ وہ جانے کتنی صدیوں سے دلّی میں رہتا چلا آیا تھا اور اپنے مسکن سے جدا اس لیے نہیں ہونا چاہتا تھا کہ کیا پتہ مجھے ایسا کھنڈر کہیں اور ملے یا نہ ملے.. اگرچہ اسے لاہور میں کھنڈروں کی کچھ کمی نہ ہوتی.. میں اس کا مددگار ثابت ہو سکتا تھا.. شاہی قلعہ کے اندر کرشن کے بیٹے لوہ کا جو مندر اب تک

موجود ہے وہاں اس کی رہائش کا بندوبست کر سکتا تھا.. ہڑپہ' موہنجوداڑو' مہر گڑھ اور تخت بائی کیسی شاندار آماجگاہیں تھیں جہاں وہ قیام کر سکتا تھا..

لیکن ہر اُلّو اپنے کھنڈر سے جڑا ہوتا ہے..

جیسے ہر انسان اپنے آبائی قصبے یا شہر سے جڑا ہوتا ہے..

تو کسی بھی انسان یا اُلّو سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے آبائی قصبے یا کھنڈر کو فراموش کر دے گا' عبث ہے!

تو پاکستان کی سرحد آتے ہی سنہری اُلّو چپکے سے واپس چلا گیا..

اوراق مصور میں اور سلیم چشتی کے مزار کا سیاہ دھاگا بھی کہ اس دھاگے کے بس میں نہ تھا کہ وہ ایک طلسم سے آگے جا کر نصیب سے اُلجھ جاتا' واپس ہو گیا..

سب واپس ہو گئے..

البتہ ایک اڑن کھٹولا واپس نہ ہوا.. یہ میرے ساتھ سرحد پار کر گیا..

وہ مرغ زریں.. رنگین پرندہ واپس نہ گیا کہ وہ یہ جانتا تھا کہ جب میں تاج کے سامنے سے اڑان کرتا گزرتا ہوں تو اپنے رنگ کھو بیٹھتا ہوں تو میرا ایک اور امتحان بھی باقی ہے..

مجھے شاہ گوری کی سفیدی.. اس کے بدن کے گورے پن کے آگے سے گزرنا ہے۔ کے-ٹُو کے ازلی برفوں کے سامنے سے گزرنا ہے اور پھر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ان دونوں میں سے گوری کون سی ہے.. تاج کی مردہ سفیدی یا شاہ گوری کا زندہ بدن..

چنانچہ صرف ایک پکھیرو تھا رنگ رنگیلا.. ایک اڑن کھٹولا رنگوں کا جو میرے ساتھ سرحد پار کر کے چلا آتا تھا صرف اس لالچ میں کہ.. دیکھیں کون زیادہ گورا ہے.. تاج محل یا شاہ گوری!

خُسرو کا گھر قریب آ رہا تھا..

سارے جہاں سے اچھا.. پاکستان ہمارا..!

مستنصر حسین تارڑ

۱)منہ وَل کعبے شریف (سفرنامہ حج) ۲)غارِ حرا میں ایک رات ۳)مجموعہ مستنصر حسین تارڑ ۴)سُنہری اُلّو کا شہر (سفرنامہ دبئی)
۵)ہنزہ داستان ۶)اندلس میں اجنبی ۷)نکلے تری تلاش میں ۸)خانہ بدوش ۹)سفر شمال کے ۱۰)کے ٹو کہانی
۱۱)نانگا پربت ۱۲)نیپال نگری ۱۳)یاک سرائے ۱۴)پیار کا پہلا شہر ۱۵)پرندے ۱۶)بہاؤ ۱۷)راکھ
۱۸)قربتِ مرگ میں محبت ۱۹)جپسی ۲۰)دیس ہوئے پردیس ۲۱)ڈاکیا اور جولاہا ۲۲)قلعہ جنگی ۲۳)پکھیرو
۲۴)کارواں سرائے ۲۵)ہزاروں ہیں شکوے ۲۶)پرواز ۲۷)مُورت ۲۸)کیلاش ۲۹)گزارا نہیں ہوتا ۳۰)چک چک
۳۱)اُلّو ہمارے بھائی ہیں ۳۲)سنو لیک ۳۳)شہپر ۳۴)ہزاروں راستے ۳۵)سیاہ آنکھ میں تصویر ۳۶)سورج
کے ساتھ ساتھ ۳۷)شمشال بے مثال ۳۸)شُتر مُرغ ریاست ۳۹)پُتلی پیکنگ کی ۴۰)بے عزتی خراب
۴۱)گدھے ہمارے بھائی ہیں ۴۲)دیوسائی ۴۳)برفیلی بلندیاں ۴۴)چترال داستان ۴۵)رتی گلی۔

Rs. 300.00

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1888-8
9789693518887